بانی: ماہر القادری

ماہنامہ

فاران

مدیر:
اسمٰعیل احمد مینائی

۲۱۸، بہادر آباد، کراچی (ٹیلیفون ۴۱۶۳۴۱۲)

شہیدِ ملت لیاقت علی خان
کا ایک پیغام
حبیب بینک لمیٹڈ

…ی مولانا ماہر القادری

کراچی

فاران

…ڈ ایس نمبر ——— ۱۳۶۲
اکتوبر سنہ ۱۹۸۱ء

…نمبر ——— ۳۴
…شمارہ نمبر ——— ۱

ایڈیٹر

اسمٰعیل احمد مینائی

…فی پرچہ ——— ۵ روپے
…سالانہ ——— ۵۰ روپے
…شر ——— اسمٰعیل احمد مینائی

دفتر ماہنامہ فاران
نمبر ۲۱۸ بہادر آباد
کراچی

…فاران کا تازہ شمارہ اور پرانے شمارے
…ریگل کے بک اسٹالوں پر دستیاب ہیں
مینیجر

اس شمارے میں

…پبلشر اسمٰعیل احمد مینائی نے انجمن پریس کراچی سے چھپوا کر، دفتر ماہنامہ فاران نمبر ۲۱۸ بہادر آباد کراچی سے شائع کیا۔ فون نمبر ۴۱۲۱۶۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اداریہ

نقشِ اوّل

ارادہ تھا کہ اب کے بار اجتہاد، پر کچھ لکھوں پھر دو وجوہ سے یہ خیال چھوڑ دیا، ایک وجہ تو موضوع کی وسعت اور اہمیت ہے جو ایک مستقل اور مفصل مقالے کی طالب ہے۔ نقشِ اول کی محدود گنجائش میں تو اشاروں سے کام لینا پڑتا ہے دوسرا سبب ہنر کی مقراض ہے جو کاٹنے پر آتی ہے تو نہ عرض دیکھتی ہے نہ طول نہ راست نہ چپ، جو چاہا اور جہاں سے چاہا قلم زد کر دیا۔ اس سے کوئی مطلب نہیں کہ جو بچا اس کا کوئی سیاق و سباق بھی ہے۔

پھر یہ ہوا کہ صدر مملکت جنرل ضیاء الحق نے ایک بڑا اہم اعلان کر دیا کہ مشاورتی کونسل اگلے مہینے بن جائیگی اور یہی مشاورتی کونسل ملک کے آئندہ طرزِ حکومت، ضوابط و قوانین اور آئینی ضروریات و تشکیل کے بارے میں مشورہ دے گی۔ موقعے اور وقت کا اس لئے یہی تقاضا ہے کہ فاران کی روایات کے مطابق بغیر کسی سیاسی ہیر پھیر، اگر، مگر، کے ارباب حل و عقد پر یہ بات واضح کر دی جائے کہ کس ذہن و فکر، کس طبیعت و مزاج اور کس معیار و استعداد کے افراد پر یہ کونسل مشتمل ہونا چاہیئے۔ ذہن و فکر کے بارے میں کوئی الجھن نہیں ہر صحیح الخیال پاکستانی کی رائے یہی ہوگی کہ قوم کی مجلسِ شوریٰ جملہ ارکان کا ذہن اسلامی اور فکر مومنانہ ہو، طبیعت و مزاج کا معاملہ بھی چنداں پیچیدہ نہیں طبیعت معتدل و متوازن اور مزاج مدبرانہ۔ ع یہ تین عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان۔ استعداد اور معیار کا مسئلہ البتہ غور طلب ہے بالغ، عاقل تندرست، آبرومند، معزز ان فضائل میں تو کسی کو بھی کلام نہ ہوگا لیکن استعداد کا جو مفہوم عام طور پر لیا جاتا ہے، وہ ہے تعلیم یا علمی قابلیت، اور ہمارے ملک میں جدید و قدیم کی بالکل بے معنی و بے مصرف آویزش کی بنا پر اسی سے بڑی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ یوں سوچنا کہ کچھ مولوی۔ مولانا، چند علمائے دین اور مفتیانِ شرع متین کو بھی تبرک کے طور پر یا بطریق کار ثواب کونسل میں شامل کر لیا جائے تو قدیم کی نمائندگی کی شرط پوری ہو جائے گی درست نہیں ہے بلکہ اس سے بات اور الجھ جاتی ہے۔

ایسی کونسلوں یا مجالس میں سب سے زیادہ اہمیت ہم آہنگی فکر کی ہوتی ہے۔ اگر انمل بے جوڑ، یکقلم متضاد و متحارب فکر و عمل ہر دو کے اعتبار سے بعد المشرقین رکھنے والے عناصر محض اس مفروضے پر جمع کر دیئے گئے کہ اس طرح جملہ موثر و مقبول

طبقوں اور مکاتب خیال کی نمائندگی کا تقاضا پورا ہو گیا تو ظاہر ہے کہ بمقتضائے ؎ مری تعمیر میں مضمر ہے ایک صورت خرابی کی
ایسی کونسل یا مجلس سے کسی کار خیر کے اہتمام اور کسی مفید کارنامے کی تکمیل کی توقع بیکار ہے۔ اہمیت اس چیز کو ہونا چاہیے کہ جتنے
اور جیسے عناصر وہاں مجتمع ہوں ان کے اندر بلکہ ان سب کے اندر ایک ہی جذبہ کارفرما اور ایک ہی روح بے چین و بیقرار ہو
اور وہ ہے ملت اسلامیہ کا حقیقی مفاد، امتِ مسلمہ کی نشاۃ کیلئے تڑپنا اور اس مفاد کے حصول اور اس تڑپ کی تسکین کے لئے جن
تدبیروں پر اتفاق رائے یا غلبۂ آراء ہو وہ تدبیریں وہ منصوبے سب قرآن و سنت کے مطابق اسلام کی ابدی صداقت والے
رہنما اصولوں سے ہم آہنگ اور ہر آن تغیر پذیر معاشرے کے جملہ تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی کامل و کماحقہ صلاحیت رکھتے ہوں

یہ تو تھا مثبت رخ استعداد و معیار کے پہلو کا بھی ایک دوسرا رخ اور بھی ہے۔ اور وہ بھی اس قدر اہم ہے اور وہ
ہے ان عناصر کو اس کونسل سے بہرحال باہر رکھنے کا جنہوں نے اس ملک کی قسمت سے کھیلنے کو اپنی ذاتی اور خاندانی تقدیر
کے بلند و پست سے وابستہ کر رکھا ہے۔ ان عناصر کی نشاندہی کی چنداں ضرورت نہیں ان کے چہرے ملت کی چشم بصیرت
سے آشکارا ہیں اور آج بھی ان کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے کہ جیسے ہی کسی سیاسی پیش رفت کا اعلان
ہوتا ہے یا ایسا قرینہ پیدا ہوتا ہے کہ اس ملک کے دن پھریں یہ عناصر فعال و سرگرم ہو جاتے ہیں کوئی گول میز
کانفرنس کا نعرہ بلند کرتا ہے کوئی غیر سیاسی اتحاد کی باتیں بنانے لگتا ہے۔ ایسے جملہ عناصر کو اس تجربے کے
قریب بھی نہ پھٹکنے دیا جائے۔ یہی سبب ہے جن ارباب اقتدار کو اسی کونسل کے ارکان نامزد کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے
ان سے یہی التماس ہے کہ ان دونوں مصلحتوں کو سختی سے پیش نظر رکھیں
من آنچہ شرط بلاغ است باتو میگویم۔

اسمٰعیل احمد مینائی
۲۷ ؍ اکتوبر ۱۹۸۱ء

طالب ہاشمی

حضرت عبداللہؓ بن مُغفّل مزنی

وسط سنہ ۹ ھ ہجری کا ذکر ہے کہ شامی تاجروں کا ایک قافلہ مدینہ منورہ میں وارد ہوا۔ ان تاجروں نے اہلِ مدینہ کو بتایا کہ قیصرِ روم مدینہ منورہ پر دھاوا بولنے کے لئے پرتول رہا ہے اور اس مقصد کے لئے اس نے ایک زبردست لشکر جمع کیا ہے جس میں کچھ غیر مسلم عرب قبائل لخم، جذام، غسان وغیرہ بھی شامل ہو گئے ہیں۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ خبر پہنچی تو آپؐ نے فرمایا کہ ہم رومیوں کو سرزمینِ عرب پر قدم نہیں رکھنے دیں گے اور آگے بڑھ کر ان کا مقابلہ عرب کی سرحد پر کریں گے اس کے ساتھ ہی آپؐ نے مسلمانوں کو طویل صحرائی سفر اور جہاد کے لئے تیاری کا حکم دے دیا۔ ان ایام میں خشک سالی، قحط اور شدید گرمی نے قیامت ڈھا رکھی تھی، پھر کھجوروں کے پکنے کا زمانہ بھی قریب تھا اور لوگ بے تابی سے پھل پکنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ان حالات میں دور دراز کا سفر جس میں منزلوں تک پانی بھی نہیں ملتا تھا بڑا جان جوکھوں کا کام تھا لیکن اہلِ ایمان نے جونہی اپنے آقا و مولاؐ کا حکم سنا وہ سب کچھ بھول بھال گئے۔ اور ارشادِ نبوی پر لبیک کہتے ہوئے دیوانہ وار جہاد کی تیاریوں میں مشغول ہو گئے۔ اسی موقع پر جب حضورؐ نے مسلمانوں کو مالی قربانی کی ترغیب دی تو انہوں نے ایثار و قربانی کے ایسے نمونے دکھائے کہ چشمِ فلک نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھے تھے سیدنا صدیق اکبرؓ نے گھر میں جھاڑو پھیر دی اور سوئی سلائی تک لا کر راہِ حق میں پیش کر دی۔ سیدنا عمر فاروقؓ نے گھر کا آدھا اثاثہ لا کر بارگاہِ رسالت میں پیش کر دیا۔ حضرت عثمان ذو النورینؓ نے ایک ہزار دینار طلائی نو سو اونٹ اور ایک سو گھوڑے مع ساز و سامان نذر کیے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے چالیس ہزار درہم نقرئی پیش کیے۔ اسی طرح دوسرے صحابہؓ اور صحابیاتؓ نے انفاق فی سبیل اللہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہاں تک کہ خواتین نے اپنے زیور تک اتار کر دے دیے لیکن اللہ کے ان پاکباز بندوں میں کچھ ایسے بھی تھے۔ جو اپنی ناداری اور تہی دستی کے سبب نہ سواری کا انتظام کر سکتے تھے اور نہ زادِ راہ بہم کرنے کی مقدرت رکھتے تھے دوسری طرف ان کے جوشِ ایمان اور شوقِ جہاد کا یہ عالم تھا کہ گھر میں بیٹھے رہنا کسی صورت میں گوارا نہ تھا دوسرے مسلمان بھائیوں کو جہاد کی تیاری کرتے دیکھتے تو دل مسوس کر رہ جاتے۔ ایسے ہی کچھ نادار اصحابِ رسولؐ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کی۔

"یارسول اللہ ہمارے ماں باپ آپ پر قربان، ہماری حالت آپ سے مخفی نہیں
نہ ہمارے پاس سواری ہے اور نہ ہم زادِ راہ مہیا کرنے کی مقدرت رکھتے ہیں
اگر حضور اس کا بندوبست فرمادیں تو ہم بھی جہاد فی سبیل اللہ کی سعادت
حاصل کرلیں گے۔"

چونکہ لشکر کی تعداد کثیر تھی اور سواریوں اور دوسرے سامان کی شدید قلت، اس لیے حضورؐ نے ان کی درخواست قبول کرنے سے معذرت فرمائی۔ سواری اور زادِ راہ کے بغیر بے آب وگیاہ صحرا میں طویل سفر کرنا انسانی طاقت سے باہر تھا اس لئے بارگاہِ نبوی سے صاف جواب پاکر یہ لوگ سمت دل شکستہ ہوئے اور اپنی محرومی پر مایوس ہوکر رونے لگے۔ اللہ تعالیٰ کو ان کا جذبۂ اخلاص اس قدر پسند آیا کہ ان کے حق میں سورۂ توبہ میں آیات نازل ہوئیں۔ جن کا مطلب یہ ہے

ترجمہ:- اور نہ ان لوگوں پر کوئی الزام ہے کہ جب وہ تمہارے پاس آئے
کہ تم ان کے لئے سواری کا انتظام کردو تو تم نے کہا کہ میرے پاس کوئی
سواری نہیں ہے۔ یہ سن کر وہ پلٹ گئے اور خرچ میسر نہ آنے کے غم میں اُن
کی آنکھیں اشک بار تھیں

ان مخلص اہلِ ایمان میں قبیلہ مزنیہ کے ایک صاحب بھی تھے۔ گردسے اَٹا ہوا ان کا بوسیدہ لباس ان کی ناداری کا غماز تھا لیکن ان کے چہرے پر نورِ سعادت کی ایسی چمک تھی کہ کوئی دیکھنے والا اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا ان کی بے قراری اور جوشِ گریہ کو مدینہ کے ایک نیک دل بزرگ ابن یمینؓ نے دیکھا تو، پوچھا بھائی یہ رونا دھونا کس لیئے ہے؟ انہوں نے کہا، جہاد میں شریک ہونے کے لئے حضورؐ سے سواری مانگی تھی مگر نہیں مل سکی اور مجھ میں اتنی استطاعت نہیں کہ سفر کا سامان مہیا کرسکوں، اسی لئے اپنی بدقسمتی پر رو رہا ہوں۔

یہ سن کر ابنِ یمین نے انہیں ایک اونٹ اور کچھ کھجوریں ہدیۃً پیش کیں۔ خلافِ توقع سواری اور زادِ راہ پاکر وہ صاحبِ رسول اتنے مسرور ہوئے کہ قدم زمین پر نہ ٹکتے تھے بڑے ذوق وشوق سے اسلامی لشکر میں جا شامل ہوئے اور مدینہ منورہ سے تبوک تک رحمت دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔ یہ صاحب رسول جن کے جوشِ ایمان اور جذبۂ اخلاص کی بارگاہِ الٰہی میں پر زور الفاظ میں پذیرائی ہوئی اور جن کی دلی تمنا کو پورا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک اور نیک بندے کو وسیلہ بنادیا، حضرت عبداللہ بن مغفل تھے۔

۲- سیدنا ابوسعید عبداللہ بن مغفل کا تعلق قبیلہ مزینہ سے تھا جو مضر کی مشہور شاخ ہے۔ مشہور مداحِ رسول حضرت کعبؓ بن زہیر (قصیدہ بانتِ سعاد کے خالق) بھی اسی قبیلے سے تھے انہوں نے ایک شعر میں اپنے مزنی ہونے پر اس طرح فخر کا اظہار کیا ہے۔۔

هُمُ الْاَصْلُ مِنِّیْ حَیْثُ کُنْتُ وَاِنَّنِیْ
مِنَ الْمُزَنِیِّیْنَ الْمُصَفِّیْنَ بِالْکَرَمِ۔

"یہی لوگ میرے بزرگ ہیں جہاں کہیں بھی میں ہوں بلاشبہ میں شریف اور معزز مزنیوں میں سے ہوں"
یہ قبیلہ نجد میں آباد تھا اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن مغفل بھی وہیں کے رہنے والے تھے سلسلہ نسب یہ ہے۔
عبداللہ بن مغفل بن عبد نہم بن عفیف بن سہم بن ربیعہ بن عدی بن ثعلبہ بن ذویب بن سعد بن عدی بن عثمان بن مزینہ۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن مغفل ۶ھ ہجری میں شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہوئے ان کے قبول اسلام کے تھوڑے عرصہ بعد (ذیقعدہ ۶ھ میں) سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ کے لئے مکہ روانہ ہوئے اس سفر میں چودہ سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور کے ہم رکاب تھے ان میں حضرت عبداللہ بن مغفل بھی شامل تھے۔ جب حضور ﷺ کو خبر ملی کہ قریش مکہ مسلمانوں کی مزاحمت کا ارادہ رکھتے ہیں تو آپ ﷺ نے حدیبیہ کے مقام پر پڑاؤ ڈال دیا۔ اسی جگہ "بیعت رضوان" کا عظیم الشان واقعہ پیش آیا جس میں اس موقع پر موجود تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور ﷺ کے دستِ مبارک پر بڑے ذوق وشوق سے جاں نثاری کی بیعت کی۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے بھی یہ سعادت حاصل کی اور یوں وہ ان خوش بخت اصحاب میں شامل ہو گئے جن کو اللہ تعالیٰ نے کھلے لفظوں میں اپنی خوشنودی کی بشارت دی۔ صلح حدیبیہ کے بعد غزوۂ خیبر پیش آیا، حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ اس غزوے میں بھی جانبازانہ شریک ہوئے صحیح بخاری میں ان سے یہ واقعہ منقول ہے کہ ہم نے خیبر کا محاصرہ کر رکھا تھا، میں بھی محاصرین میں شامل تھا اثنائے محاصرہ میں کسی نے چربی سے بھری ہوئی تھیلی اوپر سے پھینکی میں اسے اٹھانے کے لئے آگے بڑھا لیکن جب دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیکھ رہے ہیں، تو میں سخت نادم ہوا۔

فتح مکہ (۸ھ) میں حضرت عبداللہ بن مغفل ان دس ہزار "قدسیوں" میں شامل تھے جنہیں اس موقع پر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی کا شرف حاصل ہوا۔

صحیح بخاری میں ان سے روایت ہے کہ میں نے فتح مکہ کے روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ ﷺ اونٹنی پر سوار تھے اور سورۂ فتح پڑھتے جاتے تھے اور اس کو دوہرتے تھے۔ بخاری ہی کی ایک اور روایت میں حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ فتح مکہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخل ہوئے تو اس وقت کعبہ میں تین سو ساٹھ بت تھے آپ ﷺ ان کو ہاتھ کی لکڑی سے مار مار کر فرماتے جاتے تھے۔

جَآءَ الْحَقُّ وَزَھَقَ الْبَاطِلُ جَآءَ الْحَقُّ وَمَا یُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا یُعِیْدُ۔

۹ھ ہجری میں غزوۂ تبوک پیش آیا اس موقع پر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے جس اخلاص اور جوشِ ایمان کا مظاہرہ کیا اس کا ذکر اوپر آچکا ہے انہوں نے اپنے جذبۂ فدویت اور اخلاص فی الدین کی بدولت بارگاہِ نبوی میں درجۂ تقرب حاصل کر لیا تھا۔ قبول اسلام کے بعد برابر کئی سال تک مدینہ منورہ میں مقیم رہ کر فیضانِ نبوی سے بہرہ یاب ہوتے رہے یہاں تک کہ فضلائے صحابہ میں شمار ہونے لگے۔ ۱۱ھ ہجری میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے رحلت فرمائی تو حضرت عبداللہ

پر کوہِ غم ٹوٹ پڑا۔ علامہ ابن سعد کا بیان ہے کہ حضورؐ کے وصال کے بعد حضرت عبداللہؓ بن مغفل نے مدینہ منورہ کی سکونت ترک کر دی اور اپنے وطن جاکر مقیم ہو گئے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں بصرہ آباد ہوا تو امیر المومنین کو چند ایسے لوگوں کی تلاش ہوئی جو وہاں کے باشندوں کو قرآن و حدیث اور فقہی مسائل کی تعلیم دے سکیں اس سلسلے میں ان کی نگاہِ انتخاب حضرت عبداللہؓ بن مغفل پر بھی پڑی جنہیں انہوں نے پانچ دوسرے صحابہ کے ساتھ اہل بصرہ کی تعلیم و تربیت پر مامور کر دیا۔

(۳)

امیر المومنینؓ کے ارشاد کی تعمیل میں حضرت عبداللہؓ بصرہ چلے تو گئے لیکن اُن کے دل میں ہر وقت شوق جہاد موجزن رہتا تھا جو انہیں چین سے نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد عراق عرب جانے والے مجاہدین میں شامل ہو گئے اور ایرانی فوجوں کے خلاف کئی معرکوں میں اپنی سرفروشی کے جوہر دکھائے۔ ۱۷ھ میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ حاکم بصرہ نے خوزستان پر فوج کشی کی تو حضرت عبداللہؓ بن مغفل بھی ان کے لشکر میں شامل ہو گئے۔ حافظ ابن عبد البرؒ نے "الاستیعاب" میں لکھا ہے کہ خوزستان کے صدر مقام ستوستر پر مسلمانوں کا استیلا ہوا تو حضرت عبداللہؓ بن مغفل شہر میں داخل ہونے والے مجاہدین میں سب سے آگے آگے تھے اس طرح عراق کے کئی معرکوں میں دادِ شجاعت دینے کے بعد حضرت عبداللہؓ واپس بصرہ آگئے اور حسب سابق درس و افتاد میں مشغول ہو گئے۔ ۵۹ھ یا ۶۰ھ میں سخت بیمار ہو گئے جب جانبری کی کوئی امید نہ رہی تو گھر والوں کو وصیت کی کہ غسل کے آخری پانی میں کافور ملانا، غسل کے وقت صرف احباب موجود ہوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی غسل دیں۔ کفن میں دو چادریں اور ایک قمیض ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کفن ایسا ہی تھا۔ جنازے کے پیچھے آگ نہ روشن کی جائے ابن سعد کا بیان ہے کہ اس موقع پر حضرت عبداللہؓ نے یہ وصیت بھی کی کہ حاکم بصرہ عبیداللہؓ [illegible] نے اجل کو لبیک کہا تو ان کے ورثا نے ان کی وصیتوں پر پورا پورا عمل کیا۔ جب جنازہ اٹھایا گیا تو ابن زیاد انتظار میں کھڑا تھا اس کو حضرت عبداللہؓ کی وصیت سے آگاہ کیا گیا تو تھوڑی دور جنازے کے ساتھ جاکر واپس چلا گیا جلیل القدر صحابی حضرت ابو برزہ اسلمیؓ نے نماز جنازہ پڑھائی اور پھر اس معدنِ فضل و کمال کو سرزمینِ بصرہ میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ حافظ ابن عبد البرؒ کے بیان کے مطابق انہوں نے سات اولادیں اپنی یادگار چھوڑیں۔

حضرت عبداللہؓ بن مغفل علم و فضل کے اعتبار سے بڑے بلند مقام پر فائز تھے ان کے علمی مرتبہ کا اندازہ اسی بات سے کیا جا سکتا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ جیسی مردم شناس شخصیت نے انہیں اہل بصرہ کی تعلیم و تربیت کے لئے منتخب کیا۔ حضرت عبداللہؓ سے ۴۳ احادیث مروی ہیں، ان میں سے ۴ متفق علیہ ہیں، ایک میں امام بخاریؒ اور ایک میں امام مسلمؒ منفرد ہیں۔ ان کے ارشد تلامذہ میں حضرت خواجہ حسن بصریؒ، حضرت سعیدؒ بن جبیر حضرت حمیدؒ بن ہلال اور حضرت مطرفؒ بن عبداللہ کے اسماءِ گرامی قابل ذکر ہیں۔

حضرت عبداللہؓ بن مغفل کے صحیفۂ اخلاق میں حبِ رسول۔ شوق جہاد اخلاص فی الدین، اسوۂ حسنہ کی پیروی اور بدعات سے اجتناب سب سے نمایاں ابواب ہیں۔ لوگوں کو بڑے لطف و انبساط سے حضورؐ کے ارشادات

سناتے تھے اور ایسے کاموں سے منع فرماتے تھے جن کو حضورؐ نے ناپسند فرمایا تھا۔ صحیح بخاری میں ان سے روایت ہے کہ میں نے ایک شخص کو کنکر پھینکتے ہوئے دیکھا تو اس سے کہا کہ بھائی کنکر نہ پھینکو ایسا کرنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا ہے۔ میں نے آپؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اس سے نہ شکار مرتا ہے اور نہ کوئی دشمن زخمی ہو سکتا ہے البتہ کسی کا دانت ٹوٹ جائے گا یا آنکھ پھوٹ جائیگی۔ چند روز بعد میں نے پھر اینٹ مارتے ہوئے دیکھا تو کہا کہ کیا میں نے تجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان نہیں کی تھی تو پھر بھی اینٹیں مارتا ہے، جا میں تجھ سے اتنے روز بات نہیں کروں گا۔

مسند احمد بن حنبلؒ میں حضرت عبد اللہؓ کے صاحبزادے سے روایت ہے کہ میں نے اپنے والد سے بڑھ کر بدعات کو برا سمجھنے والا کوئی نہیں دیکھا، ایک مرتبہ میں نے نماز میں بسم اللہ جہر کے ساتھ پڑھی جب سلام پھیرا تو والد نے کہا، بیٹا اسلام میں باتیں نہ بڑھاؤ۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ابو بکرؓ، عمرؓ، اور عثمانؓ کے پیچھے نمازیں پڑھی ہیں ان میں سے کوئی بھی نماز میں بسم اللہ جہر کے ساتھ نہیں پڑھتے تھے۔

سنن ابو داؤد میں حضرت عبد اللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی کہ تم میں سے کوئی ہرگز ایسا نہ کرے کہ اپنے غسل خانہ میں پہلے پیشاب کرے اور پھر اس میں غسل یا وضو کرے۔ کیونکہ اکثر وسوسے اسی سے پیدا ہوتے ہیں۔ غرض حضرت عبد اللہؓ اسی طرح لوگوں کو حضورؐ کے ارشادات سنا سنا کر دم آخر تک حسنِ اخلاق اور حسنِ معاشرت کی تعلیم دیتے رہے۔

ہدیۂ عقیدت

عبد المجید خاں افضل

حمد

کہاں تعقل! کہاں ترا ادراک! تو کہاں اور کہاں زمانہ — تو اُن کا خالق یہ خلق ادنیٰ سگِ بدرگاہِ خسروانہ

ہے دشتِ عرفاں یہاں تو نترک انبیا کے پڑے ہیں خالی — پھر اور ہے کس کا تیر جس کو نصیب ہو جائیگا نشانہ

حقیقت و ماہیت تو تیری فقط تجھی پر ہے آشکارا — کرے کوئی اور اس کا دعویٰ تو فی الحقیقت ہے وہ فسانہ

یہ ایک عبدِ ذلیل و عاصی اور ایسے انعام اللہ اللہ — تری عطا ہائے بے نہایت ترے کرم ہائے بے کرانہ

ہو اک خطا سہو سے بھی افضل تو دل پہ گرتی ہے برقِ خجلت
یہ کیا قیامت ہے روز و شب جرم بالعمد اور جاودانہ۔

ظہیر رضوی

نعت

تمہارے در کا گدا ہوں، مجھ کو نہیں تمنائے تاجِ شاہی — مری لگا ہوں میں کیا جچے گا کسی کا پندارِ کج کلاہی

تمہاری خاکِ قدم سے آنکھوں میں نورِ ایماں کی روشنی ہے — نہ ہے مقدر کہ مٹ گئی سر بسر مرے قلب کی سیاہی

خدا نے تم کو شفیعِ روزِ جزا بنایا ہے میرے آقا — مرے گناہوں کی کیا حقیقت جہاں ہو رحمت کی سربراہی

کمالِ انسانیت کے پیکر، جمالِ تخلیق تم پہ نازاں۔ — تمہارے ہر قول ہر عمل میں خدائے یکتا کی ہے گواہی

ولا تمہاری ہے دو جہاں میں فلاحِ مومن نجاتِ مومن — ولا ہی کام آئے گی یہاں بھی، وہاں بھی کام آئیگی ولا ہی

یہ سب تمہارے ہیں نام لیوا ہم جو لڑ لڑ کے مر رہے ہیں — تم اپنی اُمت کا حال دیکھو جسے ہے گھیرے ہوئی تباہی

ترے نبیؐ کی ثنا تو کیا کر سکے گا کوئی بشر جہاں میں
ظہیر کا ہدیۂ عقیدت قبول ہو جائے یا الٰہی۔

عبد الرشید عراقی

امام ابن العربی

سنہ ۴۶۹ھ تا سنہ ۵۴۳ھ

اندلس کے آخری محدث

نام و نسب۔ ابوبکر کنیت، ابن العربی لقب

پورا نام و نسب یہ ہے۔ محمد بن عبداللہ بن محمد عبداللہ بن احمد[1] ابن العربی مغربی اندلسی سے مشہور ہیں۔

وطن۔ بلاد مغرب میں اقلیم اندلس کے مشہور بڑے شہر اشبیلہ کو ان کے مولد و منشا ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اسی کی نسبت سے وہ اشبیلی اور اندلس اور بلادِ مغرب سے تعلق کی وجہ سے اندلسی اور مغربی کہلاتے ہیں۔[2]

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (م سنہ ۱۲۳۹ھ) لکھتے ہیں۔

"آپ اندلس کے آخری عالم اور آخری حافظ حدیث تھے۔"[3]

اساتذہ ابتدائی تعلیم اپنے والد امام عبداللہ بن محمد (م سنہ ۴۹۲ھ) اور اپنے ماموں ابوالقاسم حسن ہوزنی سے حاصل کی ان کے علاوہ آپ نے اپنے زمانہ کے مشہور اساتذۂ حدیث سے تحصیل علم کی، جن میں چند ایک مشہور یہ ہیں۔

ابوالفضل ابن الفرات رح، قاضی ابوالحسن خلعی رح، ابوالحسن بن مشرف رح، ابوالقاسم بن ابوالحسن مقدسی رح، ابوالحسن بن عبدالقادر رح اور مکی بن عبدالسلام رح۔[4] ان کے آپ امام ابوحامد غزالی رح (م سنہ ۵۰۵ھ) کی بھی صحبت میں رہے۔[5]

تحصیل علم کے لیے سفر۔ ۱۷ سال کی عمر تحصیل علم کے لئے سب سے پہلے اپنے والد کے ہمراہ بلاد مشرق کی سیاحت کے لئے روانہ ہوئے اور اس سلسلہ میں آپ شام، بغداد، حجاز، مصر و اسکندریہ پہنچے اور ان مقامات پر آپ ارباب کمال اور آئمہ فن سے مستفید ہوئے۔

تبحر علمی۔ تفسیر، حدیث، فقہ، اصولِ فقہ، ادب، نحو، تاریخ، بلاغت، لغت، کلام پر آپ کی اچھی نظر تھی اور اس سلسلے میں آپ کی تصانیف شاہد ہیں، اور آپ کو تمام علوم میں مہارتِ تامہ اور دسترس حاصل تھی۔

---

[1] ابن خلکان ج ۲ ص ۲۹۲، بستان المحدثین ص ۲۱۹۔ [2] تذکرۃ المحدثین جلد ۲ ص ۳۵۹۔ [3] بستان المحدثین ص ۱۱۹۔
[4] بستان المحدثین ص ۲۱۹۔ [5] تذکرۃ المحدثین ج ۲ ص ۳۵۹۔

حدیث میں اندلس کے آخری حافظ حدیث تھے۔ ان کی بدولت احادیث و اسناد کے علم کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ فقہ اور اصولِ فقہ کے ماہر تھے علم تفسیر اور قرانیات پر اچھی نظر تھی۔ ادب و بلاغت میں یدِطولیٰ رکھتے تھے۔ نحو، کلام اور تاریخ میں مکمل عبور حاصل تھا شعر و سخن سے بھی اچھا ذوق رکھتے تھے۔

ان تمام علوم میں گوناگوں مہارتِ تامہ رکھنے پر ان کی جامعیت کا پتہ چلتا ہے۔ اسی بنا پر اہلِ سیر نے ان کو جامع کمالات، متبحر عالم، علوم و معارف میں مقدم اور انواع علوم میں بحث و کلام کرنے والا اور صحیح و ثواب کے امتیاز میں ثاقب الذہن قرار دیا ہے۔ [۱]

ابن العربی کا مسلک۔ بلاد مغرب کے علماء و فقہا کی طرح وہ بھی امام دارالہجرت مالک بن انس (م ۱۷۹ھ) کے فقہی مذہب و مسلک سے وابستہ تھے۔

اخلاق و عادات۔ اخلاق و عادات میں بھی ممتاز تھے ضبط و تحمل، نرمی و مروت، شرافتِ نفس، حسنِ عہد، خلوص و وفا میں اپنی مثال آپ تھے۔ [۲]

زہد و عبادت۔ زہد و تقویٰ اور ورع و تدین کے جامع تھے امام ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) فرماتے ہیں۔

"کہ وہ عابد و زاہد تھے حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئے تھے۔" [۳]

منصب قضاء۔ فقہ و اجتہاد میں کمال کی وجہ سے وہ اشبیلہ کے قاضی مقرر کئے گئے تھے۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحی کہتے ہیں:

"وہ اشبیلہ کے قاضی مقرر کئے گئے انہوں نے اس ذمہ داری کو اس قدر خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ وہ عوام و خواص میں نہایت مقبول ہو گئے لیکن چونکہ ان کے فیصلے بے لاگ ہوتے تھے اور وہ معاملاتِ قضا میں شدت بھی برتتے تھے اس لئے غالباً اس منصب سے معزول کر دیئے گئے۔" [۴]

ابتلاء و آزمائش۔ غالباً وہ اپنے کمالات کی وجہ سے محسود ہو گئے تھے اس لئے ان کو شدائد و محن سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ مورخین نے ان کے ابتلاء و آزمائش کے کئی واقعات لکھے ہیں۔ مگر ان سب میں کلام ہے۔ اور صحیح یہ ہے کہ آپ معاملاتِ قضا میں شدت برتتے تھے، اس وجہ سے ان کو مخالفت کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔

وفات۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے ان کا سنِ وفات ۵۴۶ھ لکھا ہے [۵] لیکن یہ کتاب کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ صحیح قول یہ ہے کہ ۵۴۳ھ میں آپ نے وفات پائی۔ [۶]

تصانیف۔ ابن العربی کثیر التصانیف تھے ان کی کتابیں مفید اور بلند پایہ ہیں۔ جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں ذیل میں ان کی فہرست درج کی جاتی ہے۔

۱۔ تذکرۃ المحدثین ج ۲ ص ۳۶۰۔ ۲۔ ابن خلکان ج ۲ ص ۲۹۳۔ ۳۔ البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۲۲۸۔ ۴۔ تذکرۃ المحدثین ج ۲ ص ۳۶۷۔ ۵۔ بستان المحدثین ص ۲۲۳۔ ۶۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۹۲۔

۱۔ تفسیر انوار الفجر۔ تفسیر انوار الفجر ان کی بہترین تصانیف میں سے ہے۔ اور فن تفسیر میں عمدہ کتاب ہے ان کا خود بیان ہے کہ میں نے اس کو ۲۰ سال میں مرتب کیا تھا اور ۸۰ ہزار اوراق پر مشتمل ہے[8]۔ یہ تفسیر اسی زمانہ میں ابو سفیان فارسی بن علی بن یوسف کے کتب خانے میں ۸۰ جلدوں میں موجود تھی۔[1]

۲ کتاب احکام القرآن۔ یہ فن تفسیر میں ایک عمدہ کتاب ہے اس کا قلمی نسخہ کتب خانۂ خدیویہ مصر میں ہے ۱۳۳۱ھ مطبع سعادة سے دو مجلدات میں شائع ہوئی ہے۔[2]

۳ کتاب الناسخ والمنسوخ۔ ۴ کتاب قانون التاویل۔ یہ دونوں کتابیں بھی فن تفسیر سے متعلق ہیں اور قرآنیات کے موضوع پر بہت عمدہ خیال کی جاتی ہیں۔

۵ کتاب المشکلین۔ اس میں کتاب و سنت کے بعض مشکلات کا ذکر ہے۔[3]

۶ کتاب شرح حدیث الذنک۔ ۷ کتاب شرح حدیث ام زرع۔ ۸ کتاب شرح حدیث جابر فی الشفاعة۔ یہ سب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے بعض احادیث کی شرح میں مستقل رسالے ہیں۔

۹ کتاب الکلام علی مشکل حدیث السبحات والحجاب۔ یعنی حجاب النور لو کشفہ لاحرقت سبحات وجہہ ما انتہی الیہ بصرہ من خلقہ[4]۔

۱۰ کتاب السباعیات ۱۱ کتاب المسلسلات یا السلسلات ان وسائل کا تعلق بھی فن حدیث سے ہے۔[5]

۱۲ کتاب النیرین فی شرح الصحیحین الصحیحین کی شرح ہے[6]

۱۳ ترتیب المسالک فی شرح موطا مالک۔ یہ موطا امام مالکؒ کی شرح ہے۔

کتاب القبس علی موطا مالک بن انسؒ۔ یہ بھی موطا کی شرح ہے۔ اس میں مصنف نے موطا کے متعلق لکھا ہے کہ یہ شرائع اسلام میں اول و آخر کتاب ہے ایسی کوئی اور کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔ کیونکہ امام مالکؒ نے اس کو فروع کے اصول کے لیے تمہید بنایا ہے۔ اور اس میں انہوں نے فقہ کے ایسے اہم اور بڑے اصولوں پر متنبہ کیا ہے جن کی جانب مسائل فروع میں رجوع کیا جاتا ہے۔ شرح ترمذی میں لکھتے ہیں کہ موطا ہی اولین اصل اور خلاصہ ہے اور صحیح بخاری اصل ثانی اور ان ہی دونوں کتابوں پر تمام کتب حدیث مسلم و ترمذی وغیرہ کی بنیادیں رکھی گئی ہیں۔ امام خطابی نے اس کا انتخاب اور ابوالحسن قابسی نے ملخص ترتیب دیا ہے۔ جو ملخص الموطا کے نام سے موسوم ہے[7]۔

۱۵ عارضة الاحوذی فی شرح جامع الترمذی۔ یہ جامع ترمذی کی مشہور و مقبول شرح ہے اس کی اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ علامہ سیوطیؒ (م ۹۱۱ھ) کے زمانہ تک اس کے علاوہ ترمذی کی کوئی مکمل شرح متداول نہ تھی۔ وہ فرماتے ہیں

---

[1] بستان المحدثین ص ۲۲۰۔ [2] تذکرۃ المحدثین ج ۲ ص ۳۶۷۔ [3] بستان المحدثین ص ۲۲۰۔ [4] ایضاً ص ۲۲۰۔
[5] تذکرۃ المحدثین ج ۲ ص ۳۶۷۔ [6] ایضاً ص ۳۶۷۔ [7] کشف الظنون ج ۲ ص ۵۷۲۔ مولانا سید سلیمان ندوی (م ۱۳۷۳ھ) لکھتے ہیں کہ ترتیب المسالک اور کتاب القبس۔ حافظ ابن عبدالبر قرطبی (م ۴۶۳ھ) کی شرح التمہید لما فی الموطا من المعانی والاسانید کا اختصار ہے۔ (حیات امام مالک ص ۱۰۰) [8] بظاہر یہ غلط معلوم ہوتا ہے غالباً آٹھ ہزار اوراق ہوں گے۔

لانعلم انه شرحه احد کاملا الا القاضی ابوبکر بن العربی فی کتابہ عارضة الاحوذی [1]۔ ہم کو ابوبکر بن العربی کی عارضۃ الاحوذی کے علاوہ ترمذی کی اور کسی کامل شرح کا علم نہیں

امام عبدالرحمان مبارک پوری رح (م ۱۳۵۳ھ) لکھتے ہیں۔

" یہ ترمذی کی مشہور شرحوں میں ہے۔ حافظ ابن حجر رح وغیرہ مشاہیر علمائے اسلام نے اپنی کتابوں میں اس سے استفادہ کیا ہے اور اس کے اقتباسات نقل کیے ہیں۔ [2]

مولانا عبیداللہ رحمانی مبارک پوری لکھتے ہیں!

" ابن العربی (م ۵۴۳ھ) کی شرح عارضۃ الاحوذی گو ضخیم اور مبسوط شرح ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ مصنف نے کتاب کے حل طلب مقامات اور محتاج شرح و ایضاح عبارات سے کم تعرض کیا ہے اور بعض اہم امور کو جن کا لحاظ شرح میں ضروری تھا۔ بالکل نظر انداز کر دیا ہے اور فقہی مباحث کو کچھ زیادہ طول دے دیا ہے [3]

یہ شرح مصر سے طبع ہو کر شائع ہو چکی ہے [4]

۱۶۔ شرح غریب الرسالہ
(۱۷) الانصاف فی مسائل الخلاف
۱۸ تخلیص التلخیص
(۱۹) المحصول فی اصول الفقہ یا کتاب المحصول فی علم الاصول
۲۰ کتاب المتکلمین۔
(۲۱) تبیین الصحیح فی تعیین الذبیح
۲۲ تفصیل التفضیل
۲۳ کتاب التوسط فی المعرفۃ
۲۴ سراج المریدین۔
۲۵ سراج المہتدین۔
۲۶ عواصم و قواصم
۲۷ نواہی و دواہی۔
۲۸ معرفۃ غوامض النحویین۔ یہ فن نحو کی کتاب ہے [5]
۲۹ کتاب الرحلۃ یا کتاب ترتیب الرحلۃ۔ یہ کتاب قواعد عربیہ پر مشتمل ہے [6]

ان کتابوں کا ذکر حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (م ۱۲۳۹ھ) نے اپنی مایہ ناز کتاب بستان المحدثین میں کیا ہے۔

مندرجہ ذیل کتابوں کا ذکر مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے اپنی کتاب تذکرۃ المحدثین جلد دوم بحوالہ صاحب نفح الطیب کیا ہے

۳۰ کتاب الداء الاقصی باسماء اللہ الحسنی و صفاتہ العلا (۳۱) کتاب العقد الاکبر للقلب الاصغر (۳۲) کتاب اعیان الاعیان ۳۳۔ رسالہ الکافی فی ان لا دلیل علی النافی (۳۴) کتاب ستر العورہ (۳۵) کتاب المراقی الزلف۔

---

[1] کشف الظنون ج ۲ ص ۵۷۲، [2] مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۸۴-۸۵ [3] مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۸۳، [4] سیرۃ البخاری ص ۲۹۴ [5] تذکرۃ المحدثین ج ۲ ص ۳۶۹ [6] تذکرۃ المحدثین ج ۲ ص ۳۶۹ [7] بستان المحدثین ص ۲۲۰

تسنیم مینائی

ماہر کے دوست

اب نہ ماہر القادری دنیا میں ہیں نہ نثار یار جنگ

رستم رہا زمیں پہ نہ بہرام رہ گیا　　اچھوں کا آسمان تلے نام رہ گیا

ماہر القادری نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی، اولاد ہوئی نہیں)۔ نثار یار جنگ مرحوم کا اکلوتا بیٹا محمد ہاشم نو عمری ہی میں بمقام رائچور (دکن) فوت ہو گیا تھا نومبر ۱۹۲۳ء کو، صرف ایک لڑکی اور تھی ہاشم مرحوم سے بڑی جو اکتوبر ۱۹۲۹ء میں قمر مقصود حمیدی سے منسوب ہوئی انہیں کی اولاد سے نواب صاحب مرحوم کا نام زندہ ہے چار بیٹے ہیں اور چھ بیٹیاں جن کی خوش نصیبی سے ان کی والدہ (دختر نواب نثار یار جنگ) اور ان کی نانی (بیگم نواب نثار یار جنگ کا سایہ ان کے سروں پر ہنوز موجود ہے۔

نواب صاحب مرحوم کے تذکرہ طویل ہو گیا ع اب سوچتا ہوں ختم کروں داستاں کہاں

اگست ۱۹۶۷ء میں ان کا دیوان شائع ہوا تھا جس پر تعارف ماہر القادری نے لکھا تھا اور رائے حضرت جگر مرادآبادی ۔ تعارف میں ماہر القادری نے اپنے اور نواب صاحب کے تعلقات کے بارے میں نیز نواب صاحب کی طبیعت، مزاج اور کلام کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اسی پر اسی تذکرے کو ختم کرنا احسن نظر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جامع المتوفین اور جامع الناس ہے۔ یقین ہے کہ باغ بہشت میں بھی یہ دونوں دوست ایک دوسرے کے لئے قرار جاں ہوں گے۔

تعارف

از مکرمی عزیزی جناب مولانا ماہر القادری صاحب سلمۂ اللہ تعالےٰ

زمانہ بہت گریز پا واقع ہوا ہے۔ پلک جھپکاتے جگ بیت جاتے ہیں۔ وقت کی رفتار تند و تیز ہی نہیں بے نیازانہ بھی ہے۔ زمانہ کسی کے بگڑنے بننے کی پرواہ نہیں کرتا۔ حادثات کے جھونکے قصر و ایوان کے بلوریں فانوسوں اور جھونپڑیوں کے چراغوں کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتے ہیں۔

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام　　کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے۔

کاروانِ زندگی نہایت ہی تیز گام اور صبا رفتار ہے بچپن، جوانی اور بڑھاپے میں یوں کہنے کو بہت کچھ دوری ہے

حقیقت میں یہ تینوں منزلیں توسنِ عمر کی وسعت یک گام ہو کر رہ جاتی ہیں۔ سائنس کا ڈھونڈا الجھنوں کے اعتبار سے دراز نظر آتا ہے
گردشِ زندگی کے سامنے اس کی طولانیاں کوتاہ ثابت ہوتی ہیں ٹھہرنا، مڑ کر دیکھنا اور آرام کرنا توسنِ حیات کی فطرت کے خلاف
ہے۔ چلنا اور چلتے رہنا، گردشِ انقلاب، سانحے، حادثے، نمودِ حباب، چشمکِ برق و شرار اور فروغِ شعلہ حسن، داستانِ زندگی
کے اوراق ہیں جو کبھی یکجا اور اکثر منتشر رہتے ہیں۔

خسرو ز تشنگی بیابانِ ہجر سوخت　　　　لے آب زندگی تو بہ جوائے کہ میروی

یاد ماضی میں حیدر آباد دکن جب پہلے پہل گیا تھا، اس بات کو بیس سال ہو گئے مگر سوچتا ہوں تو کل کی
بات معلوم ہوتی ہے۔ بیس سال کی مدت تھوڑی نہیں ہوتی۔ اس عرصہ میں بچہ پیدا ہو کر خوب جوان ہو جاتا ہے لیکن اس کو کیا
کیجیے کہ میرے حافظہ کا ایک نقش بھی دھندلا نہیں ہوا، مجھے یہ تک یاد ہے کہ میرے میزبان نے اپنے باورچی سے کہا تھا۔
"صاحب ہندوستان سے آئے ہیں ان کے لئے میٹھی دال تیار کرنا"
یہ میری قوت حافظہ کا کمال نہیں۔ یاد دکن کی کرامت ہے، میری سادگی دیکھیے کہ یہ جانتے ہوئے کہ زندگی کا ایک لمحہ
بھی گزرنے کے بعد واپس نہیں آسکتا میں یہ چاہتا ہوں کہ کاش! وہ دن کسی طرح لوٹ آئیں۔ ع

صدا ہیں دو مرے گزرے ہوئے زمانے کو۔

اس زمانہ کا دکن کچھ اور تھا، نہ یہ ہنگامے تھے اور نہ یہ شورشیں۔ تاریخوں میں دورِ مغلیہ کے جو حالات پڑھے تھے اس
کے کچھ آثار یہاں دکھائی دیتے تھے۔ آپس میں میل جول تھا۔ دلوں میں بدگمانی اور نفرت پیدا نہ ہوئی تھی قشقہ بر جبیں
ہندوؤں کی زبان سے "انشاء اللہ" اور "الحمد للہ" سن کر مجھے حیرت کے ساتھ خوشی ہوئی تھی کہ میل ملاپ کی برکت نے کتنی
رواداری اور دلوں میں وسعت پیدا کر دی ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ لوگوں میں اس وقت بیداری پیدا نہیں ہوئی تھی۔
بیداری تھی مگر پر امن اور صلح جو! قلب و دماغ میں اپنے حقوق کی حفاظت کے ساتھ صلح و اتحاد کے لئے بھی گنجائشیں
موجود تھیں۔

تعلیم آج کی طرح عام نہ تھی، مگر "علم" اب سے زیادہ تھا، مغرب زدہ حلقوں میں مشرقیت کا احترام کیا جاتا تھا
بوملی پر بے حجابی کے منظر دکھائی نہ دیتے تھے، نوجوان انقلابی تصورات سے آشنا تھے۔ مگر ان تصورات پر "کمیونزم" کی
پرچھائیں بھی نہ پڑی تھی، مسلمان نوجوانوں کی نگاہیں گنبدِ خضرا کے طواف کے لئے وقف تھیں ماسکو اور اسٹالن گراڈ
کے نظارے میں نہ الجھی تھیں۔!

ایک شعر ۔ کہنا کچھ اور چاہتا تھا۔ اور بات دوسری نکل آئی مگر اس وارفتگی پر میں معذرت کرنے کے لئے تیار
نہیں ہوں۔ شاید یہی مقام ہے جہاں ہوش و خرد پر جنوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ ہاں! تو اس زمانہ میں یہاں (دکن)
میں شعر و سخن کا بہت زیادہ چرچا تھا عام مشاعروں سے زیادہ خانگی جلسوں، دعوتوں، اور پارٹیوں میں شعر خوانی ہوتی تھی
مشاعروں کے گلدستوں پر گلدستے شائع ہوتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے دکن کی مٹی سے شعر اگتے ہیں۔
شاعر کو خوش آہنگ نغموں اور اچھی صورتوں سے زیادہ اچھا شعر اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اور وہ اس لئے کہ حسنِ صورت

سے زیادہ حسنِ معنی میں کشش اور جاذبیت پائی جاتی ہے۔ میں بھی بچپن سے اچھے شعروں کا فدائی ہوں! ایک دن بے تکلف دوستوں کا جمگھٹا تھا، ایک چھوٹے سے مکان کے صحن میں سب لوگ چٹائی پر بیٹھے تھے۔ دکن کی رات یوں بھی کیف انگیز ہوتی ہے، ہم خیال اور مخلص احباب کی موجودگی نے رات کی کیفیت کو اور زیادہ پر لطف بنا دیا، باتوں ہی باتوں میں شاعری کا ذکر چھڑ گیا ایک دوست نے یہ شعر سنایا۔

اتنا تو مجھے یاد ہے کچھ اس نے کہا تھا کیا اس نے کہا تھا یہ مجھے یاد نہیں ہے۔

شعر سنتے ہی میرا دل لوٹ گیا، اور ایک بار کے سننے ہی میں شعر یاد بلکہ یوں کہیے کہ دل پر نقش ہوگیا۔ میں نے پوچھا یہ کس ظالم کا شعر ہے؟ جواب ملا کہ شاعر کا نام معلوم نہیں! اس شعر نے نہ جانے کتنی چوٹوں کو ابھار دیا۔ بہت دن تک اس ایک شعر نے مجھے بے چین رکھا، جذبۂ رشک زبانِ حسرت بن کر کہتا تھا کہ کاش یہ شعر میرا ہوتا۔

اس واقعہ کے تقریباً ایک سال بعد میرا الوال جانا ہوا، یمین السلطنۃ سر مہاراجہ کشن پرشاد بہادر شاد (آنجہانی) صدر اعظم دولت آصفیہ وہیں اپنی جاگیر میں فروکش تھے۔ شام کا وقت تھا، مہاراجہ بہادر اس دن بہت مسرور اور متاثر تھے چائے کے دور کے بعد صاحبِ موصوف نے اپنی شیروانی کی جیب سے ایک پرچہ نکالا، اور غزل سنانی شروع کی غزل کا ایک مصرعہ یہ تھا۔ لوحِ جبینِ غزنوی سنگِ درِ ایاز ہو۔

مہاراجہ بہادر غزل پڑھنے میں خود بھی جھومتے جاتے تھے، اور سننے والے بھی لطف لے رہے تھے، افرمانے لگے ابھی بیدر کے تعلقدار (کلکٹر) نواب نثار یار جنگ بہادر مزاج مجھ سے مل کر گئے ہیں۔ انہوں نے اپنی تازہ غزل سنائی تھی، مجھے یہ غزل پسند آئی اور میں نے لکھ لی۔

حضرت مزاج سے یہ میرا پہلا غائبانہ تعارف تھا اس کے بعد ان کی دو تین غزلیں بلدہ حیدرآباد کے اخباروں میں نظروں سے گزریں جن کو میں نے بہت شوق اور دلچسپی کے ساتھ پڑھا، پھر یہ معلوم کر کے کہ وہ شعر جسے میرے ایک دوست نے سنایا تھا اور جو میرے دل پر نقش ہو کر رہ گیا ہے۔ حضرت مزاج ہی کا ہے۔ ان سے ایک گونہ قلبی تعلق پیدا ہوگیا!۔

تعارف۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ میں ایکا ایکی سرکاری نوکری چھوڑ کر حیدرآباد سے بھاگ کھڑا ہوا، اور روزنامہ "مدینہ" کی ادارت میں شامل ہوگیا۔ حیدرآباد سے احباب کے خط پر خط آئے کہ ہیں یہ تم نے کیا کیا، لگے ہوئے روزگار کو ٹھوکر ماردی، نمک کی کنکری کا مستقل سہارا ابھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ کسی نے مجھے متلون کہا، اور کسی نے عاقبت نااندیش، محبت کی گالیاں دشمنی کی دعاؤں سے زیادہ پیاری ہوتی ہیں۔

سنہ ۱۹۳۳ء کے وسط میں ڈاک اور تار کی مشکلات کی وجہ سے اخبار بند ہوگیا۔ اور اس ملک کے لئے میں نے رختِ سفر باندھ لیا۔ جس کے بارے میں شیخ سعدیؒ کا یہ جملہ ضرب المثل بن گیا ہے۔

"تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود"۔

عراق سے ہندوستان براہِ بمبئی واپس ہوا اور وہاں سے پھر حیدرآباد چلا آیا، احباب کی جمی جمائی صحبتیں اسی طرح موجود تھیں۔ جس حالت میں چھوڑ کر گیا تھا مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر کے دریائے نوازش کو پہلے سے زیادہ موآج

پایا، دوستوں اور کرم فرماؤں نے کہا کہ۔

ماہر! کہاں مارے مارے پھرتے ہو حیدرآباد میں جم کر رہو یہاں تمہارے لئے سب کچھ ہے۔ یہاں سے اچھا اور شستہ علمی ماحول بھی تمہیں ہندوستان میں کہیں نہیں ملے گا! میں رک گیا، رک جانا پڑا، آب و دانہ کی کشش نے پیروں میں زنجیریں ڈالدیں۔ مہاراجہ بہادر کا آستانہ مرجع خاص و عام تھا، شاعر، عالم صوفی، سنیاسی، پنڈت، جوتشی، رمال، سیاح، مطرب، نے نواز، سپاہی، پیادے، کرنیل، جرنیل، امیر، غریب، سبھی، وہاں آکر ٹھوکر کھاتے تھے اور دربار شاہ میں زیادہ تر علمی مذاکرے اور شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا، ابھی حجاز کے کسی عرب سیاح نے عربی میں قصیدہ نشید کے ساتھ پڑھا اور اس کے بعد بنارس کا پنڈت سنسکرت میں اپنی رچنا سنانے لگا۔ حضرت محی الدین ابن عربی کے فصوص الحکم۔ کے بیان ہوتے ہوتے، اپنشدہ کی شرح ہونے لگتی

اسی تاریخی دربار میں سب سے پہلے نواب نثار یار جنگ بہادر مزاج سے بالمشافہ تعارف ہوا حضرت فانی بدایونی مرحوم بھی موجود تھے۔ میں نے اپنے تنقیدی مقالہ کا ایک حصہ پڑھ کر سنایا۔

مہاراجہ بہادر کی ڈیوڑھی سے لوٹا تو خوب رات ہو گئی تھی میں اچکن اُتار کر بیٹھا ہی تھا کہ اتنے میں دروازے پر موٹر رکنے کی آواز آئی۔ پھر کسی نے دروازے پر دستک دی، میں باہر گیا تو فانی مرحوم اپنے ساتھ حضرت مزاج کو لئے کھڑے تھے مسکراتے ہوئے بولے۔

"بھئی ماہر! یہ نواب صاحب تمہاری تنقید سننے کے لئے آئے ہیں"۔ بیٹھک میں سب لوگ بیٹھے، میں نے تنقیدی مقالہ سنایا، مزاج اور فانی حوصلہ افزا انداز میں تعریفیں کرتے رہے۔

مخلصانہ مراسم۔ اس دن کے بعد سے جو حضرت مزاج سے رسم و راہ کا سلسلہ شروع ہوا ہے تو آج تک ۵ ر اگست ۱۹۷۰ء کی شام تک بدستور قائم رہے، حیدرآباد چھوٹے ہوئے چار سال ہو گئے۔ مگر اس جدائی نے خلوص و وفا کے ان روابط میں اور جان ڈال دی، دل سے دل کو راہ ہو تو ہزاروں کوس کی دوری لفتوں کی ایک جست میں طے ہو جاتی ہے۔ اس ملاقات کے بعد دوستی گہری ہوتی چلی گئی۔ غیریت اور بیگانگی کے پردے بہت جلد ایک ایک کر کے اٹھ گئے، نغمہ و رباب کی محفلوں سے لے کر مسجدوں، اور خانقاہوں کے در و بام اور منبر و محراب تک ہمارے اخلاص کے شاہد ہیں۔ دوستی، بے تکلفی، یگانگت، خلوص، اور مہر و وفا کی ایسی مثالیں اس خود غرض اور مطلبی دنیا میں بہت ہی کم ملیں گی۔

فانی بدایونی مرحوم اور حضرت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (مدیر ترجمان القرآن) ہے جو اس وقت اسلامی دنیا کے بڑے مفکر ہیں، میل ملاپ تھا اور یہ دونوں اتحاد و خلوص کی ان صحبتوں میں شریک تھے، مگر اس بزم علم و ادب اور محفل خلوص و محبت کو دنیا کی نظر لگ گئی۔ فانی پردیس میں دنیا سے سدھار گئے، اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی پنجاب چلے گئے۔

قدرت سے میری اور حضرت مزاج کی یہ تنہا نشینی نہ دیکھی گئی، حیدرآباد ہی میں ایک ایسا دوست مل گیا جس کی دوستی پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ نواب دستگیر نواز جنگ بہادر خاطر سے راہ و رسم ہو گئی اور پھر یہ تعلقات بڑھتے ہی چلے

گئے یہاں تک کہ ہم تینوں یک جان و سہ قالب ہو گئے، حضرت خاطر دوستوں کی خاطرداری اور دلدہی کرنے میں اپنی آپ نظیر ہیں۔ ایثار ان کی فطرت اور بلند حوصلگی ان کا شعار ہے۔ فارسی میں اچھی دستگاہ رکھتے ہیں، خوب شعر کہتے ہیں۔ اور شعر پرکھنے کی قابلِ اعتماد صلاحیت قدرت نے انہیں ودیعت فرمائی ہے۔

علمی بحثیں۔ حضرتِ مزاج سے یارانہ بڑھا تو دن رات شعر و شاعری کے تذکرے رہنے لگے، میں اپنی غزل سب سے پہلے انہیں کو سناتا اور وہ اپنے تازہ افکار سے مجھے نوازتے، گھنٹوں اسی موضوع پر بحث ہوتی، مزاج کے کہنے اور جتانے پر مجھے بعض اوقات شعروں کی ترکیب اور ترتیب بدلنی پڑتی اور کبھی میں تے بجنسہ ان کے مشورے کو قبول کر لیا میں ان کے شعروں پر تنقید کرتا تو وہ برا نہ مانتے، بحث ہوتی اور مطمئن ہونے کے بعد وہ میری بات مان لیتے۔!

یہ صحبتیں صرف شعر شاعری کے لئے مخصوص نہ تھیں، قرآن، حدیث، فقہ، تاریخ، تصوف، سیاسیات، اور فلسفہ پر بھی مذاکرے ہوتے۔ میں فطرتاً اظہارِ خیال میں بیباک ہوں جس بات کو حق سمجھتا ہوں اس کے اظہار میں کسی کی خوشی اور ناخوشی کی پرواہ نہیں کرتا، بعض وقت گفتگو میں گرمی اور تیزی بھی آجاتی، مگر پیشانی کی سلوٹیں بہت دیر تک ابھری نہ رہتیں، ایک آدھ مزاحیہ فقرہ اس برہمی کو دور کر دیتا، ایک بار تصوف کے ایک مسئلہ پر بہت زیادہ بے لطفی پیدا ہو گئی۔ کئی مہینے تک ایک دوسرے سے کھنچے رہے لیکن پھر جو ملے ہیں تو ایسا محسوس ہوا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا، پرخلوص مسکراہٹوں نے گلے شکوے تک کی نوبت نہ آنے دی، مزاج کی فراخ دلی اور درگزر پر مجھے مسرت سے زیادہ حیرت ہوئی

مجھے اپنے مطالعہ پر بہت اعتماد بلکہ یوں سمجھیے غرور و ناز تھا۔ کتابیں میرا اوڑھنا بچھونا تھیں، جب بھی فرصت ملتی پڑھتا ہی رہتا۔ بے شمار راتوں کی تنہائیاں میری کتب بینی کی عینی شاہد ہیں۔ مگر جب کسی علمی مسئلہ پر حضرت مزاج سے گفتگو ہوتی تو یہ دیکھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہتی کہ مزاج ان مسائل سے ناآشنا نہیں ہیں "میں فکر و مطالعہ کی جن منزلوں سے اب گزر رہا ہوں ان میں سے بہت سے راستے جناب مزاج کی فکر و تنظر کی جولاں گاہ رہ چکے ہیں" مجھے بہت مسرت ہوتی ہے کہ میرا کرم فرما دوست نہ صرف شاعر بلکہ علم دوست اور صاحبِ فہم و خبر بھی ہے۔ ایسے دوست ہر کسی کو نہیں ملتے۔

حالاتِ زندگی۔ سید نثار احمد المخاطب بہ نواب نثار یار جنگ بہادر (مزاج) سادات سبزوار کے معزز اور مستند خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں ان کے آباؤ اجداد شاہانِ مغلیہ کے دور میں ہندوستان آئے دربارِ شاہی میں قدر و منزلت ہوئی کئی گاؤں جاگیر کے طور پر عطا ہوئے مگر انقلاباتِ زمانہ کے ہاتھوں امارت اور فراغ و آسودہ حالی کی یہ بساط الٹ گئی

زانقلابِ زمانہ عجب مدار کہ چرخ — ازیں فسانہ ہزاراں ہزار دارد یاد
کہ آگہیست کہ کاؤس و کے کجا رفتند — کہ واقفست کہ چوں رفت تختِ جم برباد

حضرت مزاج علی گڑھ (یو پی) میں پیدا ہوئے بہت ہی کم سنی میں ان کے باپ داغِ یتیمی دے کر دنیا سے سدھار گئے۔ غم زدہ ماں نے بڑی ہمت اور حوصلے کے ساتھ پرورش کی حضرت مزاج فخر کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ میری بیوہ ماں نے مجھے غیرت کا سبق دیا، غیرت مجھے انہوں نے گھٹی میں پلائی مزاج کی اسی طبعِ غیور نے انہیں

کسی دُنیوی طاقت کے سامنے جھکنے نہ دیا اس عادت کی بدولت ان کو متعدد مالی نقصانات اٹھانا پڑے، ترقی کی راہیں بند ہوئیں جاہ و عزت کے بہت سے سنہری موقع ہاتھ میں آکر نکل گئے۔ مگر ان کا سرِ فخر و امتیاز سدا اونچا ہی رہا انہوں نے اپنی سطح سے گر کر جاہ و دولت کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ مزاج اپنی فطرت کے اعتبار سے خودداری اور غیرت کا وہ کوہِ آتش فشاں ہیں جو ذرا سی حرکت اور جنبش کو بھی برداشت نہیں کرسکتے۔ آغازِ جوانی ہی میں جناب مزاج کو تلاشِ معاش کے لئے پردیس جانا پڑا بمبئی میں انہوں نے ایک اسکول میں کچھ دن ٹیچری کے فرائض انجام دیئے ہیں بمبئی سے وہ حیدرآباد آئے اور یہاں آکر ایسے جمے کہ حیدرآباد کو اپنا وطن ہی بنا لیا۔

دکن میں انہوں نے ٹھیکہ داری بھی کی ہے۔ اہلکار بھی رہے ہیں۔ منتظمی کے فرائض بھی انجام دیئے ہیں۔ بابِ حکومت سرکارِ عالی (اکزیکٹو کونسل حیدرآباد دکن) کے پہلے صدرِ اعظم سر علی امام مرحوم کی پیشی میں معتمد علیہ کی حیثیت سے کام بھی کیا ہے سر علی امام مرحوم نے حکومتِ آصفیہ کی ترقی اور بالخصوص مسلمانوں کے تحفظ کے لئے بہت سی مفید اسکیمیں تیار کیں تھیں مگر افسوس کہ وہ سازشوں کا شکار ہو گئیں ان کے جانے کے بعد جناب مزاج محکمہ سیاسیات میں انڈر سکریٹری (مددگار معتمد) ہو گئے پھر دوم تعلقدار ہوئے اور اس کے بعد ضلع کے بااختیار حاکم (کلکٹر)۔

حضرت مزاج نے نہایت دیانت داری، اور فرض شناسی اور محنت و لیاقت کے ساتھ فرائض انجام دیئے جہاں رہے نیک نام رہے۔ وہ چاہتے تو دستِ غیب کی آڑ میں سونے چاندی کی اینٹوں سے اپنا گھر بھر لیتے مگر ان کی بلند فطرت، اسلامی حمیت اور مذہبی غیرت ان آلودگیوں کی پرچھائیں کو بھی گوارا نہ کرسکی اسی زمانہ میں مولوی سیّد نثار احمد کو بارگاہِ خسروی سے خطاب عنایت ہوا اور اب وہ نواب نثار یار جنگ بہادر ہو گئے۔

نواب نثار یار جنگ بہادر بے لوث عہدیدار تھے، عدل و جیزان کا شعار تھا چونکہ ان کا حساب پاک تھا۔ اس لئے محاسبہ کا کوئی خوف ہی ان کو نہ تھا، چند بالادست افسروں کے خوش کرنے کے لئے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے راعی و رعایا کے مفاد اور تعلقات متاثر ہوتے محکمۂ بالا کو ہمیشہ معقول جوابات دیئے اور وہاں سے جب کوئی ایسا حکم آیا جو اصولِ حکمرانی سے ٹکراتا تھا، تو جناب مزاج نے اس پر تنقید کی ان کے سفید فام افسروں کو یہ صاف بیانی اور معقول پسندی بھلی معلوم نہ ہوئی۔ اور وہ جو مہدی افادی نے اپنے دوست کو ایک خط میں لکھا تھا۔

"گورے دل کی سیاہی جب کاغذ پر آتی ہے تو اور زیادہ پھیل جاتی ہے"

تو حضرت مزاج کو بھی اسی ذہنیت سے واسطہ پڑا۔

مزدورِ طاقت و اقتدار کے سامنے دلیل و حجت کون سنتا ہے، نتیجہ یہ نکلا کہ مزاج مدت معینہ سے پہلے خود درخواست کرکے پنشن پر سبکدوش ہو گئے۔

چند دن کے بعد اعلیٰحضرت خسروِ دکن نے ان کو پھر صرفِ خاص مبارک کی کلکٹری پر فائز فرما دیا اور ~~انہوں نے~~ کئی سال تک نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ اس اہم خدمت کو انجام دیا اب وہ کئی سال سے خانہ نشین ہیں زیادہ وقت کتابوں کے مطالعے

میں گزرتا ہے، اور اللہ اللہ کرتے ہیں۔

عادات۔ حضرت مزاج نے اپنی ملازمت کے دوران میں اتنے لوگوں کی دستگیری کی اور جائز طور پر ان کو فائدہ پہنچایا جس کا شمار بھی مشکل ہے۔ حیدرآباد میں ان کے بہت سے احسان مند اور شکرگزار آج بھی موجود ہیں۔!۔

حضرت مزاج نواب صاحب کہلاتے ہیں۔ مگر حقیقت میں وہ ایک فقیر منش اور نہایت ہی سادہ فطرت اور منکسر المزاج انسان ہیں۔ ان کو شاید بھولے سے بھی اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ میں نوابی کے طرۂ امتیاز کا مالک ہوں، غریبوں، خاک نشینوں اور پریشان حالوں سے وہ اور جھک کر ملتے ہیں۔ اعلیٰ عہدہ داروں، امیروں اور دولت مندوں سے انہوں نے تعلقات پیدا کرنے کی کوشش ہی نہیں کی، وہ تو مجھ جیسے غریبوں اور آشفتہ حالوں کے یار ہیں مخملی قالینوں کے مقابلے میں چٹائی پر بیٹھ کر جناب مزاج کو زیادہ سکون، اطمینان اور راحت حاصل ہوتی ہے۔

غریبوں اور پریشاں حالوں کی مدد کرنے میں جناب مزاج کو لطف آتا ہے۔ اپنی ضرورت روک روک کر حاجت مندوں کو وہ نوازتے ہیں جب وہ صرف خاص کے اول تعلقدار اور مجسٹریٹ تھے تو ایسا بھی ہوا کہ فوجداری کے مقدمہ میں ملزم پر اپنے اجلاس سے انہوں جرمانہ کیا اور جب انہیں معلوم ہوا کہ ملزم جرمانہ ادا نہیں کرسکتا تو انہوں نے چپراسی کی معرفت خود اپنے پاس سے جرمانہ کی رقم عدالت کے خزانہ میں جمع کرادی اور ملزم چھوٹ گیا۔

عربوں کا سب سے بڑا وصف مہمان نوازی ہے، اس خصوصیت میں دنیا کی کوئی قوم ان کی حریف نہیں ہے جاہلیت میں بھی عربوں کا یہ عالم تھا کہ وہ خود بھوکے رہتے اور مہمان کو کھانا کھلاتے۔ اسلام نے اس جوہر کو اور چمکا دیا وہ اسلام جس کے شیدائیوں نے بدر و اُحد اور حنین و خندق میں کفر کا مقابلہ تلوار سے کیا اس کے مقدس پیغمبرؐ نے مہمان نوازی میں مسلم و کافر کے امتیاز کو بھی روا نہ رکھا ارشاد ہوتا ہے

اَکْرِمُوا الضَّیْفَ لَوْکَانَ کَافِرًا

نواب نثار یار جنگ بہادر مزاج غایت درجہ کے مہمان نواز ہیں۔ ان کی ساری عمر ہی دعوتیں کرنے، دوست احباب کو کھانا کھلانے اور لوگوں کی تواضع و مدارت میں گزرگئی۔ گھر میں اللہ کا نام ہے مگر قرض وام کا بندوبست کرکے مہمانوں کی مرغ اور بریانی سے تواضع کی جارہی ہے کسی دن رات میں کھانے کے وقت بہت سے دوست آگئے۔ گھر میں جو کچھ پکا تھا وہ سب دوستوں کی نذر ہوگیا اور ان کے گھر کے لوگ بھوکے سو رہے مہمان نوازی، بے سروسامانی اور فقر و فاقہ سادات کا شیوہ بھی تو ہے۔

جناب مزاج نے بام کعبہ کے کبوتروں سے بھی زیادہ بھولی طبیعت پائی ہے، ہر کوئی اپنی پریشانی اور آشفتہ حالی کا ذکر کرکے ان کو متاثر کرسکتا ہے۔ کسی کے دکھ درد کی کہانی سن کر وہ یہ سوچتے ہی نہیں کہ کہنے والے نے جو کچھ کہا ہے وہ کہاں تک صحیح و درست ہوسکتا ہے۔ اس سادہ فطرت کی بدولت لوگوں نے ان کو دھوکے دیئے ہیں اور ہزاروں روپیوں کے انہوں نے نقصانات اٹھائے ہیں۔ ان کی زندگی تجربوں اور انقلابوں سے گزری ہے مگر اس معاملہ میں وہ بچوں کی طرح بھولے بھالے اور ناتجربہ کار ہیں۔

حضرت مزاج دل کے صاف اور طبیعت کے بے لوث انسان ہیں، ان کے یہاں دو ہی جذبے ہیں، محبت یا نفرت

سے محبت ہے اس کے وہ بندہ بے دام ہیں اور جس سے نفرت و بیزاری ہے، اس سے دنیا دکھاوے کے بھی ملنا پسند نہیں کرتے۔ محبت اور نفرت کے درمیان کی حالت دوئی ان کو کسی قیمت پر گوارا نہیں اس معاملہ میں ملنے بڑی سے بڑی شخصیتوں کی بھی پرواہ نہیں کی۔ میں نے ایک بار اس سلسلے میں انہیں لڑکا تو بولے! بھائی میں میٹھے بولنے، چالنے، یہاں تک کہ اشاروں، کنایوں میں بھی منافقت کو پسند نہیں کرتا جس سے ملتا ہوں کر ملتا ہوں اور جس سے طبیعت میں بیزاری ہے اس سے بات کرنا بھی مجھے گوارا نہیں۔

صوفی مزاج۔ نواب نثار یار جنگ بہادر مزاج کی فطرت کو تصوّف سے خاص لگاؤ ہے خاندانِ چشتیہ ان کو شرف بیعت بھی حاصل ہے تصوف کا انہوں نے بہت کچھ مطالعہ کیا ہے شیخ سہاب الدین سہروردی کی بلند پایہ ف سے لیکر متصوفین کی معمولی کتابوں تک کو وہ لطف لے کر پڑھتے ہیں، تصوّف کی اصطلاحات اور ان کے مطالب زاج کی گہری نظر ہے۔ وحدت الوجود کے دل سے قائل ہیں۔ حضرت مولانا رومؒ کی مثنوی کے علاوہ ان کی تصنیف مانیہ" بھی مزاج کے غور و فکر کا مرکز رہی ہے۔

مولوی محمد اختر صاحب سہارنپوری جو فلسفہ و تصوّف میں دستگاہ کامل رکھتے ہیں، ان کی صحبت نے حضرت مزاج اس رنگ کو اور پختہ کردیا۔ یہی چیز ان کے اشعار میں جا بجا جھلکتی ہے انہوں نے بہت کچھ محسوس کرکے تصوّف آمیز عار کہے ہیں۔ بعض شعروں میں عطار اور عراقی کی روح کی جولانیاں نظر آتی ہیں کہیں کہیں قال سے حال معلوم ہوتا ہے نواب دستگیر نواز جنگ بہادر خاطر جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اس مسلئے میں حضرت مزاج کے ہم نوا بلکہ ان سے ت آگے ہیں تصوف کے مسائل پیر میری اور خاطر و مزاج کی اکثر نوک جھونک رہتی ہے، حضرت خاطر اگر بلدہ حیدرآباد بجائے قونیہ میں پیدا ہوئے ہوتے تو خانقاہ مولویہ کے ارادت مندوں میں شامل ہو کر قلندروں کے سرگروہ بن جاتے

مقامِ حیرت ہے کہ تصوّف سے اس قدر شغف اور گہری دلچسپی کے باوجود مزاج ان مشرکانہ رسوم اور بدعتوں قطعاً بیزار ہیں، جو عقیدت و تصوف کے نام سے مسلمانوں میں پھیلی ہوئی ہیں میں نے کسی مزار کے سامنے انکی نا ئی کو خم نہیں دیکھا۔ وہ کہتے ہیں کہ شریعت کا ہر حال میں احترام ضروری ہے۔ شریعت کی حدیں توڑ کر تصوّف بولی کرنا زندیقت ہے، یہ بہت بڑی سعادت ہے جو جناب مزاج کے حصّہ میں آئی ہے۔

حضرت مزاج نے نامور اہل علم اور مشاہیر روزگار کی آنکھیں دیکھی ہیں، وہ کہا کرتے ہیں کہ بچپن میں سر سید د خان نے ان کے طمانچے[1] لگائے ہیں، حیدرآباد میں فصیح الملک حضرت داغ دہلوی سے شرف تلمذ حاصل کرنے کے ادان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔ مولانا حالی سے بھی وہ ملے ہیں اور علامہ شبلی نعمانی کی زبان سے ترنم کے ساتھ تو نظمیں سنی ہیں نواب محسن الملک اور جسٹس محمود کو انہوں نے بہت قریب سے دیکھا ہے سر سید کے نامور پوتے سر راس مسعود مرحوم ب مسعود جنگ بہادر) ان کے گہرے دوست تھے بہت سے دوسرے اہل علم کی صحبتوں سے بھی مزاج نے استفادہ ا ہے۔

شاعر اور خاص کر غزل گو شاعر کی طبیعت کو حسن و محبت سے فطری لگاؤ ہوتا ہے۔ یہ بات نہ ہو تو شعر میں

---

[1] طمانچے نہیں، آہستہ سے کان پکڑ کر بنظر شفقت ہلکی سی ایک چپت لگائی تھی۔ ماہر صاحب کو سہو ہوا ہے۔۔ نثار یار جنگ

تاثیر کہاں سے آئے دل پہ چوٹ لگتی ہے تو آہ نکلتی ہے اور یہی آہ شعر کے قالب میں ڈھل کر کبھی سحر حلال اور کبھی قیامت بن جاتی ہے، پری جمالوں کے ناز و انداز سے شاعر بہت زیادہ متاثر ہوتا ہے سعدی اور حافظ جیسے صوفی شعرا بھی مشتاق نگاہوں کے اس ذوق نظارہ کی روک تھام نہ کرسکے۔

حضرت مزاج خوش خوراک، خوش پوشاک، خوش مزاج اور خوش نظر واقع ہوئے ہیں صائبؔ کا یہ شعر ان کی زندگی کا ترجمان ہے۔ کس زبانِ چشم خوباں را نمی داند چو من۔ روزگارے ایں غزالاں را شبانی کردہ ام

جو شخص اس انداز کا شعر کہہ سکتا ہے۔

تم نے دیکھی آج ان کی فتنہ آہنگی مزاج۔ چھیڑ خود پیدا کریں اور خود ہی پھر شکوہ کریں

اور یہ بھی۔ اب بھی اس ظالم کو اقرارِ وفا سے ہے دریغ۔ مدتوں جس کی نہیں ہم نے سنی ہاں کے لئے

اسکی زندگی "رومان" سے خالی نہیں ہو سکتی، شباب میں کون ان ٹھوکروں سے بچتا ہے۔ اور پھر شاعر کا شباب تو اور طوفانی ہوتا ہے۔ حضرت مزاج کی شاعری میں حسن و محبت بہ انداز معاملت و حقیقت نظر آتے ہیں آہیں بھی ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے شاعر دل کی چوٹوں کو شعروں میں ڈھال رہا ہے۔

خوبصورت عاشق [illegible] جدا ہو گیا [illegible] خود بھی اس کی طرف مائل ہے، ناز و نیاز کی یہی کشمکش، عمل، اور ردِ عمل زندگی میں ایک عجیب کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔! حضرت مزاج کی شاعری میں بھی یہ پر لطف کشمکش مصرعوں کی چلمنوں سے جھانکتی نظر آتی ہے!۔

عاشق مزاج شاعر جوانی کے دور سے گزرنے کے بعد بھی عشق و محبت کا دم بھرتا ہے، اس کی آنکھیں پری وشوں اور حسینوں کے نظارۂ جمال کی تلاش میں رہتی ہیں اور اس کے دل سے لذتِ عشق کے بغیر رہا ہی نہیں جاتا۔!

ہاتف اصفہانی خوب بوڑھا ہونے کے بعد کہتا ہے، بلکہ تمنا کرتا ہے۔

گرچہ پیرم تو شبے تنگ در آغوشم گیر تا سحر گہ ز کنارِ تو جواں برخیزم

مزاج کی شاعری میں بھی آخر تک یہی ولولہ، جوش، اور چٹخارہ پایا جاتا ہے اسی چیز نے جذبات کی طوفانی منزل سے گزرنے کے بعد بھی ان کے کلام کو بے سوز اور بے کیف نہیں ہونے دیا، ان کی زندگی اور شاعری میں عشق و محبت کا ایسا تسلسل پایا جاتا ہے جو خلا سے نا آشنا ہے۔

گزارش۔ اس "تعارف" کو ممکن ہے کہ بعض ناقدین "صحیفۂ مناقب" سمجھیں، مگر میرا ضمیر گواہ ہے کہ میں نے افراط و تفریط سے حتی المقدور دامن بچانے کی کوشش کی ہے، جذبات کو روک روک کر اظہار واقعات میں مبالغہ کا رنگ پیدا نہیں ہونے دیا، میں نے حضرت مزاج کی زندگی کی عکاسی اور تصویر کشی میں ان کا خیال رکھا ہے اور جہاں تک ہو سکا ہے احتیاط برتی ہے کہ کہیں دوستانہ تعلقات تصویر کے رخ کو اصل سے زیادہ رنگین اور تابناک تو نہیں بنا رہے ہیں اور اس کوشش و احتیاط میں مجھ سے کہیں کوتاہی ہوئی ہو تو میں انسان ہوں فرشتہ نہیں ہوں، نیک نیتی کی بھول چوک قابل معافی ہوتی ہے۔

شاعر کو میں آپ کے سامنے پیش کر چکا، اب اس کے کلام کو آپ کے سامنے رکھ کر میں درمیان سے ہٹ جاتا ہوں

ماہر القادری۔ ۲۹ اگست ۱۹۴۷ء (کیسر کلاں ضلع بلند شہر)
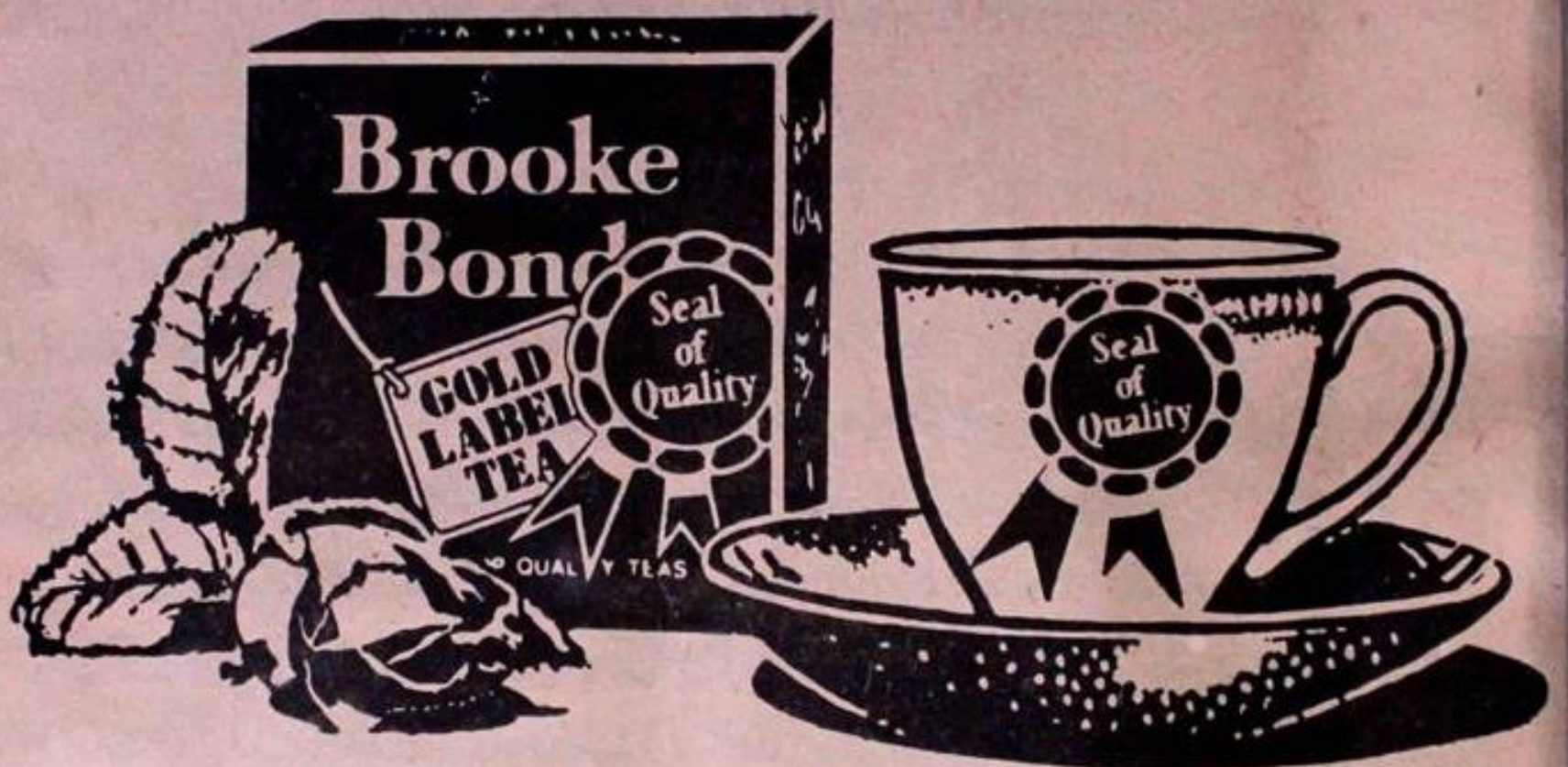
سید اوصاف علی دہلوی

مُلّا واحدی کی کہانی

بس اتنی ہی حقیقت ہے فریبِ خوابِ ہستی کی
کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے

والدین کا رکھا ہوا نام سید محمد ارتضیٰ تھا مگر دنیائے علم و ادب میں ملّا واحدی کے نام سے معروف و مشہور ہیں
مقام ولادت دلی ہے۔ ع جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب۔ نوعمری سے شوقِ انشا پردازی تھا۔ کورس کی کتب سے
زیادہ سرسید احمد خاں، محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا حالی اور علامہ شبلی نعمانی وغیرہ کی کتابیں نہایت شوق و دلچسپ
سے پڑھا کرتے تھے۔ زمانہ طالب علمی میں واحدی صاحب کے ایک ہم جماعت تھے ظہیر احمد زاہدی، ان کے چچا مشتاق
زاہدی اپنے عہد کے اچھے ادیب تھے۔ ایک دن ظہیر زاہدی سے ازراہِ مذاق کہا۔ آج سے میں "واحدی" اور تم زاہد
حسنِ اتفاق سے یہ نام اتنا راس آیا اور مقبول ہوا کہ اصل نام کو لوگ فراموش کر بیٹھے اور سب واحدی کہنے لگے۔ یہ اس
نام کی برکت تھی کہ ذاتِ واحد سے روحانی رشتہ اتنا مستحکم ہو گیا تھا کہ اختتام حیات "تشریح القرآن" پر ہوا

ع خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

فرماتے تھے جب مصورِ فطرت خواجہ حسن نظامیؒ سے سرِ عام بڑھے تو انہوں نے واحدی سرف کو پکا کر دیا۔ شاعر
حضرت اقبال کو بھی یہ عرف بہت پسند تھا اور اکثر کہتے تھے کہ اگر میرا نام اقبال شہرت نہ پا جاتا تو میں تم سے تم
سرف چھین لیتا۔ دراصل علامہ اقبال واحدی صاحب پر بہت مہربان تھے اور بڑے مفید مشورے
کرتے تھے ایک دفعہ مشورہ دیا کہ "انگریزی کا اعلیٰ لٹریچر ضرور پڑھا کیجیے"۔ ایک مرتبہ واحدی صاحب نے سوال کیا کہ "آ
جیسا لکھتے ہیں، ویسا بولتے کیوں نہیں ہیں۔؟ جواب دیا کہ "میں جس محنت سے لکھتا ہوں اگر اتنی ہی محنت سے
بولنے بھی لگوں تو دیوانہ ہو جاؤں" اقبال جیسے عظیم اور سچے فن کار تھے اور انہیں اندازہ تھا کہ خداداد صلاحیت انشا کے
ساتھ ساتھ مشق و مطالعہ اور ریاض کرنا فکر و فن کے لئے کس قدر ضروری ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں فلسفہ
گہرائی اور شاعرانہ حسن دونوں ملتے ہیں۔

ایک دفعہ حضرت علامہ دلّی میں واحدی صاحب کے ہاں مہمان ہوئے کھانا بہت لذیذ تھا شوق سے کھایا اور اتنا پسند فرمایا کہ مذاقاً کہا "واحدی صاحب! جب کھانا اتنا مزیدار ہے تو کھانے پکانے والیاں کتنی باذوق ہوتی ہوں گی۔ آپ میری کسی دلّی والی سے شادی کرا دیجیے" واحدی صاحب حضرت علامہ کو مولانا روم کی صف کا آدمی مانتے تھے۔ اور ان کی شاعرانہ عظمت کو دل سے تسلیم کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ۹ر جنوری سنہ ۱۹۶۵ء کے اپنے ایک مکتوبِ گرامی میں مجھے تحریر فرماتے ہیں۔

"عزیزم

علامہ اقبالؒ کی سب سے بڑی خوبی میرے نزدیک یہ تھی کہ انہوں نے اپنی شاعری کو اسلام کی خدمت کے لئے وقف کر دیا تھا اپنی صلاحیت اور قابلیت کا جیسا اچھا استعمال اقبال نے کیا، ویسا بہت کم شاعروں نے کیا ہے۔ دعاگو۔ واحدی"

مجھ سے اکثر فرمایا کرتے تھے، علامہ اقبال کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے! غزل میں غالب اور نظم میں اقبال کس قدر زبردست شاعر اور "اہل نظر" ہو گزرے ہیں! ان کا نام اور کام "تاریخ شعر و ادب" میں غیر فانی ہے۔
لکھنے کا شوق نوعمری سے تھا، چنانچہ اپنے ۵ر مارچ سنہ ۱۹۶۵ء کے نوازش نامے میں لکھتے ہیں۔

"عزیزم

مجھے لکھنے کا شوق اس عمر میں ہو گیا تھا، جس عمر میں تمہیں یہ شوق ہے، بلکہ اس سے بھی کم عمر میں، میرا پہلا مضمون، "سیرِ گل فروشانِ دہلی پر" وطن" میں چھپا تھا، جو لاہور کا بہت ممتاز ہفت نامہ تھا یہ سنہ ۱۹۰۳ء یا سنہ ۱۹۰۴ء کی بات ہے اس وقت میں پندرہ سولہ برس کا تھا کا دشواریاں مجھے کبھی پیش نہیں آئیں، البتہ باضابطہ تعلیم سے محروم رہ گیا۔ اس تجربے کے باعث چاہتا ہوں کہ تم تعلیم کی تکمیل کر کے ہی اس کوچے میں قدم رکھنا۔ من نکردم شما حذر بکنید۔ مجھے تو باضابطہ تعلیم کی محرومی سے بھی کچھ فائدہ پہنچا ہے تمہیں شاید نقصان پہنچے۔ کیونکہ زمانہ اور حالات بدل گئے ہیں۔ دعاگو واحدی۔"

اور یکم فروری سنہ ۱۹۶۶ء کے مکتوب میں لکھا۔ "نظام المشائخ جس وقت جاری ہوا ہے اس وقت میری عمر ۲۱ اکیس سال تھی میری پہلی کتاب کا نام "جاماسپ نامہ" ہے یہ تصنیف نہیں تھی، ترجمہ تھا" بہر حال جس وقت نظام المشائخ نکلا تھا۔ اس وقت واحدی صاحب اکیس ۲۱ برس کے تھے۔ اور مصوّرِ فطرت خواجہ حسن نظامیؒ اکتیس ۳۱ سال کے تھے گویا خواجہ صاحب جوان تھے اور واحدی صاحب نوجوان۔ کسی اسکول یا کالج میں باضابطہ تعلیم بھی نہ پائی تھی۔ بہت چھوٹے سے تھے، جب ماں باپ داغ مفارقت دے گئے! لیکن اس نوعمری اور نوآموزی کے باوجود خواجہ صاحب کے سفر مصر و شام و حجاز کے دوران اس رسالہ کو سلیقے اور شان کے ساتھ نکالا کہ سفر سے واپسی پر خواجہ صاحب نے خوش ہو کر کہا "نظام المشائخ میرے بغیر بھی چل سکتا ہے۔ اب تم جانو اور نظام المشائخ"۔ اور واحدی صاحب کو رسالے کا مدیر اعلیٰ بنا دیا اور اپنا نام صرف بحیثیت سرپرست باقی رکھا۔ یہ رسالہ دونوں کے اشتراک سے نکلا تھا دونوں نے پچھتر پچھتر ۷۵، ۷۵ روپے ملائے تھے۔ اور واحدی صاحب کی پھوپی صاحبہ کی سخت مخالفت کے بعد جاری ہوا تھا۔ فرماتے تھے کہ جب رسالہ نکالنے کی خبر پھوپی صاحبہ کو ملی تو وہ کسی طرح تیار

نہ ہوتی تھیں چونکہ حکومت کی طرف سے قانونی ولی تھیں اس وجہ سے عجیب مسئلہ پیدا ہوگیا تھا۔ ان سے کہا جاتا تھا کہ دونوں برابر کی رقم طلا رہے ہیں، مگر وہ کہتی تھیں کہ "یہ حسن نظامی! تجھے لوٹ کھائے گا اس کا پیچھا چھوڑ دے"۔ کینے والوں نے اخبار نویسوں کی آئے دن کی گرفتاریوں کی خبروں سے الگ خائف کر دیا تھا۔ بالآخر آمادگی ظاہر بھی کی تو اس شرط پر کہ تمام چیزوں، جائیداد وغیرہ سے دست بردار ہونا منظور ہے تو ٹھیک ہے، فارغ خطی لکھ دو تب ۵، روپے مل سکتے ہیں شرطیں بڑی سخت تھیں مگر مرتا کیا نہ کرتا آخر کار قبول کر لیں۔ اور اللہ کا نام لے کر "نظام المشائخ" جاری کر دیا۔ یہ ۱۹۰۹ء کی بات ہے پرچہ بڑی شان سے نکلا تھا اور خوب نکلا۔ اللہ نے ایسی برکت دی کہ رسالے کا خرچ، چلانے والوں کا خرچ اور جن کی کفالت کی جاتی تھی، ان سب کا خرچ نظام المشائخ نے برداشت کر لیا تھا۔ رسالہ جذبۂ اخلاص سے نکالا گیا تھا، نصف صدی تک اپنی بہار دکھلاتا رہا۔ اور دور ایوبی میں ڈکلیریشن منسوخ ہونے پر بند ہوگیا۔

ملاقات کا قصہ۔ فرماتے تھے کہ "ایک دفعہ خواب میں دیکھا کہ مکان کے صحن میں لیٹا ہوں اور چاند کا نظارہ کر رہا ہوں۔ چاند میں یکایک سمندر نمودار ہوا اور سمندر سے ایک غوطہ خور نکلا اور زمین پر اترتے ہوئے میرے مکان میں اتر پڑا"۔ یہ زمانہ خواجہ حسن نظامیؒ کی ابتدائی انشاء پردازی کا تھا، مگر ان کے انوکھے دل نشین انداز بیان کا اسی وقت چرچا شروع ہوگیا تھا خواب دیکھنے کے بعد ان سے ملاقات بھی ہوگئی تھی لیکن تعلقات کا آغاز ابھی نہیں ہوا تھا۔ فرماتے تھے "میں گھنٹہ گھر نیچے افسردگی کے عالم میں کھڑا تھا، اچانک خواجہ صاحب سامنے آکھڑے ہوتے ان کی مردم شناس آنکھوں نے چہرے پر تاثرات غم پڑھا اور کہا خیریت تو ہے؟ کچھ پریشان معلوم ہوتے ہو"۔ میں نے بتایا تیسری بار میٹرک میں ناکامی ہوئی ہے، مسکرا کر کہا تو کیا ہوا۔ گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں"۔ پھر پوچھا کہ "اچھا بتاؤ پاس ہو جاتے تو کیا کرتے؟" جواب دیا کہ بیرسٹری پڑھنے لندن جانے کا ارادہ تھا۔ خواجہ صاحب نے کہا "بیرسٹر مشو چیزے دیگر شو۔ آؤ میں تمہیں کامیابی اور عروج کا وہ راستہ دکھلاتا ہوں، جہاں بڑے بڑے بیرسٹروں کے نام دب جاتے ہیں اور ادیب غالب رہتے ہیں۔ اس کے بعد اپنی دلی کی قیام گاہ پر لے گئے اور کچھ ایسی دلنشین اور تسکین آمیز باتیں کیں کہ دلِ غم زدہ کو قرار آہی گیا اور وکالت سے توجہ ہٹا کر میدانِ ادب و صحافت میں لا کھڑا کیا یہیں سے واحدی صاحب کی طویل علمی و ادبی زندگی جو پون صدی پر محیط ہے؛ آغاز ہوتا ہے جس میں انہوں نے بڑے کام کئے جن کا ایک سرسری خاکہ یہ ہے۔

۱۔ نظام المشائخ — ۱۹۰۹ء میں اجرا ہوا تھا تفصیل اوپر گزر چکی ہے

۲۔ گل چیں — ایک ادبی رسالہ تھا، لیکن بہت کم عرصے نکلا۔

۳ طبیب — ہفت وار جنوری ۱۹۱۳ء میں جاری کیا تھا

۴ استانی — ماہ نامہ تھا جو اصلاحِ نسواں کے لئے جاری کیا گیا تھا۔

۵ بیداری — تھوڑے عرصہ چلا

۶ انقلاب — ہفت نامہ تھا عارف ہسوی ایڈیٹر تھے سب سے زیادہ کامیاب پرچہ تھا۔

۷ خطیب — ہفت نامہ جنوری ۱۹۱۴ء میں جاری ہوا تھا۔

۸ ادیب — نہایت شاندار، دل آویز ماہ نامہ تھا ایڈیٹرز میں ملا واحدی، فصیح الدین احمد ایم اے

اور آنسہ نجمہ تصدق ایم اے بی ٹی کا نام بھی ہوتا تھا۔ اور پرچہ کی قیمت صرف ایک روپیہ تھی کس قدر سستا وقت تھا

۹ رعیت — یہ روزنامہ تھا اس کے چیف ایڈیٹر طنیاز فتح پوری تھے۔

۱۰ فردوس — کراچی سے ۱۹۴۸ء میں جاری ہوا اور اس پر دور صحافت تمام ہو گیا۔

دلی میں جو کتابیں لکھی تھیں ان کی تفصیل یہ ہے

۱۔ جاماسپ نامہ۔ فارسی جاماسپ نامہ کا ترجمہ ہے۔

۲۔ بزم فرید۔ — حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے ملفوظات۔ راحت القلوب۔ مرتبہ حضرت سلطان نظام الدینؒ اولیا کا ترجمہ

۳ مجالس حسنہ — خواجہ حسن نظامی کے تھوڑے سے ملفوظات۔ پہلی کتاب اب نایاب ہو چکی ہے

۴ مضامینِ واحدی۔ یہ مجموعہ مضامین بہت مشہور و مقبول ہوا۔ مجموعہ مضامین کی ضخامت ۲۰×۳۰ سائز کے قریب پانچ سو صفحے تھی اور اس کی بابت مولانا عبد الماجد دریا آبادی نے لکھا تھا کہ "میں پڑھنے والا لکھنے والا بن کر رہ گیا۔ کتاب ختم کئے بغیر ہاتھ سے نہیں چھٹی۔ کاش اکبر الہ آبادی زندہ ہوتے تو وہ اس مجموعے کی داد دیتے" لیکن گھر کے سارے سامان کی طرح یہ سرمایہ علم و ادب بھی نذر انقلاب ۱۹۴۷ء ہو گیا جس کا ملا واحدی مرحوم کو بڑا ملال تھا! باقی جو کتابیں کراچی میں آکر لکھی ہیں ان کا ذکر اپنے موقع پر آئے گا۔

دوست، احباب۔ ملا واحدی ہمیشہ ناپاک ادب کی محفل سے محفوظ رہے ان کی زبان و قلم کسی کی خاطر کبھی گندی نہیں ہوئی۔ انہوں نے نہایت پاکیزہ لٹریچر پیش کیا ہے، ان کو بچپن، لڑکپن، اور جوانی عمر کے ہر حصے میں اچھے ساتھی اور دوست احباب ملے، جب نظام المشائخ کی ایڈیٹری نے نوجوانی ہی میں بوڑھوں جیسی پختہ نگاہی عطا کر دی تھی تو بڑھاپے میں بھلا خرابی کا سوال کہاں پیدا ہو سکتا ہے۔ دوست احباب میں بھی بھائی محمد ادریس، علامہ راشد الخیریؒ مولانا احمد سعید، بھیا احسان الحق مفتی کفایت اللہ خاں، بہادر حبیب الرحمٰن، قاری سرفراز حسین (مصنف "شاہد رعنا" جن کو دیکھ کر شوقِ تحریر و انشاء پیدا ہوا) فضل احمد خاں شیدا اور سردار دیوان سنگھ مفتون، سائل جیسے اہل کمال شامل تھے۔ خواجہ حسن نظامی سے تو ایسے مخلصانہ تعلقات تھے کہ عزیزوں میں کیا ہوں گے۔ وہ دوست، سرپرست، پیر و مرشد سبھی کچھ تھے۔ اور واحدی صاحب سے اتنی محبت کرتے تھے کہ مرنے سے پہلے اپنے آخری خط میں ایک فقرہ لکھا تھا "دل کے دیس میں بسنے والے پردیسی واحدی کو عید مبارک ہو"۔ حقیقت تو یہ ہے کہ خواجہ صاحب نے واحدی صاحب کا زندگی بھر شالی ساتھ دیا وہ ہر اعتبار سے واحدی صاحب کو اونچا کرنا چاہتے تھے۔ اور ان کا اتنا خیال انہیں رہتا تھا کہ جس زمانے میں مصر و شام و حجاز کے سفر پر روانہ ہوئے ہیں تو جانے سے پہلے منشی غلام نظام الدین عرف خاکسار عالم کو نگراں مقرر کر دیا کہ بعد نماز مغرب روزانہ خیریت دریافت کرتے رہنا اور ہر طرح خیال رکھنا۔ یہ خاکسار عالم وہی بزرگ ہیں جنہوں نے خواجہ صاحب کو واقعی خواجہ صاحب بنا دیا تھا۔ خواجہ صاحب ان سے اکثر مشورہ لیا کرتے تھے یہی ان کو کمانے کے گُر بھی بتاتے تھے اور علم و اخلاق کا سبق بھی دیا کرتے تھے۔ واحدی صاحب بھی ان کے احسان مانتے تھے اور ان کی تجربے کی سب باتیں دل پر نقش کر لی تھیں

سبب تھا کہ جو لوگ خواجہ حسن نظامی سے متعلق غلط باتیں منسوب کرتے ہیں انہیں وہ بدطینت کہا کرتے تھے۔ اس کو بہتان تراشی کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ کسی سے ویسی باتیں منسوب کر دی جائیں جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوں اور جن کا حقیقت سے ذرا بھی تعلق ہی نہ ہو۔ مثلاً شاہد احمد دہلوی لکھتے ہیں۔ " واحدی صاحب کی دولت اور خواجہ حسن نظامی صاحب کی عقل نے مل کر بہت بڑے بڑے کام کیے"۔ اس سلسلے میں ایک دفعہ واحدی صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ " خواجہ حسن نظامی بہت بلند کردار انسان تھے ان پر یا ان کے کاموں پر میرا ایک پیسہ بھی خرچ نہیں ہوا۔ یہ بات مشہور ضرور ہے لیکن بالکل غلط مشہور ہے"۔ واحدی صاحب پر فالج کا دوسرا بڑا حملہ جس وقت ہوا تو حکیم محمد سعید دہلوی اس وقت اپنا سارا کام چھوڑ کر آگئے اور خان بہادر حبیب الرحمٰن نے ان کے علاج معالجے پر ۳۵۰۰۰ ہزار روپیہ صرف کر دیا۔ ان سب احباب کی دوستی دراصل دوستداری اور دوست پروری کا ایک نادر نمونہ تھی۔ واحدی صاحب کے دوست واحباب سب اچھے تھے لیکن ان کو یار باشی کیلئے فرصت کہاں ملتی تھی صبح سویرے اٹھنا نماز پڑھنا چہل قدمی کرنا پھر ناشتہ کرکے شام تک کاموں میں لگے رہنا، بعد نماز مغرب کھانا کھانا۔ عشاء کی نماز ادا کی اور نو بجے سوجانا پھر اگلے دن صبح سے شام تک یہی مقررہ نیت اس چیز نے انہیں اتنا پابندِ اوقات بنادیا تھا کہ انہیں دیکھ کر گھڑی ملائی جاسکتی تھی ہر چیز کے اوقات مقرر تھے اور کیا مجال جو ان میں فرق آجائے! اپنی اولاد کی شادی بیاہ تک ان اصولوں کا خیال رکھتے تھے۔ ان آنکھوں نے خود دیکھا ہے کہ جب بھی کسی بیٹی کی شادی کی تو آٹھ ساڑھے آٹھ بجے تک جو کچھ کرنا ہوتا کرتے۔ مختصر، سادہ اور پُراثر لفظوں میں اس کی سبیل کر دیتے اور اس کے بعد کا سارا معاملہ اپنے لڑکوں اور عمر رسیدہ خواتین پر چھوڑ دیا اور سو گئے۔ وہ کہا کرتے تھے سلمان اللہ کا مزدور ہوتا ہے اسے پابندِ اوقات اور فطرت کے اصولوں پر چلنا چاہیے تاکہ حسنِ تنظیم کے ساتھ ساتھ قوت کارکردگی برقرار رہے اور اسلامی عبادات خاص کر نماز روزہ اس وصف حیات کو سب سے زیادہ حسنِ تنظیم دے کر حسن کارکردگی کی صلاحیت میں اضافہ کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ان کی طبیعت میں وہ حسن سلیقہ تھا کہ ہر چیز کی ایک خاص جگہ مقرر کر دی تھی اور نفاست پسندی کا بھی یہی عالم تھا۔ مولانا حامد جلالی نے مجھ سے کہا کہ " واحدی صاحب دلی میں ایک دفعہ بیمار ہوگئے میں اکثر مزاج پرسی کرنے جاتا تھا۔ اتفاق سے میں جب گیا، وہ دوا پی رہے ہوتے تھے۔ کیا بتاؤں طبیعت میں کتنا سلیقہ اور نفاست پسندی تھی اتنے اچھے انداز میں دوا پیتے تھے کہ ایک روز میں نے کہہ ہی دیا کہ واحدی صاحب! میں جب بھی آپ کو دوا پیتے ہوئے دیکھتا ہوں تو میرا بھی دل دوا پینے کو چاہنے لگتا ہے" یہ واقعہ واحدی صاحب کی خوش ذوقی کی دلیل ہے

جس زمانے میں دلی میں تھے اس زمانے میں خود کم لکھتے تھے۔ دوسروں سے زیادہ لکھوایا کرتے تھے خواجہ حسن نظامیؒ نے چھوٹی بڑی تقریباً پانچ سو کتابیں لکھی تھیں۔ علامہ راشد الخیری جو صبح زندگی لکھ کر گوشۂ گمنامی میں جا چھپے تھے۔ انہیں بیدار کیا اور شمشیر قلم کو سان پر رکھوا کر "شام زندگی" جیسا شاہکار ادب پیش کرا دیا۔ راشد الخیری صاحب سے کتابیں لکھا لینا بڑا کمال تھا کیونکہ ان کے لکھنے کا انداز ہی بالکل انوکھا تھا ایک جگہ جم کر نہیں لکھتے تھے دس پندرہ منٹ لکھا اور سیر کو نکل گئے مگر خدا معلوم کیا جادو کیا تھا۔ ملا واحدی صاحب نے ایک صاف ستھرے کمرے میں لکھنے کا تمام ضروری سامان قلم دوات، کاغذ وغیرہ رکھا رہتا تھا اور وہ روزانہ دو گھنٹے کے لیے اس کمرے میں خوشی سے بند ہو جاتے

ے کہ جم کر لکھیں۔ مولانا راشد الخیریؒ دو گھنٹے تک لکھنے کے بعد پسینے میں بھیگے ہوئے مسکراتے ہوئے باہر نکلتے اور
بعد فرماتے۔ دیکھنا! جو کل شکل دکھلاؤں لیکن شکل دکھلاتے تھے اور اپنا لکھا ہوا نہایت سادگی، جوش اور شگفتگی کے
ساتھ سب کو سناتے تھے "شامِ زندگی"۔ اس طرح مکمل ہوگی۔ متعدد بار شائع کی گئی اور آج تک اس کی شہرت و مقبولیت
میں فرق نہیں آیا ہے۔ شامِ زندگی کی تکمیل کے بعد مصنف کے ساتھ شاندار جشن منایا گیا جس میں پبلشر اور مخلص دوست
احباب سب نے شرکت کی تھی اسی کے بعد علامہ راشد الخیریؒ کی تصانیف کی شہرت اتنی پھیلی کہ لوگ کتابیں چھوا
کر حقِ اشاعت لینے لگے۔ واحدی صاحب کو قانونی طور پر علامہ راشد الخیریؒ کی کتابوں کے حقوقِ اشاعت حاصل
تھے جو انہوں نے مولانا رازق الخیریؒ کو منتقل کر دیئے۔ بہرحال اس وقت خواجہ حسن نظامیؒ اور راشد الخیریؒ سے
زیادہ کسی اور ادیب کی کتابیں مقبولِ عوام نہ تھیں ادھر کتاب نکلی، ادھر لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ خرید لیں۔

ملا واحدی اپنے دوست ادیبوں سے کتابیں بھی لکھواتے تھے اور رسالے جاری کر کے ادب و صحافت
کی خدمت بھی سرانجام دلاتے تھے واحدی کے اخبار "انقلاب" نے افقِ سیاست پر طلوع ہو کر جو انقلاب عظیم پیدا کیا وہ تاریخ سیاست
آزادیٔ ہند کا ایک انمٹ باب ہے واحدی صاحب کے سیاسی دوست عارف ہسوی کو انگریزوں سے تصادم
کا بہت شوق بلکہ ارمان تھا۔ واحدی صاحب نے انہیں ایڈیٹر انقلاب بنا کر یہ ارمان بھی پورا کر دیا۔ عارف صاحب
نے بھی پھر خوب خوب جوہر انشا پردازی دکھلائے اور انگریزی زبان کے چھکے چھڑا دیئے۔

واحدی صاحب اکثر فرماتے تھے کہ "میں ایک پیدائشی ایڈیٹر ہوں" اور دوسروں کا لکھا ہوا ایک ایک لفظ پڑھنا
ایڈیٹر کا فرض ہے۔ اظہارِ رائے خود بھی احتیاط اور سچائی کے ساتھ کیا کرتے تھے اور دوسروں کے مضامین کو بھی حسنِ تنظیم اور سلیقے
سے مرتب کرتے تھے نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی
جوہر شناسی، لیاقت و صلاحیت کی پہچان یہ سب اوصاف ایسے تھے کہ عارف ہسوی جیسے کامیاب ایڈیٹر دنیائے صحافت
کو ملا واحدی ہی کی بدولت نصیب ہو سکے اس لحاظ سے ملا صاحب ایڈیٹر ہی تھے۔ خطوں کا جواب وہ پابندی سے دیا کرتے تھے لیکن
اختصار کے ساتھ مضامین کی طرح بسا اوقات خطوں میں بھی ادبی گل کاریاں اور علمی گہرائیاں ہوتی تھیں ان کی عبارت
میں بڑی شگفتگی و تازگی، سادگی و خلوص جلوہ گر ہیں۔

محفلِ ملا واحدی: یہاں کراچی میں بعد نمازِ جمعہ پابندی کے ساتھ ایک علمی و ادبی محفل جما کرتی تھی اس محفل
میں ذہنی و کردار کی اصلاح، تربیتِ علمی اور وسعتِ نظر کی دولت تقسیم ہوتی تھی لطف آمیز گفتگو خیال کو رعنائی عطا کرتی ہیں ملا واحدی
اپنے دامن میں دلی کی اک صدی کی قدیم مگر ستھری تہذیب، اجلی معاشرت اور تاریخ ساز عہد کو سمیٹے ہوئے تھے۔ اور اس
تاریخ کو کچھ ایسے انداز سے دہراتے تھے کہ تصویر کھینچ کر رکھ دیتے تھے۔ اور بیان ایسا پر لطف کہ وہ کہیں اور سنا
کرے کوئی۔

بعد نماز جمعہ اس محفل میں باقاعدگی کے ساتھ شریک ہونے والوں میں جلیل قدوائی، لطیف الرحمن صدیقی
عبدالرحیم نظامی، سید امجد علی، اور راقم الحروف اب کبھی کبھی اخلاص حسین زبیری، سید عالم شاہ ایوب
قادری اور ہم نشینِ خواجہ حسن نظامیؒ جناب ایم اے نعیم بھی تشریف لے آتے تھے۔ اور خواجہ شہاب الدین اور

ماہرالقادری کو بھی کبھی کبھی اس محفل میں ، میں نے دیکھا ہے۔

اس محفل کی نمایاں خصوصیات یہ تھی کہ کسی کی برائی (غیبت) نہیں ہوتی تھی نہ کسی شخص کو برائی کرنے کی ہمت ہوسکتی تھی اخلاق حسنہ بزرگوں کے قصّے، حکایات، حالات اتنے شوق و لطف سے واحدی صاحب بیان کرتے تھے کہ بُلبل ہزار داستان معلوم ہوتے تھے۔ گفتگو پراثر شُستہ و شائستہ، تکلف سے عاری، تصنع سے خالی آورد سے علیحدہ اور مبالغہ سے پاک ہوتی تھی۔ نفاق و اختلاف کی باتوں سے ہمیشہ پرہیز کیا کرتے تھے وہ تنقید کے نہیں تمدن کے آدمی تھے تخریب کے نہیں تعمیر کے انسان تھے پابندِ وضع، اپنے عہد کے خاتم، جوہر شرافت کا نمونہ کمال و فن کا تاریخی و تہذیبی شاہکار، مگر ایک یادگار ورق۔

محفلِ ملا واحدیؒ میں کسی نہ کسی انداز میں خواجہ حسن نظامیؒ کا ذکرِ خیر آہی جاتا تھا۔ اور بیانِ مولانا ایوب دہلوی بھی! ان کی گفتگو میں دین اور دلی کی تہذیب یہ خاص موضوعات تھے۔ اللہ رسولؐ کے ذکرِ خیر، آخرت کی بازپرس سے توان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ اس لیئے ان کے پاس بیٹھ کر اللہ یاد آتا تھا وہ واقعی اپنے وقت کے تھے۔ اگرچہ ان کا دل و دماغ اسلامی اندازِ فکر، مشرقی تمدن و ادب اور فکر و فلسفہ سے متاثر تھا لیکن دین میں بصیرت متفکرِ قرآن مولانا ایوب دہلوی کی پاکیزہ صحبتوں سے پیدا ہوگئی تھی اور ادبی خدمات خواجہ حسن نظامیؒ کی پچاس سالہ ہم نشینی اور فیض صحبت کا فطری نتیجہ تھی۔ واحدی صاحب کے علمی و ادبی، دینی و اخلاقی اور ذہنی ارتقا میں ان دونوں باکمال بزرگوں کا بڑا حصہ ہے جس کو حضرت ملا واحدی بالکل تسلیم کرتے تھے۔ خواجہ حسن نظامیؒ کے انتقال پر ملال کا واحدی صاحب نے اپنے دل پر گہرا اثر لیا تھا وہ محسن فراموش نہ تھے ان کے احسان اور جذبۂ الفت کو یاد کیا کرتے تھے اور کبھی کبھی ان کی محبّت میں ان کی آنکھیں پرنم ہوجایا کرتی تھیں اس بات سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ ان کے نزدیک محبت کا مفہوم یہ تھا کہ انسان کو زندگی میں ہی نہیں مرنے کے بعد بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ چنانچہ اپنے کمرے میں خواجہ صاحب کی ایک دل آویز، بزرگانہ شان کی حامل روشن تصویر دیوار پر آویزاں کر رکھی تھی۔ اسی طرح مولانا ایوب دہلویؒ سے بھی انتہائی محبت و عقیدت تھی وہ کسی بات پر خفا ہوگئے تو واحدی صاحب بہت پریشان ہوئے اور راقم الحروف کو ۱۸ر جولائی ۱۹۶۵ء کو ایک خط میں یہ تحریر فرمایا۔

”عزیزم

مولانا ایوب کے موجودہ بُرے برتاؤ سے میں اتنا متاثر نہیں ہوں کہ ان کی خوبیوں کو بھول جاؤں مجھے برائیاں نظرانداز کردینی چاہیں اور صرف خوبیاں یاد رکھنی چاہیں — ملوں گا البتہ اس طرح جس طرح میں دلی میں ملتا تھا۔ دلی میں مولانا میرے ہاں آتے تھے، میں بغیر بلائے اُن کے ہاں نہیں جاتا جاتا تھا بہرحال یہ الگ چیز ہے، مولانا کی شخصیت سے اس کا مطلق تعلق نہیں ہے۔ مولانا کا آنا ایک نعمت تھا، اور میرا جانا نہ جانا معمولی بات ہے۔ میری آج بھی تمنا ہے کہ اپنے جنازے کی نماز مولانا سے پڑھواؤں۔ دعاگو۔ واحدی

پھر جب واحدی صاحب پر فالج کا دوسرا بڑا حملہ ہوا تو مولانا ایوب صاحب خود تشریف لے آئے،

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انہیں دنیا جہان کی خوشی مل گئی ہو ایک دفعہ فرمانے لگے "مولانا ایوب تشریف لائے تھے چلتے وقت میں نے ان سے کہا۔ دعا کیجیے اللہ مجھ سے راضی ہو جائے! لیکن مولانا کہنے لگے تمہیں کچھ معلوم بھی ہے اللہ جس سے راضی ہو جاتا ہے اس پر آرے بھی چلوا دیتا ہے۔ ہمیں فقط اللہ کی رحمت کا طلب گار رہنا چاہیے"
بہر حال خدا کا شکر ہے کہ مولانا ایوب صاحب نے حسب سابق آنا جانا شروع کر دیا۔ پھر ایک دن اچانک خبر ملی کہ مولانا ایوب دہلوی رحلت فرما گئے۔ شمع علم و حکمت دین و دانش، فکر و عرفان کا آفتاب ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔

یہ خبر واحدی پر بجلی بن کر گری، ۱۸ دسمبر ۱۹۶۹ء کو مجھ کو ایک خط میں لکھا
"عزیزم

میں تمہارے دادا کا قومی خدمت کے میدان میں قدم رکھنا انشاء اللہ کبھی لکھ دوں گا۔
شعر کا مطلب جلیل قدوائی صاحب سے جمعہ کو کچھ لینا میرا وقت مولانا محمد ایوب کے مضمون پر صرف ہو رہا ہے دو دن گزر چکے ہیں۔ دن کا سونا بھی بند کر رکھا ہے کسی اور طرف فی الحال دھیان نہیں جا سکتا۔ دعا گو۔ واحدی"

اگرچہ مولانا محمد ایوب واحدی صاحب سے دس سال چھوٹے تھے، لیکن علم و فضل کے اعتبار سے وہ انہیں اپنا استاد مانتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ اگر انشاء پرداز ہوتے تو اپنے دور کے امام غزالی یا امام رازی کہلاتے ان کا احسان یہ تھا کہ غور و فکر کی صلاحیت کو چمکایا اور تحریروں میں قوتِ فکر و نظر کی روح بھر دی۔
افسوس کہ ملا واحدی کی یہ پر بہار محفل بھی جلدی درہم برہم ہو گئی۔ آج بھی اس تصور سے میری روح میں تازگی آجاتی ہے کہ دلی کی اس آخری شمع کو اپنے بزرگ نانا کی شکل میں دیکھا اور ادب و انشاء کے اس گلزار بے خزاں سے خوشہ چینی کی آج جب یہ تاثرات قلمبند کر رہا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے شاید کوئی سہانہ خواب دیکھا تھا

ع خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔

ملا واحدی اپنی ذات و صفات کے اعتبار سے ایک انجمن، شرفائے دلی کا ایک مکمل نمونہ اور واقعی دلی کی آخری شمع تھے اور دلی کی ان بے مثل و بے نظیر ہستیوں میں سے تھے جن پر دلی اور اہل دلی کو ناز تھا اور رہے گا۔ وہ ۱۷ مئی ۱۸۸۸ء کو دلی میں ۔ رمضان المبارک جمعہ کے دن صبح صادق کے وقت پیدا ہوئے: بچپن کا زمانہ دلی سے باہر والد ماجد سید محمد مصطفیٰ کے ساتھ یوپی کے جنگلوں میں کٹا والدہ کا نام منظوری بیگم تھا خوشحال گھرانہ: خوشحال تھا اولاد نرینہ ملنے سے گھر میں غیر معمولی خوشیاں منائی گئیں۔ انہوں نے نوے سال عمر پائی۔ ۲۲ اگست ۱۹۷۶ء کو کراچی میں وفات پائی تین شادیاں

۱۔ میرے دادا کا اسم گرامی سید زین العابدین تھا انہیں قومی خدمت کا بہت شوق تھا ممتاز ماہر قانون سر شاہ محمد سلیمان کو اپنے ہاں بلوا کر قومی و سیاسی مسائل پر مشاہیر کی تقاریر کا سلسلہ شروع کرایا تھا زمانے تھے کہ یہ پہلا جلسہ بہت کامیاب رہا تھا۔ اوصاف علی۔

کیں اور اپنے پیچھے بہت سی لیکن نیک اولاد چھوڑی۔ لکھنے پڑھنے کا شوق پندرہ برس کی عمر سے ہوا اور آج تک رہا۔ اس اعتبار سے واحدی صاحب کی علمی و دینی، اخلاقی اور ادبی خدمات اور کارنامے تقریباً پون صدی پر محیط ہیں۔ اور یہی ان کی ادبی شخصیت کو ناقابلِ فراموش بناتے ہیں۔

واحدی صاحب کے خاندان کا سید ہونا مستند اور مسلّم سہی لیکن اپنے کردار و عمل کی پاکیزگی اور قول و فعل کی یکسانیت سے ثابت کیا کہ "معیارِ سید" حسنِ فکر و عمل سے عبارت ہے ان کی طبیعت میں شرافت و نیکی، گفتگو میں خلوص کی خوشبو اور کشش تھی جو ایک بار مل لیتا وہ بار بار ملنے کی تمنا کرتا تھا۔ وہ کم گو تھے مگر جو کچھ کہتے تھے لطفِ بیان اور معنی آفرینی سے خالی نہ ہوتا تھا یہی وصف ان کی تحریروں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ جو کچھ لکھا ہے وہ باون تولے پاؤ رتی ہے گویا لکھنے اور بولنے انہیں خاص سلیقہ حاصل تھا۔

ان کی تحریریں زندگی کے شعور سے بھرپور اور ادبیاتِ عالیہ کا اچھا نمونہ ہیں، اور ایک طرزِ خاص ان میں نظر آتا ہے۔ یہ تحریریں علم و عرفان، دین و اخلاق حکمت و دانش، محبت و شرافت، تہذیب و شائستگی کا سرمایہ ہیں ان میں ایک بہتر راہِ عمل کی ترغیب و تلقین ملتی ہے کیونکہ یہ ایک ایسی ہستی کے قلم سے نکلی ہیں جو اسلامی اخوت، پیکر اخلاص و اخلاق، شرافتِ نفس، مومنانہ عزیمت اور خندہ پیشانی سے پیش آنے والا انسان، ادیب بے مثال، منکسر، باکمال تھا جس کی ادبی شخصیت، شفقت، توجہ اور رزم گفتاری کا آئینہ دار تھی۔

مدت ہوئی حکیم عبدالسلام نظامی نے ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان تھا" فرعون کی خدائی اور جوش کی بڑائی" اس میں جوش کی شخصیت اور واحدی کے کمالات پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ یہ پہلے منادی میں شائع ہوا تھا پھر متعدد ممتاز پرچوں نے اس کو نقل کیا تھا واحدی صاحب کے رنگِ طبیعت، سیرت و کردار کو سمجھنے میں اس تحریر سے بڑی مدد ملتی ہے یہ مضمون واحدی صاحب کی نظر سے بھی گزرا تھا اور اس کے متعلق ایک خط ان کا "منادی" میں شائع ہوا تھا میرا خیال ہے مضمون اور خط دونوں چیزیں ایسی ہیں جو واحدی صاحب کے کردار و مزاج کو سمجھنے میں آئندہ مورخین و محققین کی معاونت کر سکتی ہیں۔ اس لیے دونوں نقل کی جاتی ہیں۔

" میں مہینے میں دو چار دفعہ حضرت محبوبِ الٰہیؒ کی آستان بوسی کے لیے حاضر ہوا کرتا ہوں اور ہر حاضری کے وقت اپنے مرشدوں کے بھی نیاز حاصل کرتا ہوں حال میں حسب معمول ان کے دفتر میں گیا تو مشہور ادبی رسالہ "ساقی" کا جوش نمبر رکھا نظر آیا۔ اور سرسری ورق گردانی کرتے ہوئے جوش صاحب کی یہ رباعی نظر پڑی۔

نقلِ کفر کفر نہ باشد

لیتا ہے جو انتقام کھوٹا ہے خدا — جس میں سونا شامل نہیں وہ گوٹا ہے خدا

شبیر حسن خان نہیں لیتے بدلہ — شبیر حسن خان سے بھی چھوٹا ہے خدا

یہ رباعی دیکھ کر مجھے وہ زمانہ یاد آگیا جب جوش صاحب دلی میں نئے نئے آکر مقیم ہوئے تھے اور دریا گنج کی ایک کوٹھی میں دفتر قائم کرکے انہوں نے رسالہ "کلیم" جاری کیا تھا۔ کوٹھی، دفتر، رسالہ غرض یہ کہ سب ہی چیزیں شاندار

نعیں اور کم از کم اردو کے دوسرے شاعروں اور ادیبوں کی نسبت جوش صاحب ٹھاٹھ کی زندگی بسر کر رہے تھے۔۔
دریا گنج سے قریب ہی محلہ کوچہ چیلان ہے جہاں ملاّ واحدی صاحب رہتے وہاں "نظام المشائخ" کا دفتر تھا واحدی صاحب کے
ایسے ٹھاٹھ تو نہ تھے لیکن ان کے وقار اور اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ادبی اور علمی شہرت سے قطع نظر
دلی شہر میں میونسپل الیکشن کے وقت کانگریس ان کے مقابلے میں اپنا امیدوار کھڑا نہ کرتی تھی اور حضرت خواجہ حسن نظامی
مولانا ابو الکلام آزاد، حکیم اجمل خان، آصف علی صاحب، حضرت مفتی کفایت اللہ، ڈاکٹر انصاری علی برادران ،
سحبان الہند مولانا احمد سعید، مولانا عارف ہسوی وغیرہ جیسے مشاہیر کی ان کے ہاں آمد جاری رہتی تھی اور ان حضرات
کے اور واحدی صاحب کے بڑے مخلصانہ اور قریبی تعلقات تھے اور واحدی صاحب صرف اس شرط سے الیکشن
لڑنا منظور کرتے تھے کہ نہ تو وہ کسی کے پاس ووٹ مانگنے جائیں گے اور نہ کوئی تقریر کریں گے۔

قصہ مختصر واحدی صاحب میونسپل کمشنر تھے اور ان کا دورِ میونسپل کمیٹی دلّی کے لئے ایک مثالی دور تھا۔ ایک
روز دوسرے ممبران اور عہدیداروں کے ساتھ وہ اپنے ہاں ایک اہم مشاورتی میٹنگ میں مصروف تھے کہ حضرت جوش
ان سے ملنے تشریف لائے۔ دو آدمی ان کے ساتھ اور تھے جو وضع قطع اور لباس سے لکھنوی معلوم ہوتے تھے گرمی
کا زمانہ تیسرے پہر کا وقت، میں واحدی صاحب کے ہاں کام کرتا تھا بڑھ کر جوش صاحب اور ان کے ہمراہیوں
کا میں نے استقبال کیا اور شربت روح خانہ ساز (جو میں اپنے خاص نسخہ سے واحدی صاحب اور خاں بہادر حبیب الرحمٰن
صاحب کے لئے بنایا کرتا تھا) ان ہر سہ حضرات کی خدمت میں پیش کیا اور بتایا کہ واحدی صاحب ایک ضروری میٹنگ
میں ہیں آپ کو ذرا انتظار کرنا پڑے گا۔

جوش صاحب نے اصرار کیا کہ ان کی آمد کی اطلاع میٹنگ ہی میں دے دی جائے۔ میں نے ان کے ارشاد کی تعمیل کی
لیکن واحدی صاحب نے بھی نہایت اخلاق سے وہی جواب دیا تھا کہ ذرا توقف فرمایئے۔ جوش صاحب اتنی بات کو برداشت
نہ کر سکے اور نہایت غصے حالت میں اپنے احباب کے ساتھ ساتھ اٹھ کر چلے گئے۔ میں نے یہ اندازہ لگایا کہ ان کے ساتھی
غالباً بڑے آدمی تھے، ایک کے متعلق تو میرا شبہ تھا کہ ان کے ساتھ مہاراجہ جہانگیر آباد ہیں۔ بہر حال وہ جو کوئی ہوں جوش
صاحب نے ان کے سامنے اپنی سبکی سمجھی کہ واحدی صاحب اطلاع ملتے ہی سارے کام چھوڑ کر باہر کیوں نہ گئے۔
جوش صاحب کے جانے کے تقریباً گھنٹہ بھر بعد ان کا نستعلیق چپراسی سائیکل پر آیا اور ایک لفافہ مجھے دے
کر چلا گیا۔ لفافہ پر پتہ اس طرح لکھا تھا۔ "ملاّ واحدی رحمتہ اللہ علیہ"
یہ پتہ دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ جوش صاحب نے بڑے جوش میں خط لکھا ہے خط واحدی صاحب کو پہنچا یا گیا
اور انہوں اس پر نظر ڈالتے ہی کہا۔ "حکیم صاحب! جوش صاحب خفا ہو گئے۔" میں نے جواباً کہا جی ہاں۔
واحدی صاحب نے خط کھول کر پڑھا اور پھر اس خط کی پشت پر جواب لکھنے بیٹھ گئے اور جواب لکھ کر
کہا کہ اس کو پڑھ لیجئے اور ذرا جوش صاحب کو خود دے آیئے۔ ریاض الدین (واحدی صاحب کا چپراسی)
کے بس کا یہ کام نہیں ہے میں نے بہت اچھا کہہ کر خط پڑھا۔ جوش صاحب کے خط کی عبارت یہ تھی۔

ملا واحدی! یہ مانا کہ تم حکومت کے لاڈلے ہو۔ یہ بھی تسلیم کہ تم خواجہ حسن نظامی کے صحابی ہو اور یہ بھی درست ہے کہ تم مرحوم دلی کے سٹی فادر ہو مگر میں بھی وہ گدائے منکسر ہوں جو تختِ سلطانی کو ٹھکرا کر مسکراتا ہے۔ یہ فیصلہ آنے والی نسلیں کریں گی کہ تم بڑے ہو یا میں۔ جوش

واحدی صاحب نے اس خط کی پشت پر جو عبارت لکھی تھی وہ اس طرح تھی۔

"مخدوم و محترم حضرت جوش صاحب السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ،

آپ آج بھی بڑے آدمی ہیں اور کل بھی بڑے آدمی ہوں گے جو فیصلہ آنے والی نسلیں کریں گی وہ آج کے فیصلے سے کچھ مختلف نہ ہوگا یہ درست ہے کہ میں خواجہ صاحب کا مداح ہوں مگر الحمدللہ حکومت پرستی میرا شیوہ کبھی نہیں رہا سٹی فادر آپ حضرات کی عنایتوں سے ہوں۔ امید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا تشریف لا کر ممنون فرمایئے۔ خیر طلب۔ واحدی"

پھر ملا واحدی کے آگے جہاں "رحمۃ اللہ علیہ" لکھا تھا اس کو حلقے میں لے کر اور تیر کا نشان بنا کر یہ عبارت لکھ دی۔ "خدا کرے یہ شاعری نہ ہو حقیقت ہو۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں۔ "جب میں خط لے کر چلنے لگا تو واحدی صاحب نے پھر کہا اگر آپ چاہیں تو اس خط کی قیمت بھی وصول کر سکتے ہیں۔ میں نے پوچھا وہ کس طرح؟ کہا جب جوش صاحب یہ خط پڑھ لیں تو اسے واپس مانگ لیجئے گا اور اپنے پاس رکھیئے یہی اس کی قیمت ہے۔

تھوڑی دیر میں جوش صاحب کے ہاں پہنچ گیا اور خط ان کو دیا۔ جوش صاحب اس کو پڑھ کر مسکرائے اور ایسا معلوم ہوا کہ سارا غصہ یک لخت کافور ہو گیا میں نے خط واپس مانگا جوش صاحب نے پوچھا کیا کرو گے! تمہیں چاہیے یا واحدی صاحب کو۔" میں نے عرض کیا "مجھے! میں اس کی قیمت وصول کرنی چاہتا ہوں، مگر جوش صاحب نے یہ کہتے ہوئے خط اپنی جیب میں رکھ لیا کہ اس کی قیمت تم سے زیادہ میں جانتا ہوں۔"!

حضرت ملا واحدی اس مضمون کو پڑھ کر مورخہ ۱۱ دسمبر ۱۹۶۷ء کو "مدیر منادی" خواجہ حسن ثانی نظامی کو رقم طراز ہیں۔

عزیزم! سلام علیکم۔

"ساقی کا جوش نمبر" جس زمانے میں چھپنے والا تھا۔ شاہد صاحب "مدیر ساقی" نے میرے داماد نفیس رام پوری سے بھی اس کے لیے مضمون مانگا تھا جوش صاحب کا جو واقعہ حکیم عبدالسلام صاحب نے آپ کے "منادی" میں لکھا ہے اس کا کسی طرح نفیس صاحب کو بھی علم ہو گیا وہ اسے اپنے مضمون میں شامل کرنا چاہتے تھے مگر انہوں نے میری طبیعت کا خیال کر کے ارادہ ترک کر دیا اور مجھ سے ذکر کیا۔ میں نے کہا آپ کا فیصلہ بالکل صحیح ہے لیکن اللہ کو اس واقعہ کا ریکارڈ کرانا منظور تھا۔

جوش صاحب کے متعلق میری رائے ہے کہ برے آدمی ہرگز نہیں ہیں۔ کسی کے گھر جا کر انتظار نہ کرنے اور

انتظار کا برا ماننے سے آدمی برا نہیں ہو جاتا۔ حکیم عبد السلام صاحب کے بیان میں ایک فقرہ ہے "اپنے خط کا جواب پڑھ کر جوش صاحب مسکرائے اور ایسا معلوم ہوا کہ سارا غصہ جاتا رہا" بس اس سے ان کے متعلق ہر شخص رائے قائم کر سکتا ہے۔

جوش صاحب کو غصہ واقعی جلدی آتا ہے لیکن جاتا بھی جلدی ہی ہے دل میں کپٹ نہیں رکھتے ہیں میری ان کی کراچی میں بھی دو تین ملاقاتیں ہوئیں ہیں۔ ایک دفعہ میرے ہاں تشریف لا چکے ہیں اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میرے پاس بیٹھ چکے ہیں میں نے انہیں ایسے متنفل خفا نہ دلی میں پایا تھا اور نہ یہاں پایا جس بات پر مجھ سے بگڑ گئے تھے، اس پر تو وہ پنڈت نہرو اور ابو الکلام سے بھی بگڑ جاتے تھے مولانا ابو الکلام نے ملنے میں دیر لگائی تو یہ شعر تصنیف کر کے انہیں بھیج دیا اور اٹھ کر چل دیئے۔

کیا ضروری ہے خون کھولانا   پھر کسی اور روز مولانا

تو میں کیا چیز ہوں۔ جوش صاف صف اول کے شاعر ہیں۔ بعض بعض شعر البتہ ناگوار ہونے والا قلم سے نکل جاتا ہے اللہ معاف فرمائے۔ اور ہم سب کو اپنا بنائے۔ دعاگو واحدی"۔

مندرجہ بالا مضمون اور خط ۔ دونوں کے بغور مطالعہ سے واحدی صاحب کے اندازِ فکر و نظر، رنگِ طبیعت وسعتِ نظر، انکساری اور حسن اخلاق کے علاوہ مزاج کی شگفتگی و شادابی کا پتہ چلتا ہے بے شک واحدی انسان تھے اور دنیا کا کوئی انسان بھی محض خوبیوں کا مجموعہ نہیں ہوا کرتا خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیاں اور کمزوریاں بھی ہر شخص میں ہوتی ہیں مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ملا واحدی خامیوں سے زیادہ خوبیوں کے مرقع تھے۔ اور لوگوں کی خطاؤں کو معاف کرنا اور برے آدمی میں بھی خوبی تلاش کر لینا ان کی سیرت اور کردار کا نمایاں وصف تھا۔ ان کی طبیعت میں بڑی شرافت اور کردار میں عظمت تھی پھر وضع داری کا یہ حال تھا کہ جو رشتۂ الفت ایک مرتبہ قائم ہو جاتا تھا وہ پتھر کی لکیر کی طرح ان مٹ نقوش کی حیثیت اختیار کر جاتا تھا اس رشتۂ محبت میں اتنی طاقت ہوتی تھی کہ پھر وہ کسی مرحلے پر بھی ٹوٹ نہ سکتا تھا۔ تعلقات کی بنیاد جس سے پڑ جاتی تھی وہ بڑی مستحکم ہوتی تھی کیونکہ اس کے وجود میں اخلاص و محبت کی سچی روح کارفرما ہوتی تھی۔ وہ کسی کی خاطر مراسم خراب کرنے والے آدمی نہ تھے اور اختلاف رائے نہایت دل سوزی خلوص اور دائرہ تہذیب و اخلاق میں رہ کر کیا کرتے تھے۔ خواجہ حسن نظامیؒ سے انہیں بے حد عقیدت و محبت تھی۔ مگر کئی جگہ ان سے بھی اختلاف کیا ہے، لیکن دائرہ اخلاق میں رہ کر۔ یہ وہ پیارا اصول ہے جس سے انسانی دوستی میں بھی اضافہ ہوتا ہے، کمی نہیں ہوا کرتی۔ بہر حال دوست کی محبت مرنے کے بعد بھی ختم نہ ہوتی تھی بلکہ اس کی یاد دل کے دیس میں بس جایا کرتی تھی، ان کی دوستی امیری غریبی کے چکروں سے آزاد مخلصانہ مراسم پر استوار رہتی تھی انہیں ہر اچھی شے سے محبت تھی ان کا جمالیاتی مذاق نہایت اعلیٰ اور پاکیزہ تھا ان کا مطالعہ شعر و ادب بہت وسیع اور قوتِ حافظہ لاجواب تھی اپنی اکثر تحریروں میں۔ خاص کر خود نوشت سوانح عمری "میرا افسانہ" میں دوسروں کا تذکرہ زیادہ کیا ہے اور اپنا کم۔ چنانچہ جس زمانے میں اپنی خود نوشت لکھ رہے تھے ان پر عجیب کیفیت طاری رہتی تھی وہ اپنے ہر مخلص کے لئے دعائیں اور ذکر خیر کرنا چاہتے تھے۔ بڑی خوبی یہ تھی کہ شروع سے آخر تک دوستانہ مراسم یکساں

رکھتے اور ان میں فرق آنے لگتا تو ان کی طبیعت بے چین سی ہو جاتی تھی۔ اس معاملے میں دیکھئے خواجہ فضل احمد شیدا کے نام اپنے قیام دلّی کے عہد میں لکھتے ہیں

برادرم۔ السلام علیکم

"آج ہماری آپ کی ناگوار گفتگو پر آٹھ دن گزر چکے ہیں۔ مسلمان کے لئے تین دن سے زیادہ ایسے حال میں رہنا ممنوع قرار دیا گیا۔ ہے لیکن میرا دل روز اول ہی سے صاف تھا اور میں نے یہ انتظار صرف بعض دوستوں کا عمل دیکھنے کی خاطر کیا تھا۔ اب وہ انتظار ختم کرتا ہوں۔

مجھے آپ کی غلطی دغلط فہمی سے قطع نظر کرکے اپنے عدم تحمل کو مان لینے میں عذر نہیں ہے آپ کو جو تکلیف پہنچی اسے براہ کرم معاف فرمایئے اور حسبِ دستور آمد و رفت جاری کیجیے"۔

خیر طلب واحدی۔ کوچہ چیلان۔ ۴۰ء

یہ خط جو میں نے اوپر پیش کیا ہے نہایت خستہ حالت میں ہے اور مجھے خواجہ فضل احمد شیدا نے مرحمت فرمایا تھا، انہیں چیزیں سینت کر رکھنے کی عادت تھی میری خواہش پر بہت سے خطوط ارسال فرمائے تھے یہاں موقع کی مناسبت سے اس خط کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مکمل ثبوت مل جائے کہ واحدی صاحب کو کس قدر پاسِ دوستی رہتا تھا۔ اصل میں ان کا سینہ محبتِ الٰہی و محبتِ انسانی سے آباد تھا۔

دراصل واحدی صاحب دل و دماغ کے اعتبار سے بہت اچھے آدمی تھے ان کا قلب و ذہن مثل روشن کتاب کے تھا کردار مضبوط، ظاہر و باطن یکساں تھا سیر چشمی و اخلاص، صلح کن، محتاط اور متوازن و متین طبیعت کے مالک تھے۔ یہی سبب تھا کہ انہوں نے اپنی زبان و قلم کو ہمیشہ پاکیزہ راستوں پر گامزن رکھا اور اپنے عمل و کردار سے سبھی کو فیض پہنچایا۔ اور یہ وہ وصفِ سیرت ہے۔ جو آج تک دلوں پر نقش ہے اور جس کا نتیجہ لازوال ہے۔!

حضرت ملا کو اپنے سارے دوست احباب سے بڑی محبت تھی ان کا اخلاق و کردار بہت بلند تھا، ان کی شخصیت بہت سادہ اور سہک تھی، ان کی شخصیت دراصل اتنی پہلودار ہے کہ ایک مقالے یا مضمون میں اس کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ دہلی سے محبت ان کے وجود کا مرکز اصلی تھا۔

۲ر ستمبر ۱۹۷۳ء کے ایک مکتوب گرامی میں مجھے تحریر فرماتے ہیں۔

"عزیزم! موجودہ دلی میری دلی نہیں ہے۔ میری دلی مر چکی ہے۔ میں مری ہوئی دلی کو یاد کرتا ہوں۔ اب تو بس وہاں اینٹ پتھر کی کچھ عمارتیں باقی رہ گئیں ہیں دعاگو۔ واحدی"

مرحوم دلی سے انہیں بڑا گہرا تعلق تھا۔ لیکن پہلے وہ دلی میں آباد تھے۔ کراچی آکر دلّی ان میں آباد ہو گئی۔ دلی کی ہر تصویر ان کے تصور میں بس گئی تھی۔ اسی جذبۂ دل نے ان کے قلم سے "میرے زمانے کی دلی" جیسی کتاب لکھوا دی۔ بہت سے مقالات دلی کی تہذیب و معاشرت پر ان کے مجموعہ مضامین کی صورت میں مرتب کر دیئے ہیں۔ وہ دلی کے عاشق تھے۔ اور اردو کے شیدائی۔ انہیں دلی کے گلی کوچوں سے (یعنی اوراق مصور) اور شرفائے دلی سے پیار تھا۔ دلی اور اہلِ دلی

سے جدائی اور بعض دوستوں کی دائمی مفارقت نے ان کے دل پر بڑا سوز و گداز پیدا کر دیا تھا۔ اور وہ بے حد حساس اور رقیق القلب ہو گئے تھے۔ زندگی کو ایک انمول نعمت سمجھا کرتے تھے۔ اور زندگی میں جہدِ مسلسل اور واضح نصب العین کے تحت کچھ کر گزرنے کو حاصلِ زندگی سمجھتے تھے۔ خواجہ حسن نظامی کی نصف صدی کی خاص توجہ کا نتیجہ تھا! ہم نشینی اور توجہ نے اس جذبے کو اور نکھار دیا تھا۔ اس اعتبار سے وہ دلی کی آخری شمع اور شرفائے دلی کا بہترین نمونہ تھے۔ اپنی ذات و صفات کے اعتبار سے بھی خود انجمن تھے۔ دلی کی صاف، شگفتہ اور ٹکسالی زبان لکھنے میں ان کو کمال حاصل تھا۔ یہ ٹکسالی زبان قلعہ معلیٰ، محلات اور رنیفس بازار میں بولی جاتی تھی اور دلی کے جملہ قدیم ادیب اس میں پسند کا درجہ رکھتے تھے۔ ملا واحدی انہیں ممتاز ادیبوں میں سے ایک زیادہ ممتاز فرد تھے۔ دہلی سے ہجرت کر کے جب کراچی آئے تو بے شمار مضامین اپنے ہزاروں تاثرات کے ساتھ لکھ ڈالے، اور انمول کتب کے مصنف کہلائے

۱۔ حیاتِ سرورِ کائنات ؐ — تین حصوں میں۔

۲۔ حیاتِ اکبر الہ بادی — بزمِ اکبر نے شائع کی تھی۔

۳۔ سوانح عمری خواجہ حسن نظامیؒ — حصہ اول

۴۔ میرے زمانے کی دلی — حصہ اول۔

(ا)۔ ان سے نسبت ہونے کی بنا پر ان کے تربیت یافتہ ہونے کے باعث راقم الحروف نے بھی ملا واحدی علیہ الرحمۃ کی شخصیت و تصانیف کے بارے میں کئی مجموعے تیار کیے ہیں۔

(ب) ملا واحدی کے مقالات انشائیے اور شخصیتیں۔

(ج) ملا واحدی اپنے جاننے والوں کی نظر میں۔ (یہ مجموعہ مختلف مشاہیرِ ادب کی تحریروں پر مشتمل ہے۔)

(د) میرا افسانہ (خود نوشت سوانح عمری۔ (یہ کتاب ایک فرد کی کہانی نہیں ایک عہد کی تہذیب و تاریخ ہے۔ شورش کاشمیری مرحوم نے ۴ فروری ۱۹۷۱ء کو ملا واحدی کو یہ خط لکھا تھا۔

"مخدومی، سلام مسنون، نامۂ گرامی ملا۔ "میرا افسانہ" ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا۔ میں کیا اور میری ستائش کیا؟ باور کیجیے، سطر سطر میں ڈوب گیا، شروع سے آخر تک اس طرح پڑھا گویا آپ کا ہم سفر ہوں اور زندگی تب و تاب حاصل کر رہی ہے۔۔۔ آپ تو ہمارے پچھلے دور کی عظمتوں میں سے ایک ہیں کہ

اب ان کے ڈھونڈنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں۔"

(ر) تاثرات، پہلا حصہ حکیم محمد سعید صاحب کے دیباچے کے ساتھ ہمدرد اکیڈیمی سے واحدی صاحب کی زندگی میں شائع ہو چکا ہے۔ "تاثرات" مستقل طور پر لکھنے کا سلسلہ "نظام المشائخ" کے بند ہو جانے کے بعد دراصل حمید نظامی مرحوم مدیر نوائے وقت کی خواہش اور فرمائش پر شروع کیا گیا تھا۔ یہ ایک بڑی عہد آفرین کتاب ہے جس کی علمی شان اور فکری عظمت کو جملہ اہل نظر نے تسلیم کیا ہے۔ نئی نسل کے لئے اس میں بڑی روشنی ہے یہ ایک زندہ کتاب ہے اور اسلامی فکر کو اس میں بہت اچھے، دل نشین طریقے سے سمو دیا گیا ہے۔

یہ دین ودانش ہی کا مرقع نہیں بلکہ تاریخی اعتبار سے بھی تہذیب و اخلاق کا بے مثل خزانہ ہیں اس کے بارے میں حضرت ماہر القادری نے اپنے متعدد مکاتیب میں حضرت مرحوم کا شکریہ ادا کیا ہے اور بار بار تعریف کی ہے

خط مورخہ "تاثرات" مل گئے۔ شکریہ۔

آپ ملت کے متاعِ گراں قدر ہیں، اور آپ کا قلم حق و صداقت اور اخلاق و شرافت کی ترجمانی کے لئے وقف ہوگیا ہے۔"

"تاثرات مل گئے، آپ کے مضامین سے ایمان تازہ ہوتا ہے۔ زندگی کے آخری دور میں آپ کے زادِ آخرت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے! آپ پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل وکرم ہے کہ اس بڑھاپے میں آپ کو دین کی خدمت کے لئے جوان بنا دیا ہے۔ یہ دینی جذبہ ہے جس نے آپ میں "برقی رو" پیدا کر دی ہے۔ آپ کے اعمال نامہ میں اب صرف "نیکیاں ہی نیکیاں لکھی جا رہی ہیں۔

آپ میں "خشیتِ الٰہی" کی جو کیفیت پیدا ہوئی ہے اس پر جس قدر اللہ تعالیٰ کا شکر کریں کم ہے۔ دل کی یہ کیفیت اہل اللہ ہی کو میسّر آتی ہے۔"

یوں تو حضرت ملا واحدی کی تمام کتابیں معیاری ہیں مگر تاثرات ان کی حیات ابدی کا ضامن ہیں۔ کیونکہ ان کی ایک ایک سطر میں علم وعرفان کا دریا بند ہے۔ جس کا فیض وافر کسی زمانے میں کم نہ ہو گا۔ ہر مصنف کی کامیابی اور شہرت کا راز اس کی لیاقتِ علمی اور قابلیتِ فکری کے علاوہ اس کے دلنشین طرزِ انشا اور سادہ و موثر اندازِ بیان پر منحصر ہوتا ہے۔ کیونکہ انشا کا مطلب محض کچھ لکھنا نہیں ہے اس کی اصل روح خوبصورتی کے ساتھ بات پیدا کرنا ہے، عبارت میں تکلف و بدنمائی نہ ہو بلکہ سادگی و خلوص دلکشی و پاکیزگی ہو، تحریر ہو یا تقریر اثر صرف خلوص سے پیدا ہوتا ہے۔ زبان کو خیالات کے تابع ہونا چاہیئے اور نفسِ مضمون کے لحاظ سے لفظوں کا انتخاب ہی دراصل انشاپردازی کی روح ہے زبان تو صرف اظہار خیالات کا ذریعہ ہے، اولیت "فکر و خیال" کو حاصل ہے، دوسرے الفاظ میں "خیال" روح ہے تو زبان جسم۔ اگر خیال یعنی روح لطیف نہیں ہے تو جسم کا حسن اور دلکشی کوئی وقعت نہیں رکھتی لکھنے والے کا ظاہر و باطن کا پاک ہونا لازم ہے ورنہ ادبِ عالیہ کی تخلیق مشکل ہے۔ اور یہ بات صرف اسی وقت ممکن ہے جب شاعر و انشاپرداز کی داخلی اور خارجی کیفیت، خیالات و احساسات اور زبان و بیان لطافت سے بھرپور ہوں ورنہ "یادوں کی برات" بھی "یادوں کی خرافات" بن جاتی ہے۔ شرافت و لطافت، حق و صداقت، پاکیزگی و شگفتگی انشائے واحدی کی خصوصیت ہیں۔ میں جب بھی کبھی صبح کو ان کی خدمت میں حاضر ہوتا، انہیں لکھنے میں مصروف پاتا تھا لکھتے وہ صبح ہی کو تھے میں نے دیکھا کہ ہمیشہ میز و کرسی پر بیٹھ کر اور جم کر لکھا کرتے تھے اور ان کی کوشش ہوتی کہ جو مضمون بھی لکھ رہے ہوں وہ پورا ہو جائے اور تسلسل نہ ٹوٹے۔ فالج کا دوسرا بڑا حملہ ہونے کے بعد بھی وہ تخت پر بیٹھ کر لکھا کرتے تھے۔ اپنے دلی سے کراچی آنے کے بعد دو عنوان انہوں نے اپنے واسطے مختص کر لئے تھے۔ "دلی" اور "اسلام" ہمیشہ انہیں کو موضوعِ تحریر بنایا۔ سادہ اور شگفتہ نگاری انہوں نے مصورِ فطرت خواجہ

حسن نظامیؒ کی صحبت میں سیکھی تھی۔ خود چونکہ قلعہ معلیٰ سے متصل کوچہ چیلان کے باشندے تھے اور اردوئے معلیٰ
لینے والے شاہزادوں کے پڑوسی ہونے کا شرف حاصل تھا۔ اس لئے زبان و بیان پر انہیں عبور تھا اس لئے
ان کے مضامین دلی کی سادہ و شگفتہ اور آبِ کوثر میں دھلی ہوئی زبان اور طرز بیان کا شہکار تھے۔ ان کا مسودہ بہت
صاف اور روشن ہوا کرتا تھا۔ خط اتنا پاکیزہ تھا کہ آنکھوں میں نور اور دل میں سرور پیدا ہوتا تھا۔ میری آٹوگراف
بک میں ایک جگہ لکھا ہے۔

"میں دو سطریں بھی اس وقت لکھتا ہوں جس وقت وہ دو سطریں مجھ پر مسلط اور طاری ہو جاتی ہیں کہ ہمیں لکھو"
پڑھنے لکھنے میں اپنی فالج زدگی اور اپنے اپاہج پن کا مجھے مطلق خیال نہیں آتا۔ چونکہ پڑھنا لکھنا صبح سویرے
سے رات کے ۹ بجے تک رہتا ہے۔ بیماری کا خیال نہ آنے نے عام صحت پر بفضل تعالیٰ اچھا اثر کیا ہے۔ میری تحریر
اگر کامیاب ہے تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ میں تحریر میں خود کو بھول جاتا ہوں۔۔ واحدی"

ان کی تحریروں نے بڑے بڑے آدمیوں کو متاثر کیا ہے، وہ مجسم اخلاص و اخلاق اور حکیم الانسانیت تھے۔ شاہد احمد
دہلوی نے ایک مرتبہ لکھا تھا "اس طرز انشاء کو دیکھنے کے لئے آنکھیں ترستی ہیں۔" نقاش فطرت ایم اسلم نے اپنے
ایک خط میں تحریر فرمایا تھا "جامِ نو کے اسلم نمبر میں آپ نے میرے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کے ایک ایک لفظ
سے شفقت اور لطف و کرم کا اظہار ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔ اردو کے نامور صاحب طرز ادیب
جناب صادق الخیری نے لکھا ہے۔" واحدی صاحب! آپ اپنی ذات سے ایک انجمن ہیں۔ آپ لاکھ خاموش،
گوشہ نشین سہی، لیکن جو لوگ "گذشتہ" اردو اور "قدیم" ادیبوں سے واقف ہیں انہیں آپ کا رتبہ اچھی طرح معلوم ہے
اسمٰعیل احمد مینائی صاحب نے ایک بار مجھ کو لکھا تھا "محترم قطب یا ابدال تھے۔" انصار ناصری نے اپنے ایک خط میں
واحدی صاحب کو لکھا تھا۔ "آپ سے کون حقیر سے حقیر دلی والا پوشیدہ ہے! اس تعلق کی بنا پر ذات والا سے قربت خاص
محسوس کرتا ہوں۔ آپ کی اکیلی ذات سے ہزاروں یادیں وابستہ ہیں۔ آپ دلی کے سینکڑوں بزرگوں کی واحد یادگار ہیں۔"

ہم عصر ادیبوں کی چشمک اور رقابت ایک پرانی چیز ہے اور ہمیشہ سے ہوتی آئی ہے لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے
ان کی تحریر اس عیب سے پاک ہے وہ تو نئے لکھنے والوں کی بھی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے اور اپنے ہم عصروں کی
ترقی اور سچی شہرت کو دیکھ کر فطرتاً خوشی محسوس کرتے تھے۔ انسان کی جد و جہد اور قوتِ فکر و عمل سے ان کو بڑی
دلچسپی تھی اور اردو کی فروغ وسعت میں انہوں نے بڑا کردار ادا کیا ہے یہی سبب ہے کہ اردو کے مشہور شاعر اور
شاہنامہ اسلام کے مصنف جناب حفیظ جالندھی کہا کرتے کہ "نظام المشائخ" وہ پرچہ ہے جس کو دیکھ کر ہم نے لکھنا
سیکھا تھا۔" ان کی زبان کو اللہ تعالیٰ نے خیر و بھلائی کے لئے بنایا تھا۔ ان کو برائی اور جھوٹ سے نفرت تھی۔ اور کسی
کی دل شکنی کرنا تو جانتے ہی نہ تھے۔ دل آزاری ان کے نزدیک سب سے بڑا گناہ تھا۔ وہ ایک با اصول انسان تھے۔ اور
دوستی، وضع داری اور حسنِ سلوک ان کے اخلاق کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ دوستی کے پکے تھے مگر جو ان کی
طرف مائل ہوتا نظرِ التفات اسی پر فرماتے تھے۔ جو ایک قدم آگے بڑھتا تھا وہ اس کی طرف دس قدم آتے تھے

فطرتاً کم سخن تھے، لیکن جو کچھ کہتے تھے وہ لطف سے خالی نہ ہوتا تھا، وہ جیسا لکھتے ہیں ویسا بولتے بھی تھے۔
طبیعت ان کی بہت محتاط تھی اور سلیقہ ان پر ختم تھا۔ اعتدال پسندی، نفاست، پاکیزگی اور فکر وعمل سے ان کی زندگی عبارت تھی۔ انہیں اپنے تمام خاندان، اولاد، اور اولاد سے زیادہ اولاد کی اولاد سے بڑی محبت تھی، اور کسی کو تکلیف میں دیکھ کر بے چین ہو جاتے تھے۔ راقم الحروف کو ابتدائے عمر سے لکھنے کا شوق تھا اس لئے خاص التفات فرماتے تھے۔

اُردو کے مشہور اہل قلم مقبول جہانگیر جس زمانے میں "اردو ڈائجسٹ" سے منسلک تھے، اور شاہد دہلوی مدیر ساقی پر کتاب "یادِ شاہد" مرتب کر رہے تھے، تو کتاب کے لئے ایک مضمون واحدی صاحب سے بھی مانگا، جواب ملاحظہ فرمایئے۔

"ساڑھے بیاسی سال کی عمر میں اور فالج کے دوسرے اور نہایت شدید حملے کے بعد جیسی صحت ہونی چاہیئے، صحت اس سے بہتر ہے الحمد للہ علی ذالک۔ بر آں موت کا انتظار بھی ہے اور زندگی (Enjoyment) بھی کر رہا ہوں اب صرف لکھنا پڑھنا میری (Enjoyment) ہے۔ اپاہج پن لکھنے پڑھنے سے نہیں روکتا۔
شاہد صاحب کے متعلق چند سطریں لکھنے کا میں نے وعدہ کیا تھا۔ موجودہ حالت قائم رہی تو انشاء اللہ ۱۵ جون تک وعدہ ضرور پورا کروں گا۔ نمبر مل گیا ہے۔ عینک دو چار دن میں آنے والی ہے۔ یہ خط پرانی عینک لگا کر لکھا ہے میرے خاتمہ بالایمان وبالاطمینان کی دعا کیجیے، اور یہی درخواست آپ کے احباب سے ہے۔ اور کوئی کام لاہور کا نہیں ہے۔
ہاں جب شاہد صاحب والی سطور پہنچیں تو رسید دیجیئے گا۔ دعاگو واحدی (۱۰ جون ۱۹۶۸ء)"

ملا صاحب کا مضمون مل گیا تو مقبول جہانگیر صاحب نے اُنکی رسید روانہ کر دی۔
شاہد مرحوم کے سلسلے میں علی گڑھ سے پروفیسر رشید احمد صدیقی کا مکتوب گرامی میرے پاس آیا ہے۔ اس کے چند جملے آپ کے ملاحظہ کے لیئے لکھتا ہوں۔

"دہلی کی زبان اور دہلی کے نشان اب وہاں کی ان خاموش سالم یا شکستہ عمارتوں میں باقی رہ گئے ہیں جو اِدھر اُدھر بکھری ہوئی ہیں۔ آپ زبان اور عمارت کے گہرے معنوی ربط کو سمجھتے ہوں گے جس کی بڑی اچھی مثال اور نہایت قریبی مثال اُردو اور ہندوستان کی شاہی عمارتیں ہیں۔ دلّی کی تہذیب اور اس کا رکھ رکھاؤ اب ان لوگوں میں باقی رہ گیا ہے جو خزاں رسیدہ پتیوں کی طرح چمن کے باہر تتر بتر ہو چکے ہیں۔ یہ وہ ہیں جو اپنی زبان، اپنے قلم، اور اپنے آداب واکرام سے دلّی کے نام ونقوش کو دلوں پر بٹھاتے چلے جاتے ہیں۔ یہ جہاں جائیں گے مشرق وسطیٰ کی اس گراں مایہ تہذیب کی داغ بیل ڈالتے جائیں گے جس کی آبیاری عہد سعادت وسطوت کے سرچشموں سے ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ اس رول کے ادا کرنے میں ان اصحاب قلم کا بڑا حصہ ہے جنہوں نے دہلی کی اس عظمت، ہجرت اور شانِ دل آویزی کو تازہ وتابندہ رکھا ہے جس کی طرف اقبال کا ذہن سوادِ رومۃ الکبریٰ میں منتقل ہوا تھا۔

یہ جملے پڑھ کر بے اختیار ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ خورشید صاحب نے ملا واحدی دہلوی کی تصویر کھینچ دی ہے۔ حضرت ملا واحدیؒ کا مادی وجود اب اس دنیا میں نہیں لیکن ان کے کارنامے ان کے نام کو اور ان کی یاد کو سدا زندہ رکھیں گے۔

کیا پوچھتا ہے ہمدم کل کیا تھا آج کیا ہے۔
محفل اجڑ گئی ہے۔ افسانہ رہ گیا ہے۔

(مولانا) محمد جعفر شاہ ؒ

تشہد کے بعد درود ۔ صلے اللہ علیہ وسلم

ایک وضاحت

اپریل کے فاران میں میرا جو مضمون " وجدنا علیہ اباءنا " کے عنوان سے شائع ہوا تھا اس کے مندرجہ ذیل اقتباس سے

" صحاح ستہ میں نماز کے طریقے موجود ہیں لیکن ان میں کہیں تشہد کے بعد درود پڑھنے کا ذکر نہیں ۔ ہمارے ہاں صدیوں سے تشہد کے بعد درود ابراہیمی پڑھا جاتا ہے ۔ یہ درود مختلف الفاظ کے ساتھ احادیث میں موجود ہے ۔ لیکن نماز میں تشہد کے ساتھ ملا کر اسے پڑھنے کا صحاح ستہ میں کہیں ذکر نہیں ۔ مگر صدیوں سے ہمارے ہاں اس طرح رائج ہے کہ جزو نماز بن گیا ہے ۔ ذرا کسی سامنے یہ کہہ دیجیئے کہ درود نماز کا جز نہیں ہے اور اس کے بغیر بھی نماز مکمل ہوجاتی ہے یہ کہہ کر پھر دیکھئے سننے والے آپ کے بارے میں کیا رائے قائم کرتے ہیں ۔ پھر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ صلوٰۃ بھیجنے کا جو حکم ہے وہ صرف اتنا ہے کہ " صلوا علیہ وسلموا تسلیما لیکن ہم نے اس میں آلہٖ واصحابہ وازواجہ وذریتہ واولیاء اللہ وغیرہ کے اضافے کرتے ہیں ؟ ..... ص ۲۷

جناب حبیب احمد صدیقی نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ یہ ہے ۔

یہ عبارت کچھ ایسا تاثر دیتی ہے کہ نماز میں تشہد کے بعد درود شریف پڑھنے کا کوئی شرعی جواز نہیں ۔ (ص ۲۷

آپ کی تو یہ نرالی تحقیق ہے کہ صدیوں سے کسی شرعی جواز کے بغیر نماز میں درود شریف پڑھتے چلے آرہے ہیں ۔ ص ۲۹

میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کی بنیاد یہ ہے ۔

۱ ۔ صحاح ستہ میں تشہد کے بعد درود پڑھنے کا کوئی ذکر نہیں ۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک دو نہیں بلکہ چھ کے چھ جامعین حدیث اسے فراموش کر جائیں ۔

۲ ۔ سنن ابوداؤد میں بھی ہے کہ " جب تم تشہد پڑھ لو تو تمہاری نماز پوری ہوگئی ۔ چاہو تو اٹھ کھڑے ہو (سلام پھیر کر) اور چاہو تو بیٹھے رہو (دوسری دعائیں پڑھ کر سلام پھیرو) ظاہر ہے کہ درود بھی دعا ہے پڑھنے سے کوئی گناہ لازم نہیں آئے گا ثواب ہی ہوگا جیسے اور دعائیں پڑھنے کا ثواب ہوتا ہے ۔ لیکن یہ مسلم ہے کہ تشہد کے بعد نماز مکمل ہوجاتی ہے اور کچھ مزید پڑھنا ضروری نہیں اور نہ تو نماز کا جز ہے ۔ فاضل مضمون نگار نے " نماز کا جز نہیں " اور " پڑھنے کا شرعی جواز نہیں " میں کوئی فرق نہیں کیا دونوں باتوں کو ایک ہی صف میں رکھا یا روا روی میں خیال نہیں رہا اس کا فیصلہ تو وہ خود کر سکتے ہیں

میرا ایک مومن کے متعلق یہی گمان ہے کہ انہوں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا ہوگا کیونکہ وہ اپنے جذبے میں صادق ہیں

بہر حال مخلص مقالہ نگار کو ادھر ادھر کی باتیں لکھنے کی بجائے صرف یہ جواب دینا چاہیے تھا کہ صحاح ستہ

میں تشہد کے ساتھ درود کو ضروری قرار دیا گیا ہے اور اسی کی تائید میں یہ روایات ہیں

۳ ان اللہ وملئکتہ یصلون علی النبی یاایھا الذین آمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما۔

یں صلوۃ بھیجنے کا جو حکم ہے اس میں آگے پیچھے کہیں بھی نماز میں تشہد کے بعد درود بھیجنے کا کوئی ارشاد تک

نہیں اور یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اللہ اور اس کے فرشتے جس طرح پانچوں وقت کی نماز باجماعت میں تشہد کے بعد

درود شریف پڑھا کرتے ہیں اسی طرح اے مسلمانوں تم بھی پڑھا کرو۔

ان دلائل کے پیش نظر امام شافعی کا یہ اجتہاد کہ نماز میں درود پڑھنا فرض ہے اور اس کے بغیر نماز ہی نہیں

ہو گی۔ محل نظر بھی ہے اور محتاجِ دلیل بھی۔ اگر یہ اجتہاد درست سمجھا جائے تو ان حضرات کے بارے میں کیا کہا

جائے گا۔ جو اسے فرض نہیں جانتے۔ واجب یا سنت کہتے ہیں جن کا ذکر آپ نے صفحہ ۲۹ فاران جون ۱۹۸۱ء کے

شروع میں کیا ہے؟ پھر جو واجب یا مسنون کہتے ہیں وہ بھی محتاج دلیل ہے کیونکہ مذکورہ بالا احادیث ابوداؤد

سے اس کے واجب و مسنون ہونے کی تائید نہیں ہوتی اور صحاح ستہ میں اس وجوب یا سنت کا ذکر نہیں

ہم نے یہ کب دعوٰی کیا ہے کہ جو لوگ تشہد کے ساتھ درود (یا دوسری دعا) پڑھتے آئے ہیں۔ وہ گناہ کرتے

آئے ہیں۔ یا اس کا شرعی جواز نہیں۔ ہم نے صرف یہ کہا ہے کہ یہ جزِ نماز نہیں اور اس کے بغیر بھی نماز ہو جاتی ہے

فاران ۱۹۸۱ء میں بھی جناب تقی عثمانی صاحب نے محمد اقبال صاحب کا ایک مضمون شائع کرایا ہے۔ یہ جناب خسروی کے

ایک استفتے کا جواب ہے۔ استفتے میں میری طرف یہ قول منسوب کیا گیا ہے کہ تشہد کے بعد درود ابراہیمی بدعت ہے۔ اور

۔۔۔۔ حضورؐ اور ان کی آل پر درود لایعنی ہے۔ (ص ۳۲)

اس معروضہ قول کا اوپر جواب دیا گیا میری طرف کوئی غلط بات منسوب کر کے اس پر ایک عمارت کھڑی جائے تو اس کا

جواب میرے ذمے نہیں۔ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ اس سلسلے میں ایک تسامح جناب مدیر فاران سے بھی ہو گیا

ہے۔ انہوں نے بھی ص ۳۱ پر یہی جملہ میری طرف منسوب فرما دیا ہے۔

یہ غنیمت ہے کہ محمد اقبال صاحب نے اپنے مضمون میں یہ تسلیم کر لیا ہے کہ حنفیوں اور جمہور امت کے ہاں نماز میں

درود سنتہ مستحبہ ہے دوسرے لفظوں میں جزو صلوٰۃ نہیں اور اس کے بغیر بھی نماز ہو جاتی ہے اس سلسلے میں امام شافعی، ابن کثیر

آلوسی، حلبی، اور بیہقی وغیرہ کا ذکر محض طول کلام ہے۔ میں نے صرف صحاح ستہ کا ذکر کیا تھا کہ ان میں تعین کے ساتھ تشہد کے

بعد درود کا ذکر نہیں۔

ان چند دنوں ہی میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ روایات کس طرح بنتی چلی جاتی ہیں اور پروپیگنڈا کس طرح کیا جاتا ہے میں نے جو

کچھ لکھا وہ آپ کے سامنے ہے۔ حبیب احمد صدیقی صاحب نے اسے یوں ادا کیا کہ درود پڑھنے کا کوئی شرعی جواز نہیں۔ اور

جناب خسروی نے اسے ان الفاظ میں دہرایا کہ درود پڑھنا، بدعت ہے۔ اور جناب اقبال صاحب، جناب تقی عثمانی صاحب اور

خود جناب مدیر فاران صاحب نے خسروی صاحب کے الفاظ کو تحقیق و تصدیق کے بغیر درست سمجھ لیا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ جناب حبیب احمد صدیقی صاحب اور جناب خسروی صاحب نے جان بوجھ کر کسی خراب نیت سے یہ معنوی و لفظی تحریف کی ہے۔ استغفر اللہ ایسی بات نہیں۔ یہ دونوں نیک نیت مسلمان اور میرے مہربان ہیں۔ مگر روایت در روایت میں ایسی رد و بدل ہو ہی جایا کرتی ہے۔ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام بخاری اور دوسرے محدثین کو لاکھوں روایات میں سے صحیح روایات کو چھانٹنے میں کتنی دشواری پڑی ہوگی جبکہ زمانہ بھی دو سو سال سے اوپر گزر چکا تھا اور راویوں کی تعداد بھی سینکڑوں سے متجاوز ہی تھی۔ ابھی تو صرف "بدعت" کا لفظ فرمایا گیا ہے۔ ممکن ہے آگے کا سلسلہ کچھ یوں ہو کہ درود پڑھنا ضلالت ہے۔ (کل بدعۃ ضلالۃ) اور درود پڑھنے والا (نعوذ باللہ) دوزخی ہے (کل ضلالۃ فی النار) غرض۔ ع جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

بحمد اللہ میں خود درود پڑھتا ہوں۔ نمازوں میں بھی اور ان کے علاوہ بھی مگر اس فرق کے ساتھ کہ۔

۱۔ اسے جزوِ نماز اور فرض یا واجب نہیں سمجھتا یعنی اس کے بغیر بھی نماز مکمل ہو جاتی ہے۔

۲ رائج الوقت درود ابراہیمی کے علاوہ بھی دوسرے ماثورہ درود پڑھتا ہوں ادل بدل کر۔

۳۔ زیادہ جامع درود صلی اللہ علیہ وسلم کو سمجھتا ہوں اس میں صلوا علیہ وسلموا تسلیما کی پوری پوری تعمیل ہے صلوٰۃ بھی ہے اور سلام بھی۔ ہماری تمام کتب احادیث میں یہ درود اس کثرت سے موجود ہے کہ ان کی تعداد لاکھوں سے بھی متجاوز ہو جائے گی۔ دوسرے اسلامی لٹریچر میں اس کی تکرار ان کے علاوہ ہے جہاں جہاں بھی النبی یا رسول اللہ کا لفظ آیا ہے وہاں صلی اللہ علیہ وسلم ضرور موجود ہے۔

ہاں ایک نئی بدعت اب یہ چلی ہے جس کی اجازت معلوم نہیں ذرائع ابلاغ کو دے دی گئی ہے۔ یعنی صلی اللہ والہٖ وسلم عربی ادب کا ایک مبتدی بھی جانتا ہے کہ ضمیر مجرور متصل جب معطوف علیہ ہو تو معطوف پر حرف کا اعادہ ضروری ہے۔

اللھم اغفرلی ولوالدیّ تو ٹھیک ہے لیکن اگر کوئی اللھم اغفرلی و والدیّ کہے تو غلط ہے کیونکہ لام جارّہ کے بغیر والدیّ غلط ہے۔ اس طرح صلی اللہ علیہ و کے بعد اگر الہٖ کہا جائے تو علی کا اعادہ لازمی ہے۔ پس وعلی الہٖ کی بجائے والہٖ کہنا غلط ہے۔ یہ غلطی سب سے پہلے شیخ سعدی نے کی تھی۔ صلوا علیہ والہٖ لیکن یہ ایک شعری ضرورت تھی پھر صحیح نہ تھی۔ اس کے بعد یہ غلطی چل پڑی تو درود تاج کا خاتمہ بھی اسی پر ہوا حالانکہ یہ کوئی شعر نہیں ہمارے ریڈیو اور ٹی وی کو اسی غلطی کی کھلی چھٹی دے دی گئی ہے۔ مگر ہم کسی قیمت پر عربی زبان کو بگاڑنے کی اجازت نہیں دے سکتے اگر ارباب اختیار کے ایما سے یہ غلطی نہیں کی جا رہی ہے تو انہیں چاہیئے کہ فوراً اس فاش غلطی کو بند کرائیں

مضمون نگار محمد اقبال صاحب کا مزید جواب بھی دیا جا سکتا ہے بشرطیکہ حضرت خسروی، جناب تقی عثمانی صاحب محمد اقبال صاحب اور مدیر فاران واضح لفظوں میں ان تمام قارئین فاران کی بدگمانیوں کو دور کر دیں جو ان کو مجھ سے اس مضمون کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔۔

لہ میں نے صرف مستفتی کا حوالہ دیا ہے ورنہ میری اپنی رائے یہ تھی، نہ ہے پھر بھی اگر صاحب مضمون کو مجھ سے شکایت ہے تو میں معذرت کرتا ہوں۔ مدیر

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

صفدر گنوروی

صفدر! کمندِ شوق کہاں؟ چاند پر گئی۔؟
اپنی طرف بھی تیری نظر خوش نظر گئی
مانا جہاں سے وسعتِ اہلِ ہنر گئی۔!
خود پر بھی اے نگاہِ حقیقت نگر گئی
اِس دورِ ابتلا پہ تردّد نہیں مجھے،
رونا یہ ہے فضیلتِ نوعِ بشر گئی۔
مرجھا تا جا رہا ہے کنول دل کا اِن دنوں
اے لذتِ گناہِ مکرّر۔ کدھر گئی
اپنے ہی سر پہ آئی خردمند دوستو
جتنی اڑائی خاک کہاں چاند پر گئی۔

اختر ماہری

عجب ہے میرا رنگِ داستاں بھی۔
ہنسی کے ساتھ ہونٹوں پر فغاں بھی
یہی دو چار تنکے خار و خس ہیں
یہی دو چار تنکے آشیاں بھی۔
ہمارے خون کے چھینٹوں نے اکثر
بنایا ہے قفس کو گلستاں بھی
بھلا بیٹھے کبھی احباب کو ہم۔
کبھی تڑپے بیادِ دشمناں بھی
یہ سب جھگڑے ہیں جینے جی کے اختر
گلستاں بھی قفس بھی آشیاں بھی

ہادی القادری

جلوۂ حسن ہے نظر دشمن۔
شوق اپنا سہی مگر دشمن
عشق ہی وہ مقام ہے کہ جہاں
دوست قاتل ہے چارہ گر دشمن
ہیں عجب دردِ عشق کے آداب
آہ کھینچو مگر اثر دشمن۔
وسعتِ کائنات ہو ہم ہوں
شوق کا ولولہ ہے گھر دشمن
کیا اٹھاؤ گے ننگِ بے ہنری
ہے جو ہادی جہاں ہنر دشمن

شوق ماہری (بھارت)

جانے کس دور سے اب عمرِ رواں گزرے ہے
دل پہ احساسِ مسرّت بھی گراں گزرے ہے
اس محبت نے عجب حال کیا ہے دل کا۔
ہر نفس ایک نیا وہم و گماں گزرے ہے۔
شعلۂ غم مرے سینہ میں دھواں ہوتا ہے
آگ بن کر مرے ہونٹوں سے فغاں گزرے ہے
کوئی ٹوٹی ہوئی امید ملاقات نہ ہو۔
دل کی راہوں سے کوئی نور فشاں گزرے ہے
زندگی شوق مجھے جانے کہاں لے آئی۔
میرے نغموں پہ بھی نالوں کا گماں گزرے ہے

ر رضی الاسلام ماجد۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ

اقامت دین

حیاتِ رسولؐ کے آئینے میں

یہ مضمون۔ مضمون نگار کی حوصلہ افزائی کے لیے شائع کیا جارہا ہے

"اقامتِ دین" خدا کی طرف سے عائد کردہ وہ عظیم فریضہ ہے جو تخلیق انسانی کا مقصد ہے اور جس کے لئے
ان کو وجود بخشا گیا۔[۱] جب بھی انسانِ ظلوم وجہول نے اپنے اس عظیم مقصد وجود کو بھول کر یا بھلا کر اور "حبل اللہ"
اپنے ہاتھوں سے چھوڑ کر دوسرے ادیان و مذاہب اور عقائد و نظریات کا دامن پکڑ لیا اور دین فطرت کی متعین
وہ شاہراہ سے ہٹ کر گمراہ کن پگڈنڈیوں اور مہیب دگھٹا ٹوپ بھول بھلیوں میں جا پہنچا تو خالقِ کائنات نے تھوڑے
تھوڑے وقفے کے بعد اپنے برگزیدہ بندوں کو منصبِ نبوت سے سرفراز فرمایا تاکہ وہ اسے اس کا مقصدِ تخلیق اور
"خلیفۃ اللہ" ہونے کا عظیم مقام یاد دلائیں اور خدا کی زمین میں "خدا کی حاکمیت" کو قائم کریں۔

شرع لکم من الدین ما وصی بہ نوحاً والذی اوحینا الیک وما وصینا بہ ابراہیم وموسیٰ وعیسیٰ ان اقیموا (الشوریٰ ۱۳)

ترجمہ۔ اس نے تمہارے لئے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم نوح کو دیا تھا اور جسے اے محمد اب
تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعے سے بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دے چکے
ہیں اس تاکید کے ساتھ کہ اس دین کو قائم کرو۔

اقامتِ دین سے مراد محض اسلام کا سیاسی اقتدار یا اسلامی حکومت قائم کرنا نہیں بلکہ حیاتِ انسانی کے انفرادی
و اجتماعی تمام گوشوں کو دینِ اسلام کے مطابق ڈھالنا ہے۔ مگر اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ پورے دین کی اقامت
اور پوری شریعت کے نفاذ میں سیاسی اقتدار اور حکومت کا بہت دخل ہے؟ اسلامی حکومت اسلامی کا مقصود و مطلوب تو نہیں
مگر مقصود و مطلوب تک پہنچنے کا ذریعہ ہے مقصد اقامت دین ہے اور سیاسی اقتدار سد راہ ہونے والی رکاوٹوں کو دور
کر کے اس مطلوب تک پہنچنا آسان کر دیتا ہے۔

جن لوگوں کا یہ دعویٰ ہے کہ فریضۂ اقامتِ دین کی ادائیگی اسلامی حکومت کے بغیر بھی پوری طرح ہو سکتی ہے اور
سیاسی اقتدار کے بغیر بھی پورے دین کو نافذ اور جاری وساری کیا جا سکتا ہے تو یہ دعوے بلا دلیل اور بے بنیاد ہے۔ اگر بات
یہی ہے تو پھر وہ رسول اکرم ﷺ کی مدنی زندگی اور ہجرتِ مدینہ کے بعد کی اسلامی سرگرمیوں کو کس مفہوم کا جامہ پہنائیں گے
جبکہ حقیقت یہ ہے کہ حیاتِ رسولؐ ہیں۔[۲] جو "اقامت دین" کی عملی تصویر اور زندہ جاوید مثال ہے۔ اگر ایک طرف

۱۔ اشارہ ہے اس آیت کریمہ کی طرف۔ وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون۔ عبادت کی تشریح میں امام رازی نے تفسیر کبیر میں
لکھا ہے کہ عبادت نام ہے حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کا اور انہیں دونوں کی ادائیگی کا نام "اقامت دین" ہے۔

اشاعتِ اسلام کی تگ و دو، جد وجہد اور اسلامی اقدارِ حیات کو فروغ دینے کی سرگرمیاں ملتی ہیں تو دوسری طرف اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مرتب ہونے والے اخلاقی اصول اور قواعد وضوابط کے مطابق معاشرہ کی تعمیر اور تمدن، معاشرت، معیشت، قانون اور سیاست کے دائروں میں اسلامی نظامِ زندگی کی تعبیر کرنے کے لئے اسلامی ریاست کی تاسیس نظر آتی ہے۔ مکی دور اور مدنی دور میں بھی فرق ہے کہ اسلام ہجرت سے پہلے ایک مذہب تھا مگر ہجرت کے بعد مذہب ریاست بن گیا۔ مکی دور دعوتِ پیغام کا دور تھا اور مدنی دور غلبے کا۔ ہجرت سے پہلے ایمانیات وعقائد اور بعض عبادات ہی کا نام اسلام تھا مگر ہجرت کے مدنی دور میں اسلام کی تکمیل جملہ عبادات، معاملات، حدود اور معاشرت ومعیشت کے اصول وضوابط سے ہوئی اور شاید معاملات وحدود اور معاشرت ومعیشت کے احکامات کی ہجرت کے بعد فرضیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اسلامی ریاست کے قائم ہوئے بغیر ان اوامر واحکام پر پورے طور سے عمل نہ ہو سکتا تھا ہجرت سے پہلے اسلام اور مسلمان کمزور تھے انہیں اپنے افکار وعقائد کو بھی دوسروں تک پہنچانے کی پوری طرح اجازت نہ تھی نماز جیسی اہم عبادت بھی وہ چھپ کر ادا کرتے تھے تلاوت قرآن زور سے نہ کر سکتے تھے مگر ہجرت کے بعد اور اسلامی ریاست قائم اور مستحکم ہو جانے کے بعد وہ برملا اسلام کا اعلان کرتے تھے قیصر وکسریٰ کے دربار میں جاکر اسلام کی دعوت پیش کرتے تھے اور "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" کے فریضہ کو بلا کسی روک ٹوک کے سرانجام دیتے تھے۔ شاید اسی لئے مکی دور کے تیرہ سالہ عرصہ میں اسلام کی جتنی اشاعت وتبلیغ ہوئی اس سے کہیں زیادہ مدنی دور کے دس سالہ عرصے میں ہوئی۔

اسلام ہجرت سے پہلے۔ مکی دور میں اسلام کو ان تمام مراحل سے گزرنا پڑا جن سے دعوت حق کو گزرنا ناگزیر اور لابدی تھا اور جن سے گزر کر ہی دین کی اقامت کی جا سکتی تھی مکی زندگی کا اگر ہم تجزیاتی مطالعہ کریں تو اسے چار ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) آغاز بعثت سے دعوتِ عام تک (مدت تین سال) (۲) دعوت عام سے آغاز ظلم وستم تک (مدت ۲ سال)
(۳) آغاز ظلم وستم سے عام الحزن تک (مدت پانچ سال ۵) (۴) عام الحزن سے ہجرت تک مدت تین سال ۳

دعوتِ اسلامی اپنے ابتدائی دور میں پورے سکون کے ساتھ جاری رہی اور قریش نے اس دعوت کو چند سرپھرے نوجوانوں کا جنوں اور وسوسہ سمجھ کر اسے ناقابل اعتناء سمجھا اور شجرِ اسلام کونپلیں نکالتا ہوا تیزی سے پروان چڑھتا رہا یہاں تک کہ جب اسلام ایک محسوس طاقت بن گیا اور اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد بھی معتدبہ ہوگئی تو رسولِ اکرمؐ نے عام دعوت دینی شروع کر دی اور یہیں سے دعوتِ اسلامی کے دوسرے دور کا آغاز ہوتا ہے، جب مکے والے ہوش میں آتے ہیں اور انہیں صورت حال کا صحیح اندازہ ہوتا ہے تو وہ دیکھتے ہیں کہ اگر ان لوگوں کی مخالفت نہیں کی گئی تو جلد ہی وہ وقت آجائے گا جب ان سرداران مکہ کی شوکت وعظمت کا شیش محل ڈھیر ہو جائے۔ لہٰذا وہ مخالفت پر کمربستہ ہو جاتے ہیں

پھر دھیرے دھیرے ان کی مخالفت پہلے مزاحمت اور پھر استہزا و تضحیک، دشنام طرازیوں اور کٹ حجتیوں تک پہنچ جاتی ہے۔ شاعر، صابی، مجنوں، مسحور، ساحر، اور کاہن جیسے القاب تراشے جاتے ہیں جناب ابو طالب پر زور ڈال کر سمجھوتہ اور مصالحت کی کوشش کی جاتی ہے۔ حرص و طمع کا دام پھیلا کر اور مال و دولت جاہ و منصب، سیادت و قیادت اور حسن و جمال کی پیش کش کر کے دعوت میں تھوڑی سی ترمیم کی درخواست کی جاتی ہے مگر جب یہ سارے جتن کر کے بھی شکست کھاتے ہیں تو پھر آنکھیں بند کر کے اس دعوت کو کچلنے اور یک لخت ختم کر دینے میں اپنی پوری طاقت صرف کر دیتے ہیں اور یہیں سے دعوتِ اسلامی کا تیسرا نازک اور شدید آزمائش کا دور شروع ہو جاتا ہے جبیں دعوت اسلامی کو قبول کرنے کے "جرم" میں اصحابِ رسول کو اس قدر مظالم کا نشانہ بنایا گیا کہ ظلم و ستم کی تاریخ میں اس کا مثل تلاش کرنا محال ہے مگر یہ تمام مظالم، بے رحمیاں، سفاکیاں کسی ایک مسلمان کو بھی راہِ حق سے متزلزل نہ کر سکیں البتہ رسول اکرم ؐ کے ایما سے بہت سے صحابہ حبشہ کی طرف ہجرت کر جاتے ہیں مشرکین مکہ وہاں تک ان کا پیچھا کرتے ہیں مگر جب بری طرح ناکام رہتے ہیں تو اس کا ردِ عمل یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مکہ کے بچے کھچے مسلمانوں پر مزید مظالم کی بوچھار ہونے لگتی ہے۔ بنو ہاشم کا بائیکاٹ کر دیا جاتا ہے اور ان سے ہر قسم کے تعلقات منقطع کر لیے جاتے ہیں جس کی وجہ سے رسول اکرم ؐ کے ساتھ بنو ہاشم کو بھی شعب ابی طالب میں محصور رہ کر کئی سال انتہائی کرب انگیز حالات میں گزارنے پڑتے ہیں۔ آخر تین سال کی طویل مدت کے بعد کچھ ہمدردوں کی وجہ سے اس مصیبت سے نجات ملتی ہے مگر اس کے معاً بعد آنحضرت ؐ دو عظیم مادی سہاروں (جناب ابو طالب اور حضرت خدیجہ ؓ) سے محروم ہو جاتے ہیں اور یہیں سے مکی دور کے آخری اور شدید ترین دور کی ابتدا ہوتی ہے اور رسول اکرم ؐ اور آپ ؐ کے اصحاب پر ہونے والے مظالم و شدائد اپنے عروج پر پہنچ جاتے ہیں حتیٰ کہ اہلِ مکہ میں ذرا سی بھی انسانی یا اخلاقی رمق باقی نہ رہ گئی تو انسانیت کا خیر خواہ ؐ طائف کا رخ کرتا ہے تاکہ وہاں کے لوگوں تک دعوت پہنچا سکے مگر طائف نے اپنے آپ کو مکہ سے بڑھ کر محروم ثابت کیا قریش کی جارحانہ اور تشدد پسندانہ کارروائی اور طائف کے سنگ دلانہ رویہ سے اندازہ ہو گیا کہ اب وہاں انسانیت و اخلاق کی کوئی رمق باقی نہیں رہی ہے۔ اور اب وہ وقت آ گیا ہے کہ تاریخ ایک نیا رخ اختیار کرے اور قدرت حق و باطل کا فیصلہ کر دے اس لئے ہجرت کا عظیم مرحلہ پیش آتا ہے جو ایمان و اخلاص کا ایک سخت امتحان تھا مشرکین مکہ کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ مسلمان آہستہ آہستہ ہجرت کر کے مدینہ میں ایک جتھے کی صورت میں جمع ہو کر اور محمد ؐ کی قیادت میں منظم ہو کر ہمارے لئے پیغام شکست ثابت ہو سکتے ہیں اس لئے مستقبل کے اس عظیم خطرے کا سد باب کرنے کے لئے انہوں نے ہر طرح سے صحابہ کرام کو روکنا چاہا حتیٰ کہ رسول اکرم ؐ کے قتل کی بھی سازش کی مگر صحابہ کرام تمام قربانیاں دیتے ہوئے ہجرت کرتے رہے اور آخر میں رسول اکرم ؐ بھی خدا کی حفاظت میں مکہ کو خیر باد کہتے ہوئے مدینہ کی جانب روانہ ہو گئے اور اس طرح مکی زندگی کا آخری دور ختم ہوتا ہے اور مدنی دور شروع ہو جاتا ہے

اسلام ہجرت کے بعد۔ ہجرت کے بعد اسلام ایک نئے مرحلے میں داخل ہو گیا مکی دور میں تو اشاعتِ اسلام اور اخلاقی تربیت ہی اصل کام تھا مگر ہجرت کے بعد جب مختلف قبائل ایک مرکز میں جمع ہو گئے اور ایک اسلامی ریاست کی تاسیس ہو گئی تو اب اسلامی اشاعت اور اخلاقی تربیت کے ساتھ یہ فریضہ بھی شامل ہو گیا کہ تمدن، معاشرت معیشت اور سیاست کے دائروں میں نئے نظامِ زندگی کو اسلام کی بنیادوں پر مستحکم کیا جائے۔

رسولِ اکرمؐ نے مدینہ پہنچ کر نظامِ مواخات قائم کیا اور قرب و جوار کے قبائل سے سیاسی معاہدات کیے جس سے ایک طرف مسلمانوں کے معاشی و معاشرتی مسائل حل ہو گئے دوسری طرف دفاعی پوزیشن بھی مستحکم ہو گئی مگر اس کے باوجود مدنی دور میں دعوتِ اسلامی کو جس قدر مخالف طاقتوں کی ریشہ دوانیوں، سازشوں مخالفتوں اور مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑا وہ مکی دور سے کہیں زیادہ خطرناک تھیں ایک طرف تو پورا عرب اس کا استیصال کر دینے پر تلا ہوا تھا اور دوسری طرف مدینہ کے یہود تھے جو مارِ آستین بن کر مسلمانوں اور اسلامی ریاست کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے اور مناظرانہ سوالات، مضحکہ خیز مطالبات، مفسدانہ پروپیگنڈے کی شرانگیزیوں اور رخنہ اندازیوں اور غداریوں کے ذریعہ اسلامی دعوت و ریاست کو زک پہنچانے کی کوشش کر رہے تھے اس لیے اب اس مٹھی بھر جماعت کی کامیابی ہی نہیں بلکہ اس کے وجود و بقا کا انحصار بھی اس بات پر تھا کہ۔

اولاً وہ پورے جوش و خروش کے ساتھ اپنے مسلک کی تبلیغ کر کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنا ہم عقیدہ بنانے کی کوشش کرے ثانیاً وہ مخالفین کا برسرِ باطل ہونا اس طرح ثابت و مبرھن کر دے کہ کسی ذی عقل کو اس میں شبہ نہ رہے ثالثاً بے خانماں ہونے اور تمام ملک کی عداوت و مزاحمت سے دوچار ہونے کی بنا پر فقر و فاقہ اور ہمہ وقت بے امنی اور بے اطمینانی کی جو حالت ان پر طاری ہو گئی تھی اور جن خطرات میں وہ چاروں طرف سے گھر گئے تھے ان میں وہ ہراساں نہ ہوں بلکہ پورے صبر و ثبات کے ساتھ ان حالات کا مقابلہ کریں اور اپنے عزم میں ذرا تزلزل نہ آنے دیں۔ رابعاً وہ پوری دلیری کے ساتھ ہر اس مسلح مزاحمت کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو جائیں جو ان کی دعوت کو ناکام کرنے کے لئے کسی طاقت کی طرف سے کی جائے اور اس بات کی ذرا پرواہ نہ کریں کہ مخالفین کی تعداد اور ان کی مادی طاقت کتنی زیادہ ہے خامساً۔ ان میں اتنی ہمت پیدا کی جائے کہ عرب کے لوگ اگر اس نئے نظام کو اسلام قائم کرنا اور کسی بہمائش سے قبول نہ کریں تو کوئی جاہلیت کے فاسد نظامِ زندگی کو بزور مٹانے میں دشواری نہ ہو۔ نبی اکرمؐ کی مدنی زندگی ان پانچ تقاضوں کو بحسن و خوبی ادا کرنے ہی کا نام ہے۔[1]

ان پانچوں امور کی ادائیگی میں اسلامی ریاست نے جو عظیم کردار ادا کیا وہ ایک معجزے سے کم نہیں اسلامی ریاست قائم اسلام کی جس تیز رفتاری اور سرعت کے ساتھ اشاعت و تبلیغ ہوئی اس کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف دس سال کے بعد حجۃ الوداع کے موقع پر ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر رسولِ اکرمؐ کے ہم رکاب تھا دوسرے یہ کہ اسلامی ریاست نے معاشرت و معیشت اور حدود و قوانین اور ضوابط مقرر کر کے معاشرہ کو اتنا صاف ستھرا

---

[1] سیرتِ ختم الرسل از مولانا مودودی ص ۶۲-۶۳

اور پاکیزہ بنا دیا تھا اور ایک ایسی مستقل تہذیب کو وجود بخشا تھا جو نظام زندگی میں اپنی ایک امتیازی شان رکھتی تھی جس کے علاوہ انہوں نے ان تمام مخالف و مزاحم طاقتوں کا جو اسلامی ریاست کا استیصال کرنے پر تلی ہوئی تھیں اور اس کے دفتر کو ڈائنامیٹ ڈھلانے کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں میں مصروف تھیں ایسا زبردست مقابلہ کیا اور شکست فاش دی کہ اسلامی ریاست کی اپنی حیثیت مستحکم ہو گئی۔ یہود مدینہ اور مشرکین مکہ کی سازشوں سے میدانِ بدر میں جب حق و باطل کی طاقتیں آپس میں ٹکرائیں اور حق کو "فتح مبین" حاصل ہوئی اور باطل کو منہ کی کھانی پڑی اسی وقت سے اسلام اور اسلامی ریاست نے لوگوں کے دلوں کو مرعوب کر لیا تھا پھر میدانِ احد میں جب ایک غلطی کی وجہ سے مسلمانوں کی فتح شکست سے بدل گئی اور قریب تھا کہ اسلامی ریاست کی ساکھ کمزور ہو جائے لیکن جنگ کے بعد بھی جب دور تک اسلامی لشکر نے کفار کا پیچھا کیا تو لوگوں کو اندازہ ہو گیا کہ اس طاقت کو دبانا کوئی کارِ آسان نہیں۔ پھر جب غزوۂ احزاب کی صورت میں اسلام کو دبانے کی کوشش میں سارے عرب نے اپنا پورا زور لگا دیا مگر اس کے باوجود ناکام ہوئے تو اہلِ عرب کو اس امر میں ذرا سا بھی شک و شبہ باقی نہ رہا کہ اسلامی تحریک اب کسی کے مٹائے مٹ نہیں سکتی۔ اسلام محض چند عقائد و عبادات کا ہی مجموعہ نہیں بلکہ وہ ایک ریاست ہے اور مسلمان اتنی عظیم قوت و طاقت کے مالک ہو چکے ہیں کہ وہ اپنے مسلک پر بلا کسی روک ٹوک کے عمل پیرا ہو سکتے ہیں۔

مسلمان جس مسلسل کشمکش میں الجھے ہوئے تھے صلح حدیبیہ کے بعد جب اس سے مامون ہو گئے تو انہوں نے اسلام کی اشاعت میں اتنی سرگرمیاں دکھائی اور اسلام کا دائرہ اتنا وسیع ہوا کہ اس سے قبل نہ ہوا تھا اس کے بعد فتح خیبر اور پھر فتح مکہ نے اہلِ باطل کی رہی سہی ساکھ بھی کمزور کر دی اور ان کی کمر توڑ دی اور اسلام کی حقانیت، فوقیت اور ابدیت میں شبہ نہ رہا تو یدخلون فی دین اللّٰہ افواجا کا سماں بندھ گیا۔

ہجرت کے بعد اسلام اسی طرح اسلامی ریاست کے زیرِ سایۂ عاطفت پروان چڑھتا رہا اور مخالفین سے اپنی قوت و طاقت اور فوقیت تسلیم کراتا رہا اور مسلمان "اقامت دین" کا فریضہ ادا کرتے رہے یہاں تک کہ حجۃ الوداع کے موقع پر تکمیلِ اسلام اتمام نعمت اور ابدیت دین کا اعلان کر دیا گیا۔ الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا

اسلام کے اس مطالعے اور مکی و مدنی دور کے اس تجزیہ سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی ہے کہ اسلام محض چند ایمانیات و عبادات ہی کا مجموعہ نہیں بلکہ وہ ایک نظامِ زندگی ہے جو حیات انسانی کے جملہ شعبوں میں رہنمائی کرتا ہے اور اسلام کے ان تمام احکامات و فرامین کو نافذ کرنا ایک مومن کا مقصد ہونا چاہیے۔ اسلام کی اشاعت و تبلیغ اور اسلام کو پورے طور پر جاری و ساری کرنے کے لئے اسلامی حکومت و ریاست کا قیام مناسب ہی نہیں بلکہ بہت اہم ہے اور ضروری ہے اور اس کے لئے ہر مومن کو انفرادی اور اجتماعی طور پر اور ہر تحریک و جماعت کو کمر بستہ ہونا چاہیئے اسلام کا امت مسلمہ سے یہی مطالبہ ہے۔

قرآن امت مسلمہ کو مخاطب کر کے اعلان کرتا ہے۔ ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر و یامرون بالمعروف و ینھون عن المنکر و اولئک ھم المفلحون۔ وما علینا الا البلاغ

1

تبصرۂ کتب

نام کتاب ـــــــ محفلے دیدم

مرتب ـــــــ سید انیس شاہ جیلانی۔ محمد آباد تحصیل صادق آباد (پاکستان)

نوعیت ـــــــ یکے از مطبوعات حیرت شملوی مرحوم و مغفور

ضخامت ـــــــ ۲۵۰ صفحات ـــــــ قیمت درج نہیں ہے

ناشر ـــــــ حیرت شملوی اکادمی محمد آباد ضلع رحیم یار خاں

ملنے کا پتہ ـــــــ ملت بک ڈپو ریلوے روڈ رحیم یار خاں۔

مردہ پرستی نہ جانے کیوں اور کس طرح ہماری توحید پرست قوم کی روایت بن گئی ہے۔ قوم کا کوئی بطل جلیل خواہ وہ زندگی کے کسی شعبے سے تعلق رکھتا ہو جب تک زندہ رہتا ہے ہم اسے گھر کی مرغی دال برابر سمجھنے سے بھی گریز کرتے ہیں اور اس پر طنز و تشنیع کے ایسے ایسے تیر برساتے ہیں۔ ایسے ایسے ناوک چلاتے ہیں کہ اس بطل جلیل کی عظمت لہو لہان اور بمصداق پنبہ کجا کجا نہم زخم خوردہ ہو جاتی ہے۔ لیکن یہی بطل جلیل خود اپنے نکھوتوں، پوتوں کے زخم کھا کھا کر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جب پیوندِ خاک ہو جاتا ہے تو رگ حمیت ہماری پھڑکتی ہے اور غیرتِ خوابیدہ جاگ جاتی ہے اور ہم اچانک مرحوم کی عظمتوں کے ڈنکے بجانے لگتے ہیں۔ اس کی بڑائی اور برگزیدگی کے ملہار گانے لگتے ہیں، اور پھر آبدیدہ و دل گرفتہ ہو کر مرزا غالب کی زبان میں اپنے آپ سے اور اپنے احساسات سے مخاطب ہو کر بطرز استفہام شعر گنگناتے ہیں۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم

تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے۔

حیرت شملوی مرحوم کی علمی و ادبی عظمت سے متعلق زیر نظر کتاب بھی ایک ایسی ہی کاوش اور اسی روایتی مردہ پرستی کی ایک اندوہناک مثال ہے۔ حیرت شملوی مرحوم اپنی ذات میں پیکر علم و فضل اور مشرقی تہذیب و وضع داری میں بجائے خود ایک انجمن تھے اور اپنے دور کے علمی و ادبی اکابرین میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ منقسم و غیر منقسم ہندوستان کے ہم عصر اکابرین سے تعارف و وابستگی کے باعث ان کو اس کا موقعہ ملا کہ وہ ان اکابر وا نامنل کی سیرت و کردار کے بلند و پست خوب و ناخوب کا قریب سے مطالعہ کریں۔ اس مطالعے نے ان کے قلبِ حساس و دیدۂ بینا کو یہ حوصلہ عطا کیا کہ اپنے خاص انداز میں ان تاثرات کو سپرد قرطاس کریں۔ ان کی یہ تحریریں ہماری ثقافتی تاریخ کا ایک قابل قدر حصہ ہیں اور اس لحاظ سے قابلِ مطالعہ و لائق حوالہ ہیں

حیرت شملوی گو پختہ خیالی اور پختہ نگاری کے معروج پر پہنچے تو فالج نے آلیا طویل عرصے تک مفلوج معذور رہے تاہم فطری زندہ دلی اور بذلہ سنجی میں اس وقت بھی فرق نہیں آیا۔ جب وہ ملک الموت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زندگی کی صعوبتوں پر خندہ زن اور اپنی ابدی زندگی کے آغاز پر خندہ لب تھے۔ ہنستے بولتے ہوئے اپنے خالق کی طلبی پر وہ اس کے روبرو پیش ہوئے۔ اور اسی شیوۂ تسلیم و رضا کے صلے میں اہل نظر میں مقبولیت پائی

زیر تبصرہ کتاب میں ان کے ایک مداح اور مقرب قدر شناس جناب سید انیس شاہ جیلانی نے ان کی تحریروں خطوط و ملفوظات کو یکجا کر کے شائع کیا ہے جس سے حیرت شملوی مرحوم کی ان عظمتوں کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے جو اب شاید فضا میں بکھر جانے والا ایک مشتِ غبار ہے۔ اور بس انیس شاہ جیلانی صاحب کی یہ ارادت مندی حضرت شملوی مرحوم سے بڑی قابلِ قدر اور مستحسن ہے خدا کرے ان کی یہ کاوش عنداللہ ماجور ہو۔ اور ہند و پاک کا وہ علمی طبقہ جس کو مرحوم نے فیضانِ علمی سے استفادے کا موقعہ ملا تھا اس کو شاہ صاحب کی اس سعیٔ مشکور سے حیرت مرحوم کے شعری اور ادبی کمالات کی تحقیق کی طرف قرار واقعی توجہ پیدا ہو۔

محفلے دیدم کی کتابت و طباعت میں یا تعجلت کی بنا پر یا پھر سرمائے کے باعث بڑی خامیاں رہ گئی ہیں۔ جس سے کتاب کی افادیت مجروح ہوتی ہے۔ خدا کرے طبع ثانی میں ان کی اصلاح ہو جائے۔ اپنے موضوع اور اہمیت کے اعتبار سے "محفلے دیدم" یقیناً ایک مفید اور دلپذیر کتاب ہے۔ (ا۔ح)

۲

ڈاکٹر موریس بوکائی فرانس کے ایک فاضل مستشرق ہیں مذہباً ابھی تک عیسائی ہیں۔ لیکن آسمانی کتابوں سے عجیب شغف رکھتے ہیں۔ کتابِ مقدس (بائبل) سے تو انہیں فطری طور پر شغف ہونا چاہیئے تھا لیکن اللہ کی بخشی ہوئی توفیق نے ان کو مطالعۂ قرآن پر بھی ابھارا تو اسے سمجھنے کے لئے عربی ممالک میں جا کر برسوں عربی زبان کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ قرآن کا انہوں نے گہرا مطالعہ کیا۔ سراسر غیر جذباتی، غیر جانبداری اور مکمل معروضی (Objective) انداز سے مطالعہ کیا پھر ایک کتاب لکھی جس کا انگریزی اور اردو ترجمہ بھی ہو گیا ہے اس کا نام "بائبل قرآن اور سائنس" ہے،

ہمارے لائق و فاضل دوست جناب سید حسنین کاظمی صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر بوکائی کی کتاب کا مطالعہ بھی معروضی ہی انداز سے کیا اور اپنے تاثرات کو راہ و روشنی کی شکل میں شائع کیا ہے ڈاکٹر بوکائی کے خیالات کو درج کرنے سے پہلے اپنے تائیدی تصورات کو بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے۔ گویا بوکائی کے مطالعے کے ساتھ اپنا مطالعہ بھی شامل کر دیا ہے جو بوکائی پر تبصرہ بھی ہے اور بیک وقت جامد قدامت پرستوں اور کج فہم آزاد خیالوں دونوں کے لئے مصلحانہ انتباہ بھی ہے بوکائی کے مطالعہ کا حاصل تو یہ ہے کہ "عقل، علم، تجربے اور سائنس کی کسوٹی پر بائبل پوری نہیں اترتی مگر قرآن پورا اترتا ہے اور یہ انسانی کلام نہیں ہو سکتا یہ آسمانی ہی کلام ہے"۔ بوکائی کی عبارتوں کے پہلو بہ پہلو فاضل مؤلف نے جو اپنے تائیدی خیالات بیان کئے ہیں ان سے عیاں ہے کہ انہوں نے خود بھی قرآن کا مطالعہ اسی انداز سے کیا ہے اور اپنے مطالعہ کے ماحصل کو کلام اقبال اور دوسرے غیر مسلم فلاسفہ کے نظریات سے ہم آہنگ کیا ہے۔

کتاب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ فاضل مولف کا اسلام اور قرآن پر پکا ایمان ہے اور ترقی پسند ہونے کے باوجود بے دینی سے سے متنفر ہیں وہ ایک طرف ان نوخیزوں کے مقابلے پر آتے ہیں جو بے دینی کی طرف مائل ہیں اور دوسری طرف اس جمود پسند طبقے کو جھنجھوڑتے ہیں جو روایتی مذہب سے ایک اپنچ بھی ہٹنے کو تیار نہیں۔ اس سلسلے میں کتاب کا دسواں، گیارہواں اور بارہواں باب پڑھنے کے قابل ہے۔

نقش ثانی نقش اوّل سے بہتر ہوا کرتا ہے اس لیئے ہمیں یقین ہے کہ آئندہ طباعت میں فاضل مولف اس کی زبان کو زیادہ سے زیادہ سہل اور صحیح بنانے میں کامیاب ہوں گے۔

ہماری رائے اگر مانی جائے تو ہم یہ کہیں گے کہ اس کتاب کو نصاب میں داخل کر لیا جائے ورنہ کم از کم ان ضمنی و ذیلی کتب میں اسے شامل کر کر لیا جائے جن کا مطالعہ درسی کتابوں کے ساتھ ضروری ہوتا ہے۔

فاضل مصنف نے اس کتاب میں بڑے سلیقے سے جا بجا یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ قرآن کے نئے نئے معارف و حقائق کھلنے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ گذشتہ لوگ قرآن کو نہیں سمجھ سکے اور آج کے لوگ سمجھنے لگے ہیں یہ بات نہیں بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ قرآن فہمی کی جو کوشش گذشتہ اہل علم نے کی ہے اسی کو ہر دور کے لوگ آگے بڑھاتے چلے گئے اور آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اگر دیوار بناتے ہوئے ایک شخص ایک اینٹ رکھتا ہے اور دوسرا دوسری تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ پہلی اینٹ غلط رکھی تھی اور دوسری صحیح رکھی گئی ہے ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری اینٹ رکھنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ پہلی اینٹ رکھنے والے ہی کے کام کو آگے بڑھایا جا رہا ہے۔ ——— جعفر شاہ

روح انتخاب

یہ شہادت جس کی ذمہ داری آپ پر ڈالی گئی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ جو حق آپ کے پاس آیا ہے جو صداقت آپ پر منکشف کی گئی ہے اور انسان کے لئے فلاح و نجات کی جو راہ آپ کو دکھائی گئی ہے آپ دنیا کے سامنے اس کے حق و صداقت ہونے پر گواہی دیں۔ ایسی گواہی جو اس کے حق و راست ہونے کو مبرہن کر دے اور دنیا کے لوگوں پر دین کی حجت پوری کر دے یہ شہادت دو ہی طرح کی ہو سکتی ہے ایک قولی شہادت، دوسرے عملی شہادت۔ قولی شہادت کی صورت یہ ہے کہ ہم زبان اور قلم سے دنیا پر اس حق کو واضح کریں جو انبیاءؑ کے ذریعہ ہمیں پہنچا ہے۔

فکر و اعتقاد میں، اخلاق و سیرت میں، تمدن و معاشرت میں کسب معاش اور لین دین، قانون اور نظام عدالت میں، سیاست اور تدبیر مملکت میں اور بین الانسانی معاملات کے دوسرے پہلوؤں میں اس دین نے انسان کی رہنمائی کے لئے جو کچھ پیش کیا اسے ہم خوب کھول کھول کر بیان کریں، دلائل اور شواہد سے اس کا حق ہونا ثابت کریں، اور جو کچھ اس کے خلاف ہے اس پر معقول تنقید کر کے بتائیں کہ اس میں کیا خرابی ہے۔ اس قولی شہادت کا حق ادا نہیں ہو سکتا جب تک اُمت مجموعی طور پر ہدایت خلق کے لئے اسی طرح فکر مند نہ ہو جس طرح انبیاء علیہم السلام انفرادی طور پر اس کے لئے فکر مند رہا کرتے تھے۔ یہ حق ادا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ یہ کام ہماری تمام اجتماعی کوششوں اور قومی سعی و جد و جہد کا مرکزی نقطہ ہو ہم اپنے دل و دماغ کی ساری قوتیں اور اپنے وسائل و ذرائع اس پر لگا دیں۔ ہمارے تمام کاموں میں یہ مقصد لازماً ملحوظ رہے اور ہم اپنے درمیان سے کسی ایسی آواز کے اٹھنے کو تو کسی حال میں برداشت ہی نہ کریں جو حق کے خلاف شہادت دینے والی ہو۔

رہی عملی شہادت، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی میں ان اصولوں کا مظاہرہ کریں جن کو ہم حق کہتے ہیں، دنیا صرف ہماری زبان ہی سے ان کی صداقت کا ذکر نہ سنے بلکہ خود اپنی آنکھوں سے ہماری زندگی میں ان کی خوبیوں اور برکتوں کا مشاہدہ کرے۔ وہ ہمارے برتاؤ میں اس شیرینی کا ذائقہ چکھ لے جو ایمان کی حلاوت سے انسان کے اخلاق و معاملات میں پیدا ہوتی پیدا ہوتی ہے وہ خود دیکھ لے کہ اس دین کی رہنمائی کیسے اچھے انسان بنتے ہیں، کیسی عادل سوسائٹی تیار ہوتی ہے، کیسی صالح معاشرت وجود میں آتی ہے، کس قدر ستھرا اور پاکیزہ تمدن پیدا ہوتا ہے کیسے صحیح خطوط پر علوم و ادب اور فنون کا نشو و نما ہوتا ہے کیسا منصفانہ، ہمدردانہ اور بے نزاع معاشی نظام رونما ہوتا ہے اور اجتماعی و انفرادی زندگی کا ہر پہلو کس طرح سدھر جاتا ہے، سنور جاتا ہے اور بھلائیوں سے مالا مال ہو جاتا ہے اس شہادت کا حق صرف اس طرح ادا ہو سکتا ہے کہ ہم فرداً بھی اور قومی حیثیت سے بھی اپنے دین کی حقانیت پر مجسم شہادت بن جائیں ہمارے افراد کا کردار اس کی صداقت کا ثبوت دے اور ہم سے جہاں اور جس حیثیت سے بھی کسی شخص یا قوم کو سابقہ پیش آئے وہ ہمارے شخصی اور قومی کردار میں اس بات کا ثبوت پالے کہ جن اصولوں کو ہم حق کہتے رہیں وہ واقعی حق ہیں۔ اور ان سے فی الواقع انسانی زندگی اصلح اور علی وارفع ہو جاتی ہے۔ پھر یہ بھی عرض کر دوں کہ اس شہادت کی تکمیل اگر ہو سکتی ہے تو صرف اس وقت جبکہ ایک اسٹیٹ انہی اصولوں پر قائم ہو جائے اور وہ پورے دین کو عمل میں لا کر اپنے عدل و انصاف سے اپنے اصلاحی پروگرام سے، اپنے حسن انتظام سے اپنے باشندوں کی فلاح و بہبود سے، اپنے حکمرانوں کی نیک سیرت سے، اپنی صالح داخلی سیاست سے، اپنی راست بازانہ خارجی پالیسی سے، اپنی شریفانہ جنگ سے اور اپنی وفادارانہ صلح سے ساری دنیا کے سامنے اس بات کی شہادت دے کہ جس دین نے اس اسٹیٹ کو جنم دیا ہے وہ درحقیقت انسانی فلاح کا ضامن ہے اور اس کی پیروی میں نوع انسانی کی بھلائی ہے یہ شہادت قولی شہادت کے ساتھ مل جائے تب وہ ذمہ داری پوری ادا ہو جاتی ہے جو امت مسلمہ پر ڈالی گئی ہے۔ (۱۰ اردسمبر ۱۹۵۹ء کو جدہ ریڈیو سے نشر ہونے والے انٹرویو کا اقتباس

یہ مسرت
دائم و قائم رہے
ان صاحب کی طرح
کچھ عرصہ بچائیے ہمیشہ کمائیے
نیشنل بینک آف پاکستان
قومی ترقی
قومی بینک

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ
شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ۙ
وَّدَاعِیًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ۝
پارہ ۲۲ سورہ الاحزاب رکوع ۶ آیت ۴۵، ۴۶
O Prophet! truly We have sent thee
as a Witness, a Bearer of glad
tidings, and a Warner, and as
one who invites to Allah's (Grace)
by his leave and a lamp
Spreading light.
Karachi Port Trust
The Port of Pakistan
KARACHI
POSTAGE

بانی: ماہر القادریؒ

ماہنامہ

فاران

مدیر:
اسمٰعیل احمد مینائی

۲۱۸، بہادر آباد، کراچی

(ٹیلیفون ۴۱۶۴۱۲)

بانی مولانا ماہر القادری

ماہنامہ **فاران** کراچی

رجسٹرڈ ایس نمبر ۱۲۶۲

نومبر سنہ ۱۹۸۱ء

جلد نمبر ۳۳

شمارہ نمبر ۲

ایڈیٹر

اسمٰعیل احمد مینائی

قیمت فی پرچہ ۵ روپے

چندہ سالانہ ۵۰ روپے

پبلشر اسمٰعیل احمد مینائی

دفتر: ماہنامہ فاران نمبر ۲۱۸ بہادر آباد کراچی

فاران کا تازہ شمارہ اور پرانے شمارے صدر ریگل کے بک اسٹالوں پر دستیاب ہیں۔ مینجر

اس شمارے میں

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافہ اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہوں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں

پبلشر اسمٰعیل احمد مینائی نے انجمن پریس کراچی سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ فاران نمبر ۲۱۸ بہادر آباد کراچی سے شائع کیا۔ فون نمبر ۴۱۲۳۱۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

یہ حقیقت تو دوست دشمن، مخالف موافق، مسلم غیر مسلم سب کو تسلیم ہے کہ دنیا بھر میں قرآن کریم سے زیادہ محفوظ کتاب کوئی نہیں ہے یعنی جو لوگ الہامی کتابوں کے قائل ہیں وہ بھی اس پر متفق ہیں کہ توریت، زبور، انجیل، وید، اوستا، بھگوت گیتا وغیرہم کے مقابلے میں قرآن، تاریخی، ماخذ ولی، روایتی، درایتی غرض ہر اعتبار سے بالکلیہ اور یکقلم معتبر و مستند ہے۔ اور جو طبقے خدا، آخرت، حشر و نشر حیات بعد ممات غرض سواد کے منکر ہیں وہ بھی اس کے تو بہر حال معترف ہیں کہ قرآن کو جس طرح نبی کریمؐ نے انسانوں تک پہنچایا تھا آج تک وہ بالکل اِسی طرح اُسی حالت میں، اسی ترتیب سے باقی اور محفوظ ہے یعنی اس میں زیر زبر مد و نقطہ، وقوف و معانقہ کی بھی تبدیلی عمل میں نہیں آئی ہے۔ اس لحاظ سے دین اسلام اور اس کے اوامر و نواہی، احکام و اصول کے ماخذ کی حیثیت سے قرآنِ کریم کا مرتبہ و مقام نہ صرف منفرد ہے بلکہ اولین و اعلیٰ بھی۔

قرآن کی اساسی تعلیم و تلقین سے یہ عقیدہ بھی ابھرتا ہے کہ رسولؐ کی اطاعت بمنزلہ اللہ کی اطاعت کے ہے۔ اور جو کچھ رسولؐ مسلمانوں کو دیتے ہیں وہ مسلمانوں کو برضا و بخوشی لے لینا اور تسلیم کر لینا چاہیے۔ ان واضح اور بالکل بے لاگ اور دو ٹوک ہدایات سے حدیث رسولؐ کا دین میں "حجتِ قطعی" ہونا مستنبط و مبرھن ہے۔ حدیث کی صحت کو آپ جتنا چاہیں اور جس طرح چاہیں جانچ لیں پرکھ لیں۔ راویوں کی ثقاہت و صداقت، نقاد خبر کی ہر پہلو سے تنقیح و تحقیق کر لیں لیکن فی نفسہٖ حدیث کے دین میں مثل و مانند قرآن ہونے سے جو منکر یا تذبذب ہے۔ وہ یقیناً ہدایت کے راستے سے بھٹک گیا ہے۔ حضرت معاذؓ کو یمن روانہ کرتے وقت رسول اللہؐ کے سوال و جواب کا بھی یہی منشا اور مراد ہے۔ کوئی مسلمان جس کے ضمیر میں ایمان کی ایک رمق بھی باقی ہے اس بدیہی ہدایت سے انکار و انحراف کی جرأت نہیں کر سکتا، اس لئے کلام اللہ کے ساتھ ساتھ احکامِ اسلامی کا دوسرا ماخذ حدیث ہے۔

یہاں تک بات بالکل صاف اور منقح ہے اور مسلمانوں کا کوئی گروہ کوئی مکتب فکر اس سیدھے، سچے، سلجھے ہوئے جادۂ عمل سے انحراف کی جرأت تو کجا تصور بھی نہیں کر سکتا ہے۔

لیکن جناب نبی کریمؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی بلکہ آپ کی آخری علالت کے دوران ہی ایسے مسائل پیدا ہو گئے جن میں رہبری اور رہنمائی کیلئے قرآن و حدیث کے باہمی تعلق پر اختلاف رائے برپا ہوا۔ اس خیر القرون دور میں یہ فتنہ پنپ نہ سکا اور مشرکین و منافقین کی تمام سازشیں ناکام و رائیگاں ہوئیں تو مفسد عناصر نے اپنی مساعی کا رُخ کشت و خوں کی جانب پھیر دیا۔

اور باہمی جنگ و جدل میں سینکڑوں ہزاروں صحابۂ کرام اور تابعین کی علمی و عملی رہنمائی اور قیادت سے ملت محروم ہو گئی!
اس نوبت پر فقہائے امت نے مضطرب عناصر کو سہارا دیا اور اپنی خداداد و بے مثال حکمت و ذہانت اصابت و خدانت
سے ان تمام پیچیدہ، نوخیز و ناگریز مسائل کو حل کر کے مسلمانوں کی رہنمائی کی۔ جنہوں نے بظاہر اسلام کی اشاعت و ترقی ترویج و تبلیغ
کا راستہ روک دیا تھا یہ اکابر جن کو امت آج بھی "آئمہ" کے معزز و محترم لقب سے یاد رکھتی ہے۔ فقہ اسلامی کے تیسرے عظیم
ماخذ یعنی "اجماع" کے بانی مبانی یا خالق تھے۔ "قیاس" دراصل اسی تیسرے ماخذ اجماع کا ایک "مستنبطہ" یا ضمیمہ ہے۔ اور
ان دونوں کی یعنی اجماع و قیاس کی بے اساس ہے حکمت و فراست مومن کی وہ صالحیت و صلاحیت جس کو عرفِ عام میں
اجتہاد کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اُمت جس اضطرار و ابتلا سے اسوقت دوچار تھی وہی دور تاریخ اسلام میں بار بار پلٹ کے آتا رہا ہے۔

بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں ۔ اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات

اور اسکی ترقی اور آگے بڑھنے کی جدوجہد کا راستہ روکتا رہا ہے اور آئمہ عظام کے تربیت یافتہ نفوس بھی لیکن ہر دور میں آگے
آتے رہے ہیں۔ اور اُمت کی ذہنی علمی اور روحانی قیادت کا حق ادا کرتے رہے ہیں اس سلسلے میں خلل تو بار بار پڑا ہے۔
تاخیر و تعویق تو متعدد بار ہوئی ہے لیکن مسدود یا مختتم یہ سلسلہ کبھی نہیں ہوا ہے۔

مگر اس وقت واقعے کے طور پر صورت حال یہ ہے کہ

؎ تین سو سال سے ہیں فکر کے میخانے بند۔ (اقبال)

اور اس طویل و صبر آزما محرومی کا واحد نہیں تو بڑا بلکہ بہت بڑا سبب ہے "دراجتہاد" کی قفل بندی۔

آج اُمتِ مسلمہ تاریخ عالم کے خطرناک ترین اور نازک ترین موڑ پر حیران و ششدر کھڑی ہے۔ اباحت والحاد
تشکیک و ارتداد، مزدکیت و ملوکیت، بے یقینی و بے علمی، نا اتفاقی و نفاق نے امت کو انتشار میں مبتلا کر دیا ہے۔ ہر طرف
نئے نئے فتنے سر اٹھا رہے ہیں۔ گمراہ کن تحریکیں جنم لے رہی ہیں۔ یہود و ہنود کا استیلا دونوں جوانب سے سارے عالم
اسلام کو چیلنج کر رہا ہے امریکہ مغرب سے برملا ان عناصر کی سرپرستی کر رہا ہے جو ملتِ مسلمہ کی توہین، تذلیل، تفریق کے درپے
ہیں تو سوویت یونین، مشرقی محاذ پر ان طاقتوں کا مؤید اور پشت پناہ بنا ہوا ہے۔ جو افریقہ، جنوبی ایشیا، اور
مشرق بعید کے علاقوں میں مسلمانوں کو پنپتے، بڑھتے۔ اور خوش حال و آزاد ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔
اور یہ سب کام دونوں فریق بڑی چابکدستی سے غایت ہوشیاری سے گہری چالبازی اور دھوکہ دہی سے، سازشی
لفو ذو نفاذ سے انجام دے رہے ہیں۔ اور برابر اپنے مقاصد اور عزائم میں کامیابی حاصل کرتے جا رہے ہیں۔
ملتِ اسلامیہ کے اہل علم و اہل فکر، ارباب سیف و اقتدار از مراکش تا ملائیشیا نہ علمی طور پر ملت کی ..... کامیابی
سے قیادت کرنے کی پوزیشن میں ہیں نہ عسکری صلاحیت رکھنے والی اسلامی سلطنتوں کی اور مملکتوں کو یہ قوت و قدرت حاصل ہے کہ
اجتماعی یا انفرادی طور پر یہ کہ وہ اس استیلا اس کے جلو میں جو ذلتیں جو شقاوت و سفاکی خونریزی و خواری مسلط کی
جا رہی ہے اس کا مقابلہ کر سکیں اور اس سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ حالات بہت سخت اور بڑے نازک ہیں لیکن اجتہاد و جہاد

کے دروازے بدستور اور برابر بند ہیں۔
"قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں۔ گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلۂ فرات

اسمٰعیل احمد مینائی

۲۷ نومبر ۱۹۸۱ء
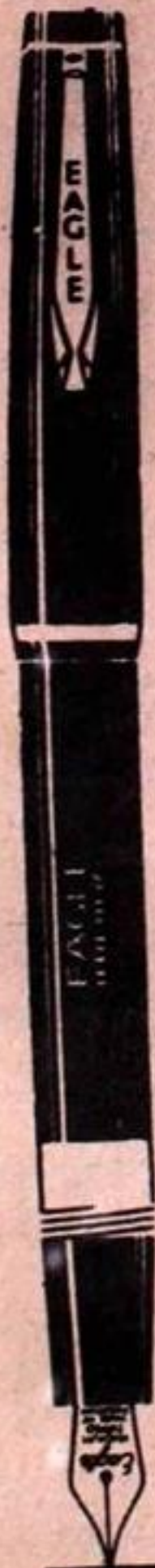
مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

۱/

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے

نومبر کا مہینہ اقبال کا مہینہ ہے۔ موجودہ حکومتِ پاکستان جو شہید ملت لیاقت علی خان مرحوم کی حکومت کے بعد صحیح معنے میں پہلی حکومت ہے جس کو نظریۂ پاکستان کی معرفت حاصل ہے اس نے بھی ۹ نومبر ۱۸۷۷ء (تاریخ پیدائش اقبالؒ) کی رعایت سے اسی مہینے کو ماہِ اقبال قرار دیا ہے

"فاران" ہر سال، اسی مہینے میں اقبال پر خصوصی مضامین شائع کرتا ہے ۱۹۷۹ء میں اسلوب احمد انصاری کا گرانقدر اور فاضلانہ مقالہ شائع کیا تھا۔ ۱۹۸۰ء میں یہ سعادت پروفیسر محمد منوّر کے حصے میں آئی۔ امسال ہیں نے یہ طے کیا کہ اقبال کے بارے میں ایسی کوئی تحریر پیش کی جائے۔ جو انہیں کے سے فکر و مزاج اور اُن کے مساوی یا بلند مرتبہ مسلمان، مفکر، مصنف، یا قائد کے مرقومات پر مبنی ہو خوش بختی سے مجھ کو دو مختصر لیکن بہت گرانقدر تحریریں دستیاب ہو گئیں۔

پہلی تحریر متکلم اسلام، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے جو وفاتِ اقبال کے چند ہی دن بعد قلمبند کی گئی۔ دوسرا مضمون دراصل محمد علی علوبہ پاشا (سابق سفیر مصر بہ پاکستان) کا وہ خطبۂ صدارت ہے جو اپریل ۱۹۷۹ء میں یوم اقبال کی تقریب کے موقعہ پر انہوں نے ارشاد فرمایا تھا۔

ع تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را، کی ملت کو آج پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے اس لیے بمصداق گاہے گاہے باز خواں، ایں قصۂ پارینہ را، دہ بھی، شاملِ اشاعت ہے۔ مدیرِ فاران

سب جانتے ہیں کہ اقبالؔ نے یہی مغربی تعلیم حاصل کی تھی جو ہمارے نوجوان انگریزی یونیورسٹیوں میں حاصل کرتے ہیں۔ یہی تاریخ، یہی اقتصادیات، یہی قانون اور یہی فلسفہ انہوں نے بھی پڑھا تھا۔ اور ان فنون میں بھی وہ مبتدی نہ تھے بلکہ منتہی، فارغ التحصیل تھے۔ خصوصاً فلسفہ میں تو ان کو امامت کا مرتبہ حاصل تھا۔ جس کا اعتراف موجودہ دور کے اکابر فلاسفر تک کر چکے ہیں جس شراب کے دو چار گھونٹ پی کر بہت سے لوگ بہکنے لگتے ہیں یہ مرحوم اس کے سمندر پئے بیٹھا تھا۔ پھر مغرب

اور اس کی تہذیب کو بھی اس نے محض ساحل پہ سے نہیں دیکھا تھا جس طرح ہمارے ۹۹ فی صدی نوجوان دیکھتے ہیں، بلکہ وہ اس دریا میں غوطہ لگا کر تہ تک اتر چکا تھا اور ان سب مرحلوں سے گزرا تھا جن میں پہنچ کر ہماری قوم کے ہزاروں نوجوان اپنے دین وایمان اپنے اصول تہذیب وتمدن اور اپنے قومی اخلاق کے مبادی تک سے برگشتہ ہوجاتے ہیں، حتیٰ کہ اپنی قومی زبان تک بولنے کے قابل نہیں رہتے۔

لیکن اس کے باوجود اس شخص کا کیا حال تھا؟ ۔ مغربی تعلیم وتہذیب کے سمندر میں قدم رکھتے وقت وہ جتنا مسلمان تھا اس کے منجدھار میں پہنچ کر اس سے زیادہ مسلمان پایا گیا۔ اس کی گہرائیوں میں جتنا اترتا گیا اتنا ہی زیادہ مسلمان ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی تہ میں جب پہنچا تو دنیا نے دیکھا کہ وہ قرآن میں گم ہو چکا ہے اور قرآن سے الگ اس کا کوئی فکری وجود باقی ہی نہیں رہا وہ جو کچھ سوچتا تھا قرآن کے دماغ سے سوچتا تھا۔ جو کچھ دیکھتا تھا قرآن کی نظر سے دیکھتا تھا۔ حقیقت اور قرآن اس کی نظر میں شئے واحد تھے۔ اور اس شئے واحد میں وہ اس طرح فنا ہو گیا تھا کہ اس دور کے علمائے دین میں بھی مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جو فنائیت فی القرآن میں اس امام فلسفہ اور اس ایم اے۔ پی ایچ ڈی۔ بار ایٹ لا سے لگا کھاتا ہو۔

حدیث کی جن باتوں پر نئے تعلیم یافتہ نہیں پرانے مولوی تک کان کھڑے کرتے ہیں اور پہلو بدل بدل کر تاویلیں کرنے لگتے ہیں۔ یہ ڈاکٹر آف فلاسفی ان کے ٹھیٹھ لفظی مفہوم پر ایمان رکھتا تھا اور ایسی کوئی حدیث سن کر ایک لمحہ کے لئے بھی اس کے دل میں شک کا گزر نہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک صاحب نے ان کے سامنے بڑے اچنبے کے انداز میں اس حدیث کا ذکر کیا، جس میں بیان ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اصحاب ثلاثہ کے ساتھ کوہ احد پر تشریف رکھتے تھے۔ اتنے میں احد لرزنے لگا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ ٹھہر جا! تیرے اوپر ایک نبی، ایک صدیق اور دو شہیدوں کے سوا کوئی نہیں ہے۔ اس پر پہاڑ ساکن ہو گیا اقبال نے حدیث سنتے ہی کہا کہ اس میں اچنبے کی کونسی بات ہے؟ میں اس کو استعارہ ومجاز نہیں بلکہ ایک مادی حقیقت سمجھتا ہوں، اور میرے نزدیک اس کے لئے کسی تاویل کی حاجت نہیں۔ اگر تم حقائق سے آگاہ ہوتے تو تمہیں معلوم ہوتا کہ ایک نبی کے نیچے آ کر مادے کے بڑے سے بڑے تودے بھی لرز اٹھتے ہیں۔

اسلامی شریعت کے جن احکام کو بہت سے روشن خیال حضرات فرسودہ اور بوسیدہ قوانین سمجھتے ہیں اور جن پر اعتقاد رکھنا ان کے نزدیک ایسی تاریک خیالی ہے کہ مہذب سوسائٹی میں ان کی تائید کرنا ایک تعلیم یافتہ آدمی کے لئے ڈوب مرنے سے زیادہ بدتر ہے، اقبال نہ صرف ان کو مانتا اور ان پر عمل کرتا تھا، بلکہ برملا ان کی حمایت کرتا تھا اور اس کو کسی کے سامنے ان کی تائید کرنے میں باک نہ تھا اس کی ایک معمولی مثال سن لیجئے۔ ایک مرتبہ حکومت ہند نے ان کو جنوبی افریقہ میں اپنا ایجنٹ بنا کر بھیجنا چاہا یہ عہدہ ان کے سامنے باقاعدہ پیش کیا گیا۔ مگر شرط یہ تھی کہ وہ اپنی بیوی کو پردہ نہ کرائیں گے اور سرکاری تقریبات میں لیڈی اقبال کو ساتھ لے کر شریک ہوا کریں گے اقبال نے اس شرط کے ساتھ یہ عہدہ قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا اور خود لارڈ ولنگڈن سے کہا کہ میں بے شک ایک گنہگار آدمی ہوں۔ احکام اسلامی کی پابندی میں بہت کوتاہیاں مجھ سے ہوتی ہیں مگر اتنی ذلت اختیار نہیں کر سکتا کہ محض آپ کا ایک عہدہ حاصل کرنے کے لئے شریعت کا حکم توڑ دوں۔

ان کی سادہ زندگی اور فقیرانہ طبیعت کے حالات ان کی وفات ہی کے بعد لوگوں میں شائع ہوئے ورنہ عام خیال یہ

تھا کہ جیسے "اڈ سر" صاحبان ہوتے ہیں ویسے وہ بھی ہوں گے، اور اسی بنا پر بہت سے لوگوں نے یہاں تک بلا تحقیق لکھ ڈالا کہ ان کی بارگاہِ عالی تک رسائی کہاں ہوتی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ شخص حقیقت میں اس سے زیادہ فقیر منش تھا جتنا اس کی وفات کے بعد لوگوں نے اخبارات میں بیان کیا ہے۔ ایک مرتبہ کا واقعہ سن لیجیے جس سے اس "نائٹ" اور بیرسٹر کی طبیعت کا آپ اندازہ کر سکیں گے۔ پنجاب کے ایک دولت مند رئیس نے ایک قانونی مشورے کے لئے اقبال اور سر فضل حسین مرحوم اور ایک دو اور مشہور قانون دان اصحاب کو اپنے ہاں بلایا، اور اپنی شاندار کوٹھی میں ان کے قیام کا انتظام کیا۔ رات کو جس وقت اقبال اپنے کمرے میں آرام کرنے کے لئے گئے تو ہر طرف عیش و تنعم کے سامان دیکھ کر اور اپنے نیچے نہایت نرم اور قیمتی بستر پا کر معاً ان کے دل میں خیال آیا کہ جس رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی جوتیوں کے صدقے میں آج ہم کو یہ مرتبے نصیب ہوئے ہیں اس نے بوریے پر سو سو کر زندگی گزاری تھی۔ یہ خیال آنا تھا کہ آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی۔ اس بستر پر لیٹنا ان کے لئے ناممکن ہو گیا اٹھے اور برابر کے غسل خانے میں جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور مسلسل رونا شروع کر دیا۔ جب ذرا دل کو قرار ہوا تو اپنے ملازم کو بلا کر اپنا بستر کھلوایا، اور ایک چارپائی اس غسل خانے میں بچھوائی اور جب تک وہاں مقیم رہے غسل خانے ہی میں سوتے رہے۔ یہ وفات سے کئی برس پہلے کا واقعہ ہے جب باہر کی دنیا ان کو سوٹ بوٹ میں دیکھا کرتی تھی، کسی کو خبر نہ تھی کہ اس سوٹ کے اندر جو شخص چھپا ہوا ہے اس کی اصلی شخصیت کیا ہے۔

محمد علی علوبہ پاشا

اقبال

علامہ اقبال مرحوم سے میری پہلی ملاقات آج سے بیس سال قبل بیت المقدس میں ہوئی تھی یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ہم دونوں موتمر اسلامی میں نمائندہ ہونے کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے۔ یہ موتمر فلسطین کی حفاظت اور دفاع کے مسئلے پر غور کرنے کے لئے منعقد ہوئی تھی۔ مرحوم کے نام نامی سے میں پہلے ہی واقف ہو چکا تھا۔ کیونکہ عربی ممالک میں اقبال ایک فلسفی شاعر اور مفکر اسلام کی حیثیت سے کافی مشہور ہو چکے تھے، ڈاکٹر اقبال کے متعلق میری معلومات بس اسی قدر تھیں۔ کیونکہ مرحوم کی شاعری کو جو کہ ان کے افکار خیالات، حکمت و موعظت کی آئینہ دار ہے اور اردو یا فارسی زبان کے قالب میں تھی سمجھنے سے قاصر تھا اقبال کی شاعرانہ عظمت کو سمجھنے اور ان کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے کے لئے وہ معلومات کافی نہ تھے جو عرب ممالک کے علم دوست حضرات تک پہنچتے تھے۔ ڈاکٹر اقبال کے فلسفہ و حکمت کے انمول موتی بازارِ مصر میں گوہر نایاب تھے اور اقبال کی شاعرانہ عظمت اور ان کے پیام کو سمجھنے کے لئے ان کے تمام افکار کا مطالعہ ناگزیر تھا۔ نیز ان کی شاعری کی تحلیل اور اس کے وسیع مطالعے کے بعد ہی اس کے متعلق صحیح فیصلہ کیا جاسکتا تھا کہ اقبال کی شاعری محض عشق و محبت اور مناظر طبعی کی محاکات کا ایک دلکش گلدستہ ہے یا مدح و ستائش، ہجو و مذمت، شجاعت و لبالت کے وہی پامال مضامین ہیں جو دوسرے شعراء کے کلام میں بکثرت پائے جاتے ہیں؟ یا اقبال کا کلام دوسرے شعرا کے کلام سے مختلف ہے اور اقبال کی شاعری میں گہرائی سنجیدہ حقائق گوناگوں جدید مضامین ہیں۔؟ مجھے اعتراف ہے کہ اپنی محدود معلومات کی بنا پر اقبال کی شاعری کے متعلق کوئی رائے قائم نہ کر سکا تھا اور محض ذاتی تعارف و معمولی گفتگو کی بنا پر یا ایسے لوگوں کی تعریف و توصیف کی بنا پر جنہوں نے اقبال کے کلام کا تھوڑا بہت مطالعہ کیا تھا کوئی رائے قائم کرنا میرے لئے مناسب نہیں تھا۔

اقبال سے میں بیت المقدس میں ملا تھا مرحوم کی تصویر اب بھی میری آنکھوں میں سامنے پھر رہی ہے، خوش قامت متوسط قد دوہرا بدن نہ زیادہ بھاری جسم کے نہ دبلے تھے، باوقار کم سخن، افکار میں ڈوبے ہوئے چہرہ سے علماء کی تواضع و سنجیدگی نمایاں تھی مرحوم نے اردو میں تقریر کی تھی۔ اثنا تقریر میں ایک حدیث شریف بھی عربی میں بیان کی تھی اس حدیث کے متعلق میں آگے چل کر کچھ عرض کروں گا۔ اقبال کی تقریر کو اپنے بعض دوستوں کی وساطت سے سمجھنے کی کوشش کی اس ملاقات کے بعد مرحوم سے میرے دوستانہ تعلقات پیدا ہو گئے اس ملاقات کے کچھ دنوں بعد میں ہندوستان آیا اور تقریباً ساڑھے چار مہینے تک اس اثنا میں مرحوم سے آپ کے اسی حسین و جمیل شہر لاہور میں دوبارہ ملاقات ہوئی ہماری گفتگو کا موضوع بدنصیب فلسطین کا دفاعی مسئلہ تھا۔

آج میں آپ کے اس اجتماع میں دائیں بائیں مڑ مڑ کر دیکھتا ہوں کہ شاید میرے قدیم صدیق جسیم نظر آجائیں اور میں بندو موعظت سے لبریز ان کی شیریں گفتگو سے بہرہ اندوز ہو سکوں مگر افسوس میری نگاہِ ناکام پلٹ پڑتی ہے غم سے میرا دل لبریز ہے اور مرحوم کی جدائی کی چبھن دل میں محسوس کر رہا ہوں کسے معلوم تھا کہ ایک دن یوم اقبال میں شریک ہو کر تعزیت کے فرائض انجام دوں گا۔ آہ آج میں مرحوم کی تعزیت کے فرائض انجام دے رہا ہوں حسن و خوبی، پاکیزگی و شرف کی تعزیت کر رہا ہوں، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عظیم المرتبت شخصیت کو اس دنیا فانی سے اس لئے اپنے پاس بلا لیا کہ وہ اس گندہ اور خواہشات پرست دنیا کے دردناک منظر کو نہ دیکھے، نہ ان کی نگاہیں المناک مناظر کا مشاہدہ کریں اور نہ ان کے کان فلسطین کی تکلیف دہ داستانِ غم والم کو سنیں۔

آج ہمیں صرف اس تصور سے سکون حاصل ہوتا ہے کہ مرحوم کی پاک روح جنت سے ہمیں جھانک کر دیکھ رہی ہے، پاکستانی قوم کے حق میں برکت و فلاح کی دعا کر رہی ہے اور اہلِ پاکستان کو دعوت دے رہی ہے کہ مرحوم کی دیرینہ تمناؤں کو اسی پاکستان میں بار آور کر دکھائیں جس کی خاطر اقبال نے اپنی دنیا اور اپنا سکون و چین سب کچھ قربان کر دیا تھا۔

اقبال سے ملنے اور دوستانہ تعلقات کے بعد ان کے شاعرانہ افکار اور ان کے پیام کے بعض پہلو کو میں سمجھ سکا۔ میں حیران تھا کہ اس جسم خاکی اور مختصر سے دماغ میں اعلیٰ افکار، شاداب مضامین، قیمتی خیالات اور فلسفہ حیات کا کیسا گنج گراں مایہ چھپا ہوا ہے۔ اس کا قید خاکی میں ایک بے چین روح اور سکون نا آشنا جان مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے بیتاب ہے اقبال کو قدرت نے ایک نہ تھکنے والی طبیعت عطا کی تھی جو مسلمانوں کی رہنمائی میں حدود و قیود سے بلند تھی مرحوم مسلمانوں کو اسلام کی شاہراہ پر چلنے کی دعوت دیتے تھے۔ اقبال کے پیام کو اگر مختصر طور پر بیان کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے کلام میں اسلام کا فلسفہ حیات پایا جاتا ہے۔ اسلام کی اعلیٰ تعلیمات اور بلند اخلاقی قدریں یعنی شجاعت، عفت، پاکدامنی، جہاد، قربانی، اور ایثار کے بلند اصول جو اجتماعی اور انفرادی زندگی کے لئے ناگزیر ہیں اقبال کے کلام میں دلکش انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔

اقبال کے متعلق میں نے بہت کچھ پڑھا، ریڈیو پر ان کے کلام کو شیریں و دلکش نغمہ کے ساتھ پڑھتے ہوئے بھی سنا عوام و خواص کی محفلوں میں لوگوں کو پڑھتے ہوئے بھی دیکھا، اقبال کے گلدستہ کلام میں بہت سے پھول مجھے پسند آئے اس گلشن بے خار اور بہار بے خزاں سے لطف اندوز ہونے کے لئے عربوں کے لئے عربی ترجمہ ہی بطور نمونہ پیش کیا جا سکتا ہے اس حقیقت کے اعتراف کے ساتھ کہ ترجمہ خواہ کس قدر بہتر ہو اصل کلام کی بلاغت کو ادا کرنے سے قاصر رہتا ہے اور ترجمہ سے اصل مضامین کی شگفتگی، اور بیان اور اسلوبِ ادا کی دلکشی کا اندازہ نہیں ہو سکتا اقبال کی شاعری زماں و مکاں اور جغرافیائی حدود سے ماوراء ہے وہ ایک پیامِ حیات اور فلسفۂ زندگی ہے۔ اقبال عالم اسلام کا مایہ ناز شاعر ہی نہیں بلکہ عالم اسلام کا بیش بہا سرمایہ فخر و مباہات ہے۔ اقبال کی شاعرانہ عظمت کو خراج عقیدت پیش کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ بلادِ عرب کے باشندے اقبال کی شاعری کو بنظر غائر مطالعہ کریں اس کے افکارِ عالیہ اور فلسفہ زندگی اور اس کی دعوت کی روح کو سمجھنے کی کوشش کریں اور اس سلسلے میں اسلامی یونیورسٹی میں اقبالیات کا ایک شعبہ قائم کریں۔

مجھے افسوس ہے کہ میں اپنے مخصوص حالات کی بناء پر اردو فارسی زبانوں سے واقف نہیں ہو سکا اس لیے ان کے

ادب سے براہِ راست استفادہ نہیں کر سکتا، نہ اقبال کے بہارِ بے خزاں اور گلشن بے خار دیوان شعر سے گلچینی کر سکتا ہوں نے اقبال کے کلام کو عربی ترجمہ کے ذریعہ سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ شیخ صادق علی الشعلان ازہری نے جو جمعیتہ مکارم اخلاق کے ممتاز رکن ہیں اس کا عربی ترجمہ کیا ہے۔ شعلان صاحب کے کمال و مہارت فن اور ان کے ادبی ذوق کے اعتراف کے اصل کلام کی بلندی فکر، مضامین عالیہ اور دلکش اسلوب ادا کا حق نہیں ادا ہو سکا کہ۔

میرا خیال ہے کہ اقبال جذباتی شاعر تھے کہ قوم کے جذبات و احساسات میں طوفانِ آرزو پیدا کر کے ان سے کھیلے بلکہ ایک مردِ مومن، مجاہد اور فلسفی کی حیثیت سے مربیانہ انداز میں اپنے پر از حکمت و تشبیہ نغموں سے دل کی گہرائی تک اپنا پیغام پہنچایا ہے اور اس طرح روحانی غذا مہیا کر کے ذوق کو پاکیزہ بنانے کا کام انجام دیا ہے اور امتِ اسلامیہ کی عقلیت، وطنیت، خودداری، قوت ایمان اور بلند آرزوؤں سے آشنا کیا ہے۔

درحقیقت اقبال مرحوم پیام اور ایک دعوت کے علمبردار تھے ان کے کلام میں اسلامی وطنیت اور ادبی بلاغت بلند و خوشگوار آمیزش ہے اقبال نے اپنے کلام سے بلند ہمتی، علو فکری، بہادری اور حصول شرف و عظمت کی تڑپ پیدا کرنا چاہتی ہے۔

غلام و آزاد زندگی کا فرق کتنے دلکش انداز میں پیش کیا اور آزادی کی تڑپ پیدا کرنے کے لئے کتنا بلیغ انداز اختیار کیا ہے

زندگی او را حرام از بیم مرگ　　　　ہر زماں میرد غلام از بیم مرگ
مرگ او را مے دہد جانے دگر　　　　بندۂ آزاد را شانے دگر

اسی مضمون کو دوسری جگہ اس طرح ادا کیا ہے۔

زندگی را چیست رسم و دین و کیش　　　　یک دم شیرے بہ از صد سال میش

پھر اسی مضمون کو یوں بیان کیا ہے۔ ؎

نہ پنداری کہ مرد امتحان مرد　　　　نمیرد گر چہ زیرِ آسماں مرد

ایک جگہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا فرق واضح کیا ہے، افراد و اشخاص کی موت سے قوم فنا نہیں ہوتی ہوتے رہتے ہیں مگر قوم کی اجتماعی زندگی پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ قوم تازہ دم اور جوان رہتی ہے اور اس کے جسم میں خون دوڑتا رہتا ہے۔

وجود افراد کا مجازی ہے ہستیٔ قوم ہے حقیقی　　　　فدا ہو ملت پہ یعنی آتش زن طلسم مجاز ہو جا

مسلمانوں کی اصل ذمہ داری اور ایک صاحبِ دعوت قوم ہونے کی حیثیت کو کس بلیغ اسلوب ادا سے ظاہر کیا

برے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی　　　　ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی مکیں آنی ازل تیرا ابد تیرا　　　　خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے
سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا　　　　لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

ایک جگہ نفس انسانی کے خلود و بقا کو کتنے دلکش انداز میں صبح و شام اور روز و شب کے الٹ پھیر سے تشبیہ

گیا ہے۔
موت کو سمجھتے ہیں اختتامِ زندگی — ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی۔

زندگی کے دوام کو دوسری جگہ یوں ادا کیا ہے۔

خفتگانِ لالہ زار و کوہسار و رود بار — ہوتے ہیں آخر عروسِ زندگی سے ہمکنار

دوامِ حیات کے ثبوت میں لیل و نہار کی گردش سے کتنا لطیف استدلال کیا ہے۔

یہ اگر آئینِ ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح — مرقدِ انساں کی شب کا کیوں نہیں انجام صبح

اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم — مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

زندگی نام ہے تلاش و جستجو کا — اور ذوقِ پرواز کا۔

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی — فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی۔

اس دوام زندگی اور استمرارِ حیات کو بہار و خزاں کے تسلسل سے یوں ثابت کیا ہے

گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے — اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے

ایک دوسری جگہ شکست و ریخت اور تخریب و تعمیر کے فلسفہ کو اس طرح ادا کیا ہے کہ ہر تخریب تعمیر نو کا پیش خیمہ ہے

جس طرح ہر خزاں کے بعد بہار آتی ہے۔

چوں جہاں کہنہ شود پاک بسوزند درا — وزہمہ آب و گل ایجاد جہاں تیز کنند

مومن کامل کی حقیقت اس طرح بیان کی ہے۔

آں کہ بود اللہ او را ساز و برگ — فتنۂ او حب مال و ترس مرگ

مردِ سپاہی ہے وہ اس کی زرہ لاالہ — سایۂ شمشیر میں اس کی پناہ لاالہ

اقبالؒ کے کلام میں فقر کا بار بار ذکر آیا ہے۔ یہ فقر غربت و افلاس کے معنی میں نہیں ہے بلکہ یہ صلحاء کی دنیا سے بے نیازی اور استغنا کے معنی میں ہے اقبال نے صلحاء کی بے نیازی، ان کی دنیا اور اسبابِ زندگی کی طرف سے بے اعتنائی کو شاہانہ بے نیازی پر ترجیح دی ہے یہ فقر دولت و ثروت جاہ و حشمت سے زیادہ انمول اور گوہر نایاب ہے اس فقر کے مقابلے میں دولتِ کونین بے قیمت ہے، اقبال مرحوم فقر کو بادشاہ سے زیادہ باعظمت سمجھتے ہیں کہ بادشاہ بہر حال جاہ حشم، دولت و ثروت کا محتاج اور صاحبِ فقر ان سب سے بے نیاز ہے۔

اقبال نے مسلمانوں کو شاہین سے تشبیہ دی ہے کہ مسلمان باطل کے حق میں شاہین ہے اور باطل اس کے لئے صیدِ زبوں

۱؎ ترجمہ میں اصل اشعار پیش کئے گئے ہیں بعض تشریح مترجم نے کی ہے

۲؎ جن عربی اشعار کو سامنے رکھ کر یہ عبارت بڑھائی گئی ہے افسوس کہ باوجود تلاش و جستجو کے ان کے اصل اردو یا فارسی اشعار کا پتہ نہ چل سکا ورنہ صرف ان اشعار کا ذکر کیا جاتا، ایسے تمام عربی اشعار کا مضمون ادا کیا گیا ہے جن کے اصل اردو یا فارسی اشعار نہیں مل سکے۔ نیز مضمون کی افادیت کے پیش نظر لفظی ترجمہ کے بجائے مضمون ادا کیا گیا ہے۔ (مترجم)

ہے شاہین کا آشیانہ فضائے آسماں ہے وہ کوّے اور دوسرے پرندوں کے آشیانہ میں کیوں بسیرا لینا چاہتا ہے اقبال مسلمانوں کو رفعت پرواز سے آشنا کرنا چاہتا ہے۔

ایک دوسری جگہ اقبال کہتا ہے کہ اس باغِ ہستی میں طرح طرح کے پھول پھل اور خنک سایہ موجود ہے مسلمان جو شاہینِ عالم ہے اپنا آشیانہ اس باغ کے سب سے بلند وبالا شاخ پر کیوں نہیں تعمیر کرتا، وہ اپنی فطرتِ بلند کے تقاضے کے خلاف پستی میں کیوں اترنا چاہتا ہے۔

ڈاکٹر اقبال نے قرآن کریم کی عمومی تعلیمات اور انسانیت سے متعلق اس کی عالمگیر رہنمائی کا گہرا مطالعہ کیا ہے مسلمانوں کے اس طرزِ عمل سے وہ تکلیف محسوس کرتے ہیں کہ انہوں نے قرآن کریم کو محض تلاوت وتبرک کے لئے مخصوص کر لیا ہے وہ اپنے کمروں میں پتھر کی طرح بیٹھ کر صرف خوش الحانی سے پڑھا کرتے ہیں حالانکہ اس کی تعلیمات کو عالم میں پھیلانا مسلمانوں کی اصل ذمہ داری ہے

اقبال کے پیام میں "خودی" مستقل عنوانِ بیان ہے۔ خودشناسی وخودی کے مضامین کو مختلف طریقہ سے ادا کیا ہے فلسفۂ خودی کو اقبال نے شاعرانہ کمال کے ساتھ بیان کیا ہے۔ خودی افراد وجماعت کی روحِ حیات ہے مسلمانوں کو اقبال فلسفۂ خودی کا درس دیتا ہے وہ مسلمانوں میں اپنی عظمت کا احساس پیدا کرنا چاہتا ہے وہ مسلمانوں کی پرعظمت روایات کو دوبارہ انہیں حیاتِ جاوداں بخشنا چاہتا ہے خودی کی موت درحقیقت افراد وجماعت کی موت ہے اقبال نے اس مضمون کو نہایت مؤثر اور دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ مور بے مایہ کو ہم دوشِ سلیماں دیکھنا چاہتا ہے وہ ایک انسان کو بادشاہ کے سامنے گداگر کی حیثیت سے نہیں دیکھنا چاہتا کہ کسی انسان کا بادشاہ کے سامنے دستِ سوال بڑھانا خودی کی موت ہے۔

اقبال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نورِ ہدایت سے محروم وکور باطن اشخاص کو دعوت دیتا ہے کہ وہ نبی امیؐ کی تعلیم سے اکتسابِ نور کریں کہ حق کی روشنی آپؐ ہی کی تعلیمات میں پائی جاتی ہے۔

بلادِ عربیہ کے انتشار وپراگندگی کو دیکھ کر اقبال کا دل خون کے آنسوں روتا ہے اقبال اتحادِ اسلام کے لئے عرب کو ایک ناگریز مسئلہ سمجھتا ہے وہ تمام عرب ممالک کو ایک رشتہ میں منسلک دیکھنا چاہتا ہے وہ عربوں کی شیرازہ بندی کا داعی ہے دیکھئے کتنے دردناک لہجہ میں عربوں کو دعوت اتحاد دیتا ہے۔

امتے بودی امم گردیدۂ — بزمِ خود را خود زہم پاشیدۂ
ہر کہ از بندِ خودی وارست مرد — ہر کہ با بیگان نگاہ پیوست مرد
اے ز افسونِ فرنگی بے خبر — فتنہ ہا در آستینِ او نگر۔
حکمتش ہر قوم را بے چارہ کرد — وحدتِ اعرابیاں صد پارہ کرد
عصر خود را بنگر اے صاحب نگر — در بدن باز آفریں روحِ عمرؓ
قوت از جمعیت دین مبیں — دیں ہمہ عزم است واخلاص دلیقیں

برادرانِ اسلام! اقبال کے کلام کا مختصر نمونہ میں نے آپ کے سامنے پیش کیا، آپ نے اس شاعر عظیم اور فلسفی وحکیم کے افکار کا اندازہ لگایا ہوگا۔ اب میں اس حدیثِ [illegible]دی کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جو انہوں نے بیت المقدس

کے موتمر اسلامی میں بیان کی تھی۔ اقبال نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"انا حظکم بین الانبیاء و انتم حظی بین الامم"۔ انبیا علیہم السلام میں سے میں تمہارے حصے میں آیا ہوں اور تمام قوموں میں سے تم میرے حصے میں آئے ہو۔

اس حدیث کو بیان کرنے کی غرض ڈاکٹر اقبال کے نزدیک صرف سوبوں کو متوجہ کرنا نہیں تھا بلکہ اس کے مخاطب روئے زمین کے تمام مسلمان تھے۔ حدیث شریف کے پہلے فقرے کے مفہوم پر غور کرنے کے بعد ہمیں فخر و مسرت محسوس ہوتی ہے کہ ہم دینِ اسلام سے وابستہ اور خاتم الانبیاء والمرسلین نبیٔ امی محمد صلعم کی امت اور آپ کے نام لیوا ہیں۔ اس نبیٔ امیؐ کی امت میں ہیں جن پر وہ قرآن نازل ہوا، جس کے قریب باطل کسی طرح نہیں آسکتا۔ وہ قرآن کریم جس نے جاہلوں کو بربریت، بد اخلاقی، اوہام پرستی سے پاک کیا توحید کی تعلیم دی، کفر و ضلالت کی گندگی سے ان کے قلوب کو پاک و صاف کیا۔ انہیں کمالِ انسانیت سے آشنا کیا ان میں اعلیٰ اخلاقی قدر پیدا کی ان میں طاقت، قوت، طہارتِ نفس، خودداری و خود اعتمادی اور آزادی کی روح پھونک کر انہیں زندہ و جاوید قوم بنا دیا۔ وہ قرآن کریم جس نے تمام انسانوں کو مساوی درجہ عطا کیا۔ رنگ، نسل، زبان، وطن کے امتیاز کو مٹا کر ایک عالمگیر اخوت اور جہانی مساوات کا تصور پیدا کیا۔ انسانوں کے درمیان صرف تقویٰ، عملِ صالح کو معیار شرف و وجہ امتیاز قرار دیا۔ یاایھا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثی وجعلنا کم شعوبا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم ان اللہ علیم خبیر۔ ترجمہ۔ بے شک تم میں سب سے زیادہ اللہ کے نزدیک باعزت وہ ہے جو تم میں سے سب سے زیادہ پرہیزگار ہے بے شک اللہ تعالیٰ بڑا جاننے والا اور خبردار ہے۔

انہیں اصولوں کی دعوت اقبال کی شاعری کا اصل موضوع تھا۔ وہ مسلمانوں میں اسی پیام کے ذریعہ دین کا صحیح فہم و بصیرت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ وہ ایک داعی و مفکر اسلام کی حیثیت سے مسلمانوں کو بیدار کر کے سرگرم عمل بنانا چاہتے تھے ان کی آرزو تھی کہ مسلمان اپنی طہارتِ نفس، عظمت، اور علم و معرفت کی بنا پر ان لوگوں کے سامنے ایک عظیم و صاحبِ دعوت قوم کی حیثیت سے بلند ہوں جو اب تک اسلام کی حقیقت اور اس کی عالمگیر تعلیمات کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں اور اب تک محض مسلمانوں کی زبوں حالی اور پستی کے باعث اصل اسلام کو نہیں سمجھ سکے ہیں اور وہ چاہتے تھے کہ مسلمان دوسروں کے لئے ہادی اور مشعلِ راہ بنیں۔

حدیث کا دوسرا فقرہ کہ مسلمان ہی تمام قوموں میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حصے میں آئے ہیں۔ ہم اپنے آپ سے سوال کرتے ہیں۔ کیا نبی کریم صلعم اس دور کے ہم جیسے مسلمانوں سے راضی ہو سکتے ہیں جبکہ ہم میں ہر قسم کی برائی پائی جاتی ہے۔ مخالفت، باہم کشاکش، بد کلامی، فقر و افلاس، جہالت، اور ان سب سے بڑھ کر احکام الٰہی کی تعمیل سے روگردانی جیسی روحانی بیماریاں ہم میں پائی جاتی ہیں۔ کیا نبی کریم صلعم اپنی پاک خوابگاہ میں ہم جو کہ تمام قوموں میں سے آپ کے حصہ میں آئے ہیں اس لائق ہیں کہ ہم پر فخر کیا جا سکے یا آپ ہم جیسے محض نام کے مسلمانوں کے حالِ زار پر کبیدہ خاطر اور ملول ہوں گے ہم مسلمان جن میں کذب و افترا اور بہتان طرازی جیسے اعمالِ بد ہمارے خلاف گواہ ہیں کیا رسول اللہ صلعم مسلمانوں کے ان اعمال سے اپنی برأت کا اظہار نہیں فرما رہے ہوں گے۔ کیا مسلمان اسلام کی امانت میں جس کی حفاظت ان کے سپرد کی گئی تھی خیانت کے مجرمانہ

نہیں کر رہے ہیں۔ کیا ہم اپنی موجودہ حیثیت میں واقعتہً مسلمان ہیں یا ہم درحقیقت مجرم ہیں۔ اور اسلام کو بدنام کرنے والے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم سیلاب کے خس وخاشاک کی طرح بے قدر قیمت ہو گئے ہیں۔ مجھے خطرہ ہے کہ کہیں خدانخواستہ ہم سے اللہ تعالیٰ اخفا ہو جائے اور اسلام خود اپنے دیار میں اجنبی اور بیگانہ نہ ہو جائے۔

اے روئے زمین کے مسلمانو! دکھے ہوئے دل کی آواز سن لو، ایک غیر مبہم اور واضح بات سن لو! آج اسلام کے احکام کو نظرانداز کر کے اسلامی اصول سے دور رہ کر ہم کمزوری وضعف کے عمیق خندق میں گر گئے ہیں۔ ہمارے پاس نہ سائنس ہے اور نہ مادی قوت و طاقت ہے۔ نہ ہمارے پاس دین ہی باقی رہا ہے۔ اٹھو! علم سیکھو۔ ایک دوسرے سے تعاون کرو تم پر اور تم سے قبل لوگوں پر جو عذاب نازل ہوا ہے اس سے عبرت حاصل کرو۔ اندلس کی بربادی کو سرمایۂ عبرت سمجھو۔ اندلس کی تباہی، باہمی اختلاف شخصی جاہ طلبی اور دین حنیف کے اصول سے انحراف کا ناگزیر نتیجہ تھی۔ اہل فلسطین کے مصائب کو سامنے رکھو، فلسطین کو عبرت گاہ بناؤ، آباواجداد کا موجودہ ترکہ جو کچھ ہے اس کی حفاظت کرو مسلمان دنیا کے مشرق ومغرب اتر دکھن ہر مقام میں کمزور ناتواں ہیں، اگر ہم نے گذشتہ غلطیوں کی تلافی نہ کی تو جو کچھ ہمارے ہاتھ میں رہ گیا ہے وہ بھی نکل جائے گا اور ہماری جگ ہنسائی اور عالم میں رسوائی ہوگی۔ ہماری آس اور شعاع امید صرف یہ تصور ہے کہ ہماری تاریخ کا یہ تاریک دور شاید سفیدہ صبح کی نمود سے قبل کی ظلمتِ شب ہو۔

اے سفرِ آخرت کے معزز مسافر! تو ہم سے جدا نہیں ہوا ہے تو ہمارے درمیان اب بھی زندہ وجاوید ہے۔ مردہ وہ ہے جو زندہ رہ کر حیات سے محروم ہو گیا ہو۔ اے اقبال پروردگار نے تجھے اپنے پاس بلا کر شرف بخشا ہے اور پاکستان بنا کہ تیری پاک روح سارے عالم کے مسلمانوں کے اعمال کا جائزہ لے رہی ہے۔ اے روح اقبال جو اپنے پروردگار میں اللہ کی بے پایاں رحمتوں میں رہنے والی روح دیکھ! آیا تیرے بعد یہ قوم مردہ تو نہیں ہو گئی۔ یا عسر کے بعد یسر اور تنگدستی کے بعد فراغت حال کے لیے وہ سرگرم عمل ہے نیز اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے ساتھ اسباب فراہم کر کے اپنے حالات کو بدلنا چاہتی ہے تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے حالات کو بدل دے اور انہیں خوف کے بعد امن وسکون اور کمزوری کے بعد قوت عطا فرمائے۔ ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسہم۔ اور اس طرح قوم مسلم ایک ایسی حقیقی زندگی سے ہم کنار ہو جائے گی جس میں فلاح دارین اور دونوں جہاں کی آسائش موجود ہوگی۔ اے اقبال تجھ پر اللہ کی ہزاروں رحمتیں نازل ہوں۔ تیری قسمت میں حیاتِ جاودانی لکھی ہوئی تھی کیونکہ تو نے اپنے جسم کو اپنے دین اور اپنی قوم کے لیے مٹانا چاہا تھا۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق — ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

طیب اللہ ثراک وانولک منازل الصدیقین والشہداء والصالحین والسلام علی من اتبع الھدیٰ

(بشکریہ ماہنامہ یثرب لاہور نومبر ۱۹۷۹ء)

طالب ہاشمی

(۱)

سیّد الانامؐ کے دس مدنی جاں نثار

حضرت ذکوانؓ بن عبدِ قیس الزُّرقی الانصاری

ان کا تعلق خزرج کے خاندان زُریق سے تھا۔ سلسلۂ نسب یہ ہے۔
ذکوانؓ بن عبد قیس بن خلدۃ بن مخلد بن عامر بن زُریق۔
اللہ تعالیٰ نے حضرت ذکوانؓ کو فطرتِ سلیم سے نوازا تھا۔ اور وہ بعثتِ نبوی سے قبل ہی توحید کے قائل ہو گئے
تھے۔ انہوں نے یہود مدینہ سے نبیٔ آخر الزماںؐ کا تذکرہ بھی سنا تھا اور ان کی دلی تمنا تھی کہ اللہ اُن کو نبیٔ آخر الزماںؐ کا زمانہ دیکھنا
نصیب کرے۔ علامہ ابن سعد کا بیان ہے کہ بیعت عقبۂ اولیٰ (سنہ ۱۱ نبوت) سے پہلے وہ ایک مرتبہ اپنے ایک ہم مشرب
دوست حضرت اسعدؓ بن زرارہ کے ہمراہ قومی مفاخرت کے سلسلے میں مکہ گئے اور مشہور قریشی رئیس عتبہ بن ربیعہ کے
ہاں قیام کیا۔ عتبہ نے ان سے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات بیان کیے۔ (یا بروایتِ دیگر قبل اس کے کہ وہ عتبہ سے
ملتے انہوں نے بعض دوسرے لوگوں سے رسولِ اکرمؐ کے حالات سنے۔) تو وہ بے حد متاثر ہوئے اور حضرت ذکوانؓ نے
بے ساختہ حضرت اسعدؓ سے کہا۔

دونک اھذا دینک۔

یعنی تم کو جس چیز کی تلاش تھی وہ موجود ہے۔ اب اس کو اختیار کر لو۔
چنانچہ دونوں وہاں سے اُٹھ کر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور توحید و رسالت کا اقرار کر کے شرفِ ایمان سے بہرہ ور ہو گئے
سنہ ۱۲ بعد بعثت میں وہ مدینہ کے اُن بارہ اہل ایمان میں شامل تھے جو مکہ جا کر حضورؐ پر نور کی بیعت سے مشرف ہوئے
(بیعت عقبۂ ثانیہ)۔ اگلے سال انہوں نے پھر یہی سعادت بیعت عقبۂ کبیر میں مدینہ کے ۷۲ دوسرے اہل ایمان کے ساتھ
حاصل کی۔ اسی موقع پر انصارِ مدینہ نے حضورؐ کو مدینہ تشریف لانے دعوت دی اور آپؐ کو دل وجان سے اپنی تائید وحمایت کا یقین
دلایا۔ اہل سیر کا بیان ہے کہ اس بیعت کے بعد حضرت ذکوانؓ مدینہ سے مکہ آکر مقیم ہو گئے اور کچھ عرصہ بعد دوسرے
مہاجرین کے ساتھ مکہ سے ہجرت کی۔ اسی لیے اُن کو مہاجری انصار کہا جاتا ہے۔
رمضان المبارک سنہ ۲ ہجری میں غزوۂ بدر پیش آیا تو حضرت ذکوانؓ کو اصحاب بدرؓ میں ہونے کا عظیم شرف حاصل ہوا
اگلے سال غزوۂ اُحُد میں بھی بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ شریک ہوئے۔ اور مشرکین کے خلاف مردانہ وار لڑتے ہوئے اپنی جان
راہِ حق میں قربان کر دی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

(۲) حضرت مُنذِرؓ بن عمرو انصاری

قبیلہ خزرج کے خاندان ساعدہ کے چشم و چراغ تھے نسب نامہ یہ ہے۔

مُنذِرؓ بن عمرو بن خنیس بن حارثہ بن لوذان بن عبدود بن زید بن ثعلبہ خزرج بن ساعدہ بن کعب بن خزرج الاکبر

حضرت مُنذِرؓ بن عمرو کا شمار نہایت عظیم المرتبت صحابہ میں ہوتا ہے۔ وہ انصار کے ان چند لوگوں میں سے تھے جو زمانۂ جاہلیت میں عربی میں لکھ پڑھ لیتے تھے۔ اللہ نے انہیں فطرتِ سلیم عطا کی تھی ہجرتِ نبوی سے قبل دعوتِ توحید کی آواز کانوں میں پڑی تو فوراً اس پر لبیک کہا۔ اور ۱۳ سنہ بعدِ بعثت (نبوت) میں مکہ جاکر بیعت عقبہ کبیرہ میں شریک ہونے کی سعادت حاصل کی۔ بیعت کے بعد سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے شرکائے بیعت سے فرمایا کہ تم لوگ اپنے میں ۱۲ نقیب منتخب کرلو۔ انہوں نے ۹ نقیب خزرج سے ۳ اوس سے منتخب کیے۔ خزرجی نقباء میں ایک حضرت مُنذِرؓ بن عمرو

ہجرت کے بعد حضورؐ پر نور مدینہ تشریف لائے تو آپؐ کا استقبال کرنے والوں میں حضرت مُنذِرؓ بن عمرو بھی ان میں شامل تھے یہ الگ بات ہے کہ سرکار دوعالمؐ کی میزبانی کا شرف خالق ارض وسما نے حضرت ابو ایوبؓ کے مقدر میں لکھ رکھا تھا۔

چند ماہ بعد حضورؐ نے مہاجرین اور انصار کے مابین مواخاۃ کا رشتہ قائم کیا تو حضرت منذرؓ کو اپنے پھوپھی زاد بھائی طلیبؓ بن عمیر کا اسلامی بھائی بنایا۔ (وہ حضورؐ کی پھوپھی اروٰی بنت عبد المطلب کے فرزند تھے) ایک دوسری روایت کے مطابق حضورؐ نے انہیں حضرت ابوذر غفاری کا اسلامی بھائی بنادیا۔ واللہ اعلم۔

غزوات کا آغاز ہوا تو سب سے پہلے حضرت مُنذِرؓ نے غزوۂ بدر میں اپنی تلوار کے جوہر دکھائے اس کے بعد غزوۂ اُحد میں بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ شریک ہوئے۔ اس لڑائی میں حضورؐ نے انہیں اسلامی لشکر کے میسرہ کا افسر مقرر فرمایا۔

صفر ۴ سنہ ہجری میں ابو براء عامر بن مالک نجدی کی درخواست پر حضورؐ نے ستر مبلغین پر مشتمل ایک جماعت تبلیغ حق کے لئے نجد روانہ فرمائی۔ یہ ستر اصحاب نہایت عبادت گزار، متقی اور قرآن و حدیث کے عالم تھے اور قراء کے لقب سے مشہور تھے۔ حضورؐ نے اس جماعت کا سردار حضرت مُنذِرؓ بن عمرو کو مقرر فرمایا۔ جب یہ اصحاب بیر معونہ کے مقام پر پہنچے تو اہل نجد نے غداری کی اور رعل، ذکوان، بنی سُلیم وغیرہ قبائل کے لوگوں نے انہیں گھیر لیا۔ اور حضرت مُنذِرؓ بن عمرو اور عمروؓ بن اُمیہ کو شہید کرڈالا بنی عامر کے سردار عامر بن طفیل نے حضرت مُنذِرؓ سے کہا۔ اگر تم چاہو تو تم کو امان دی جاسکتی ہے۔ انہوں نے فرمایا۔ ذرا وہ جگہ مجھے بتادو۔ جہاں حرامؓ بن ملحان کو تم لوگوں نے شہید کیا۔ مشرکین انہیں وہاں لے گئے تو انہوں نے اپنی تلوار نکال لی اور عامر بن طفیل سے مخاطب ہو کر فرمایا، مجھے تمہاری امان کی ہرگز ضرورت نہیں تم نے میرے بھائیوں کو ناحق شہید کیا ان کے بغیر میں جی کر کیا کروں گا۔ پھر تلوار چلاتے ہوئے مشرکین کے درمیان گھس گئے اور دو کو جہنم واصل کرکے خود رتبۂ شہادت پر فائز ہوگئے۔ حضرت عمروؓ بن اُمیہ ضمری نے (جنہیں عامر بن طفیل نے اپنی ماں کی ایک منت پوری کرنے کے لئے رہا کردیا تھا) جب مدینہ جاکر یہ خبر حضورؐ کو سنائی تو آپؐ کو بے حد صدمہ ہوا۔ حضرت مُنذِرؓ کا واقعۂ شہادت سن کر آپ نے فرمایا "اعنق لیموت" یعنی اس نے موت کی طرف سبقت کی

وقت سے حضرت منذر کا لقب "اعنق لیموت" یا المنق للموت مشہور ہو گیا۔
یہ لقب گویا اس بات کی علامت کہ حضرت منذرؓ بن عمرو نے راہِ حق میں آگے بڑھ کر موت کو گلے لگا لیا

۳۔ حضرت رفاعہ بن عمرو انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ

خزرج کے خاندان "عوف بن خزرج" میں سے تھے نسب نامہ یہ ہے۔
رفاعہؓ بن عمرو بن زید بن عمرو بن ثعلبہ بن مالک بن سالم (حُبلی) بن غنم عوف بن خزرج
ان کی کنیت ابوالولید ہے۔ اور سرف ابن ابی الولید ہے۔ اس لئے کہ ان کے دادا زید بن عمرو کی کنیت بھی ابوالولید تھی
حضرت رفاعہؓ کے خاندان کو "بنو حُبلی" بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ ان کے مورثِ اعلیٰ سالم بن غنم کا پیٹ بہت بڑا تھا اس لئے وہ حبلی کے لقب سے مشہور ہو گیا تھا۔ یہ خزرج کی نہایت معزز شاخ تھی اور رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی کا تعلق بھی اسی خاندان سے تھا
حضرت رفاعہؓ کو اللہ تعالیٰ نے فطرتِ سعید سے نوازا تھا۔ وہ ہجرتِ نبوی سے قبل سعادت اندوزِ ایمان ہوئے اور پھر ۱۳ بعد بعثت میں مکہ جا کر لیلۃ العقبہ میں رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت سے مشرف ہوئے۔ اس کے بعد ۲ ہجری میں غزوۂ بدر میں حضورؐ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔ غزوۂ اُحد میں بھی بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوئے اور مردانہ وار لڑتے ہوئے سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی جان قربان کر دی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

۴۔ حضرت اوسؓ بن ثابت انصاری

خزرج کے خاندان "بنو نجار" سے تھے سلسلۂ نسب یہ ہے۔
اوسؓ بن ثابت بن منذر بن حرام بن عمرو بن زید بن مناۃ بن عدی بن عمرو بن عمرو بن مالک بن نجار بن ثعلبہ بن عمرو بن خزرج
حضرت اوسؓ، شاعرِ رسول اللہ حضرت حسانؓ بن ثابت کے علاتی (پدری) بھائی تھے۔ ان کے اجداد اپنے قبیلہ کے رؤسا میں شمار ہوتے تھے حضرت اوسؓ ہجرتِ نبوی سے پہلے سعادت اندوزِ ایمان ہوئے۔ اور ۱۳ بعد بعثت کے موسم حج میں مکہ جا کر بیعت عقبہ کبیرہ میں شریک ہونے کا عظیم شرف حاصل کیا اس معاملہ میں ان کو اپنے برادرِ بزرگ حضرت حسانؓ پر تقدم حاصل ہے۔
رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے مشرف فرمایا اور چند ماہ بعد مہاجرین اور انصار کے مابین عقدِ مواخاۃ قائم کرایا تو حضرت اوسؓ کو حضرت عثمان ذوالنورینؓ کا دینی بھائی بنایا اس سے پہلے حضرت عثمان مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئے تھے تو حضرت اوسؓ ہی نے ان کو اپنا مہمان بنایا تھا۔
حضرت اوسؓ ایک مردِ جانباز تھے اور انہوں نے اپنی جان اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی خوشنودی کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ سب سے پہلے انہوں نے غزوۂ بدر میں اپنی سرفروشی کے جوہر دکھائے اس کے بعد غزوۂ اُحد میں بڑے جوش و خروش سے شریک ہوئے اور کفار کے خلاف مردانہ وار لڑتے ہوئے رتبہ شہادت پر فائز ہوئے۔

حضرت طفیل بن مالک انصاری

انصار کے قبیلہ خزرج سے تھے نسب نامہ یہ ہے۔
طفیلؓ بن مالک بن خنساء بن سنان بن عبید بن عدی۔ بن غنم بن کعب۔
ہجرت نبوی سے پہلے ۱۳ سنہ بعد بعثت میں مکہ گئے اور بیعت عقبہ کبیرہ میں شامل ہونے کی سعادت حاصل کی۔
رمضان ۲ سنہ ہجری میں غزوہ بدر میں داد شجاعت دی۔ ۳ سنہ ہجری میں غزوۂ اُحد میں شریک ہوئے اور بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ لڑے۔ اس لڑائی میں انہوں نے باختلاف روایت تیرہ یا اکیس زخم کھائے۔ تاہم جان بچ گئی اور زخم آہستہ آہستہ مندمل ہو گئے۔ ۵ سنہ ہجری میں غزوۂ خندق میں پرجوش حصہ لیا۔ اور اسی لڑائی میں (بقول ابن ابی حاتم) وحشی بن حرب کے ہاتھ سے جام شہادت نوش کیا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

۶ ۔ حضرت انیسؓ بن قتادہ انصاری

انصار کے قبیلہ اوس سے تھے سلسلۂ نسب یہ ہے۔
اُنیسؓ بن قتادہ بن ربیعہ بن خالد بن حارث بن عبید بن زید بن مالک بن عوف بن عمرو بن عوف بن مالک بن اوس
بعض نے ان کا نام انس لکھا ہے۔
ہجرت نبوی کے قریبی زمانہ میں سعادت اندوزِ ایمان ہوئے نہایت مخلص اور پرجوش مسلمان تھے۔ رمضان المبارک ۲ سنہ ہجری میں حق کے ان ۳۱۳ علمبرداروں میں شامل ہونے کا شرف حاصل کیا جو اصحاب بدر کے لقب سے مشہور ہوئے۔ اور جن کے اگلے پچھلے سب گناہ بخش دیئے گئے۔ غزوۂ بدر کے بعد انہوں نے غزوۂ اُحد میں سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم رکابی کا شرف حاصل کیا اسی غزوہ میں نہایت بہادری سے لڑتے ہوئے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی جان نثار کر دی۔
مشہور صحابیہ حضرت خنساءؓ بنت خرام الاسدیہ حضرت انیسؓ ہی کی اہلیہ تھیں۔

۷ ۔ حضرت سراقہؓ بن عمر انصاری

خزرج کے معزز ترین خاندان نجار سے تھے۔ شجرۂ نسب یہ ہے۔
سراقہؓ بن عمرو بن عطیہ بن خنساء بن مبذول بن عمرو بن غنم بن مالک بن نجار۔
ہجرتِ نبوی سے پہلے یا فوراً بعد شرف اسلام سے بہرہ ور ہوئے نہایت بہادر تھے اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے نہایت مخلص جاں نثار تھے۔ بدر، اُحد، خندق اور خیبر تمام غزوات میں بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ شریک ہوئے اور ہر معرکے میں اپنی سرفروشی کے جوہر دکھائے۔ ۶ سنہ ہجری میں بیعتِ رضوان کا عظیم شرف حاصل کیا۔ عمرۃ القضا میں بھی رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب تھے۔ جمادی الاول ۸ سنہ ہجری میں غزوۂ موتہ پیش آیا تو حضرت سراقہؓ بھی مجاہدین اسلام میں شامل تھے اسی غزوہ میں انہوں نے بڑی بہادری سے لڑتے ہوئے شہادت پائی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

۸ ۔ حضرت عقبہؓ بن عامر انصاری

عامر بن نابی بن زید بن حرام کے فرزند تھے اور خزرج کے خاندان بنی حرام بن کعب میں سے تھے۔ انصار کے ان چھ قدیم الاسلام بزرگوں میں سے تھے جو سب سے پہلے ۱۱ سنہ بعد بعثت میں مکہ جا کر شرف اسلام اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم

کی بیعت سے بہرہ ور ہوئے۔ سنہ ۱۲ بعد بعثت میں دوبارہ مکہ میں جاکر حضورؐ پرنور کی بیعت کا شرف حاصل کیا۔

بڑے جری اور بہادر تھے۔ اور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے نہایت مخلص شیدائی تھے۔ سب سے پہلے غزوۂ بدر میں اپنی شجاعت کے جوہر دکھائے۔ پھر غزوۂ اُحد میں اس شان سے شریک ہوئے کہ آہنی خود پر سبز عمامہ سجا رکھا تھا اور دور سے نمایاں معلوم ہوتے تھے۔ اُحد کے بعد احزاب اور دوسرے مشاہد نبوی میں بالالتزام حاضر رہے۔ اور ہر معرکے میں سربکف ہو کر لڑے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں فتنۂ ردہ کو فرو کرنے میں پرجوش حصہ لیا۔ اور اسی سلسلہ میں مسیلمہ کذاب کے خلاف یمامہ کی خونریز جنگ میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہادت پائی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

۹ حضرت سلیمؓ بن عمرو انصاری

خزرج کے خاندان بنو سلمہ میں سے تھے۔ سلسلۂ نسب یہ ہے۔

سلیمؓ بن عمرو بن حدیدہ بن عمرو بن سواد بن غنم بن کعب بن سلمہ بن سعد بن علی بن اسعد بن سارہ بن یزید بن جشم بن خزرج

ہجرتِ نبوی سے پہلے سعادت اندوز اسلام ہوئے۔ اور سنہ ۱۳ بعد بعثت میں مکہ جاکر لیلۃ العقبہ میں رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کا شرف حاصل کیا۔

ہجرتِ نبوی کے بعد سنہ ۲ھ میں انہیں اصحاب بدر میں شامل ہونے کا عظیم شرف حاصل ہوا۔ اس کے بعد غزوۂ اُحد میں بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ شریک ہوئے اور نہایت بہادری سے لڑتے ہوئے رتبۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

بعض نے اُن کا نام سلیمان بن عمرو بن حدیدہ لکھا ہے۔

حضرت عَنترہؓ ۔ حضرت سُلیمؓ کے غلام عَنترہؓ بھی راہ حق کے ایک جانباز سپاہی تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے غزوۂ بدر میں حضورؐ کی ہم رکابی کا شرف حاصل کیا۔ اس کے بعد غزوۂ اُحد میں بڑے ذوق شوق سے شریک ہوئے اور مردانہ وار لڑتے ہوئے نوفل بن معاویہ دیلی کے ہاتھ سے جام شہادت پیا۔ بعض نے لکھا ہے کہ حضرت سُلیمؓ نے انہیں آزاد کر دیا تھا۔ اور بقول ابن ہشام وہ بنی تمیم بن کعب بن سلمہ کے حلیف تھے بہر صورت اُن کا شمار خزرجی سلمی انصار میں ہوتا ہے۔

۱۰ حضرت نعمان الاعرجؓ انصاری

نعمان نام۔ اعرج لقب۔ یہ لقب پاؤں میں لنگ ہونے کی وجہ سے تھا سلسلۂ نسب یہ ہے۔

نعمان بن مالک بن ثعلبہ بن احرام (یا اصرام) بن فہر بن ثعلبہ بن غنم الخزرجی۔

مورخ محمد بن عمارہؒ کا بیان ہے کہ غزوۂ بدر میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب تھے۔ اگلے سال غزوۂ اُحد میں بھی شریک ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ اُحد کے دن اپنی تمنائے شہادت کا اظہار یوں کیا کہ الٰہی تجھے اپنی ذات کی قسم ہے کہ آفتاب غروب ہونے سے پہلے میں اپنے اسی لنگڑے پاؤں سے سبزہ زارِ جنت میں چلتا پھرتا نظر آؤں۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی۔ اور وہ لڑتے ہوئے جام شہادت پی کر جنت میں پہنچ گئے۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت نعمانؓ کی شہادت کا حال سن کر فرمایا۔ نعمان الاعرج نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اچھا گمان کیا تھا اللہ تعالیٰ نے اس سے اس کے گمان کے مطابق سلوک کیا، میں نے نعمان کو دیکھا کہ وہ جنت میں چل پھر رہا تھا۔ اور اس میں پاؤں میں لنگڑاپن نہیں تھا

شورش کاشمیری

حافظ بشیر حسین حامد

آغا شورش کاشمیری مرحوم وفات پاکے ہماری سیاسی، تہذیبی اور علمی ادبی زندگی کا جزو بن گئے ہیں مجلس احرار میں رسمی شرکت سے پہلے بھی وہ ہمہ تن اور سرتاپا حریت فکر و عمل تھے پاکستان میں جب قائد ملت کی شہادت کے بعد کرسیوں کا کھیل شروع ہوا تو ان کی شعلہ بار آتش نوا طبیعت کے اصلی جوہر کھلے۔ اور غلام محمد، جنرل ایوب، آغا یحییٰ نواب کالاباغ، کون تھا جس کی اصلی کہانی شورش کی زبانی ملت پاکستانی نے نہ سنی ہو۔ ذوالفقار علی بھٹو کا پاکستان میں عمل دخل ہوا تو آغا مرحوم کی صحت جسمانی بڑے نازک مرحلے پر تھی لیکن یہ ہمہ رو وہمہ رخ مجاہد۔

؎ بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق

نتیجہ معلوم تھا مگر ع خود نوید زندگی لائی قضا اس کے لیے۔ اس نے مسکرا مسکرا کے جان دے دی لیکن اس کی یہی مسکراہٹ ملت کے دل کی دھڑکنوں کے لئے سرمایہ جاں بن گئی۔ ——— مدیر فاران

مل گئے اپنے رب سے شورش
پھیر کے منہ کو سب سے شورش

رکھتے تھے کس درجہ راز عقیدت
دل میں میر عرب سے شورش

حق کہنا تھا شیوہ ان کا۔
ڈرتے تھے بس رب سے شورش

ان کا مقصد کام تھا کرنا۔
بھاگتے لہو و لعب سے شورش

تھے وہ مجسم شعر و صحافت
اٹھ گئے آہ ادب سے شورش

پڑھنے والے کو تڑپا دے
لکھتے تھے اس ڈھب سے شورش

زنداں بھی اک گھر تھا ان کا
ہوش میں آئے جب سے شورش

اور بھی زیادہ یاد آتے ہیں۔
بچھڑے ہم سے جب سے شورش

ان کا نام رہے گا زندہ۔
حامد تھے ہی غضب سے شورش

راسخ عرفانی

غزل

حضرت راسخ عرفانی طلب شہرت سے بے نیاز ہیں مگر طلبِ کمال سے نہیں۔ راقم الحروف کو حال ہیں اُن سے نیازِ حضوری کے حصول کا موقعہ ملا تو اندازہ ہوا کہ علم و عرفاں نے ان کی طبیعتِ رنگین کے لالہ زار ہیں۔ سوز و گداز کی کیسی اور کتنی شمعیں روشن کر رکھی ہیں۔ ——— "مدیر فاران"

بعد میرے جو لکھے میرے سفر کی تاریخ
پہلے تالیف کرے راہگذر کی تاریخ

کیسا منظر ہے، اندھیرے... اُجالوں کے نقیب
لوحِ ظلمت پہ ہے مرقوم سحر کی تاریخ

عمر اک گزری ہے کرنوں کا تعاقب کرتے
مجھ کو ازبر ہے رمِ شمس و قمر کی تاریخ

جانے کس دور میں اُجڑی تھی یہ بستی دل کی
کس کو اب یاد ہے صدیوں کے کھنڈر کی تاریخ

رُت نے باندھی ہے امر بیل سے ڈالی ڈالی
زرد پتوں پہ ہے تحریر شجر کی تاریخ —

قتلِ ہابیل پہ ہی ختم نہیں یہ قصہ
سربسر خون میں ڈوبی ہے بشر کی تاریخ

نرم دل لوگ تو پھولوں سے تھے نازک راسخ
ہم نے پتھر پہ بھی لکھی ہے ہنر کی تاریخ

روحِ انتخاب

مولانا عبد الماجد صاحب دریا آبادی رح

"کعبۂ مقصود"

سنتے چلے آئے تھے اور کتابوں میں بھی بار بار پڑھا تھا کہ کعبہ تجلّی گاہِ جلال ہے، یہاں تجلیاتِ قہری کا زور ہے۔ روایتوں کا اثر دل میں بیٹھا ہوا تھا۔ ہیبت و دہشت کا غلبہ تھا ہمت بار بار جواب دے رہی تھی اور دل یہ کہہ رہا تھا کہ سامنا کیونکر کیا جائے گا زمین کی زبان سے یہ مصرعہ بار بار سنا تھا کہ ؎ تو مرا خراب کردی بہ این سجدہ ریائی۔ دل کھٹک رہا ہے، ذرا کان لگا کر سننا کہیں یہ ندا اس وقت اسی مسجد حرم کی سرزمین سے تو نہیں آرہی ہے۔ شاعری کی دنیا میں بارہا یہ آواز کانوں میں پڑچکی تھی

چوں بطواف کعبہ رفتم بحرم رہم ندادند　　　　تو بروں در چہ کردی کہ درون خانہ آئی

کیا آج اور اس وقت یہ شاعری حقیقت بن کر رہے گی؟ یا اللہ اس پاک زمین پر اتنی ناپاک پیشانی کیونکر رگڑا جائے گا؟ اس عظمت و جلال والے مکان کے طواف پر کیسے قدرت ہوگی جن گلیوں میں حاجرہ صدیقہ دوڑی تھیں، نبی کی ماں اور نبی کی بیوی دوڑی تھیں وہاں اس ننگ امت سے سعی کیونکر بن پڑے گی۔؟

لیجیئے مسجد حرام کی چار دیواری شروع ہوگئی کئی دروازہ چھوڑتے ہوئے ہم لوگ باب السلام سے اندر داخل ہوئے (داخلہ کے لئے یہی دروازہ سب سے بہتر مانا گیا ہے) کس کے اندر داخل ہوئے؟ اس ارضِ پاک کے اندر اس بقعۂ نور کے اندر جہاں کی ایک نماز ایک لاکھ نماز یا کم از کم ایک ہزار نمازوں کے برابر ہے۔ اندر داخل ہوتے ہی نگاہ اس سیاہ غلاف والی عمارت پر پڑی جسے خشکی اور تری میں نہ سما سکنے والے نے زمین و آسمان، عرش و کرسی کی سمائی میں نہ آنے والے نے وہم و خیال کی وسعت میں نہ گھرنے والے نے اپنا گھر کہہ کر پکارا اور نگاہ پڑتے ہی جہاں پڑی تھی وہیں جم کر رہ گئی اس گھڑی کی کیفیت کیا اور کن لفظوں میں بیان ہو، کہتے ہیں کہ موسیٰ کلیم علیہ السلام کے ہوش و حواس کسی کی ایک تجلّی کی تاب نہ لا سکے تھے۔ جب تجلّی "بیت" کا یہ حال ہے کہ ہوش و حواس قائم رکھنا دشوار تو "رب البیت" کی تجلّی نے خدا معلوم کیا غضب ڈھایا ہوگا۔ جب گھر کی برق پاشیوں کا یہ عالم ہے تو گھر والے کے انوار و تجلیات کی تاب کون بشری آنکھ اور انسانی بصارت لا سکتی ہے؟ اللہ اللہ کیا حسن و جمال کیا رعنائی و زیبائی کیا خوبی و محبوبی، کیا دلکشی و دلبری ہے۔ جن لوگوں نے قہر و جلال کی تجلّی گاہ بتایا ہے خدا معلوم انہوں نے کیا اور کس عالم میں دیکھا۔ اپنا تو یہ حال ہے تھا کہ سرتاپا مہر و جمال ہی ٹپکتا نظر آتا تھا اور چاروں طرف سے رفق و الفت، شفقت و رحمت کے کھلے ہوئے پھولوں کی خوشبوئیں لپکی چلی آرہی تھیں۔ ابراہیم کی

ملت اسمٰعیلؑ کی فداکاری، حاجرہ کی سکینت، اللہ اکبر جہاں یہ تینوں اکٹھا ہوں انوار و مہر و جمال کی تجلیات اس ٹھکانے سے بڑھ کر اور کہاں ہوں گی اب نہ قلب میں اضطراب ہے نہ طبیعت میں انتشار نہ خوف نہ دہشت، نہ رعب نہ ہیبت سرتاپیر سکون ہے اور انبساط و سرور ہے اور نشاط من دخلہٗ کان اٰمنا کی تفسیریں بہت سی پڑھی تھیں لیکن جو تفسیر اس گھڑی بغیر کسی کتاب و عبارت کے توسط نے لوح قلب پر القا ہو رہی تھی وہ سب سے الگ، سب سے نرالی، سب سے عجیب تھی۔ اور اگر فاش گوئی کی اجازت دی جائے تو اپنے حق میں سب منقول و مکتوب تفسیروں سے بڑھ کر صحیح بھی تھی۔ آہ

در مصحف روئے او نظر کن　　خسرو غزل و کتاب تاکے؟

غزالیؒ احیاء العلوم میں لکھتے ہیں کہ قیامت کے دن کعبہ کا حشر بناؤ سنگار کی ہوئی نئی دلہن کی شکل میں ہوگا لیکن یہ قید اس دن کے لئے کیوں اور اس کے مشاہدہ کے لیے قیامت کے انتظار کی کیا ضرورت ہے؟ قسم ہے خانۂ کعبہ کے رب کی کہ کعبہ آج بھی نئی دلہنوں کی طرح حسن و جمال، رعنائی و زیبائی و دلکشی و دلبری کے پورے ساز و سامان سے آراستہ ہے اور اپنی خوبی و محبوبی میں بجز مدینہ کی مسجد نبوی کے نہ کوئی شریک رکھتا ہے نہ سہیم، اسے محبوبیت کے جامہ میں حسن و جمال کی جملہ اداؤں کے ساتھ اسی عالم ناسوت میں کسی نے نہیں دیکھا۔ صدیقوں نے دیکھا، کاملوں نے دیکھا، عارفوں نے دیکھا آنکھیں رکھنے والوں نے دیکھا اور انتہا یہ ہے کہ جو بصیرت سے محروم اور بصارت کا ضعیف ہے اس تک نے دیکھا، شاید امام غزالیؒ ہی نے یا کسی اور بزرگ نے فرمایا ہے کہ آج جن آنکھوں نے خانۂ کعبہ کی زیارت کی ہے کل ان میں اتنی قوت و استعداد پیدا کر دی جائے گی کہ وہ رب کعبہ کا بھی دیدار کر سکیں اس مرتبہ اور اس اکرام کا کہنا لیکن اس مرتبے کی توقع تو وہ کرے جو خود ذی مرتبت ہو مجھ جیسے درماندوں اور زبوں ہمتوں کے لئے مکین کو چھوڑ کر مکان کا دیدار بجائے خود کیا کم ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ خانۂ کعبہ پر نظر کرنا ایک مستقل عبادت ہے اور شاید کسی حدیث میں یہ تصریح بھی آئی ہے کہ کعبہ پر روزانہ ایک سو بیس مرتبہ رحمتوں کا نزول ہوتا رہتا ہے جن میں سے ۶۰ ان کے لئے ہیں جو اس کے اندر نماز پڑھتے ہیں اور ۴۰ ان کے لئے جو اس کا طواف کرنے اور ۲۰ ان کے لئے جو اس کی طرف دیکھتے رہتے ہیں لیکن اجر و عبادت سے قطع نظر کر کے اپنے ذوق و شوق اور ولولہ کے لحاظ سے کون دل ایسا ہے جو ہوس دیدار سے خالی ہے اور حرص نظارہ سے کورا ہوگا؟ جی بناب کہ دیکھیے اور پھر دیکھیے دس بار دیکھیے، سو بار دیکھیے ہزار بار دیکھیے، دیکھتے رہیے اور دیکھتے جائیے اور دیکھنے سے کبھی نہ تھکیے۔

نظارۂ جنبیدن مژگان گلہ دارد

رفعت و مرتبہ و جلالت قدر کا یہ حال لیکن اسے چھوڑ دیجئے کہ یہ تو سب کو مسلم ہے اور اس میں کسی کو کلام ہی نہیں۔ یہاں ذکر کمال کا نہیں بلکہ اس دلآویزی و محبوبی کے باب میں ہو رہی تھی (بات) شیخ فرید الدین عطار اپنے تذکرۃ الاولیاء میں حضرت عبداللہ بن مبارک کی زبان سے یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں مکہ میں تھا دیکھا کہ ایک حسین نوجوان خانۂ کعبہ تک پہنچنا چاہتا ہے اتنے میں بے ہوش ہو کر گر پڑا میں اس کے پاس لپک کر پہنچا دیکھا کہ وہ کلمۂ شہادت پڑھ رہا ہے، میں نے ماجرا پوچھا تو کہا کہ میں نصرانی ہوں، چاہتا تھا کہ کعبہ کے حسن و جمال کا چل کر مشاہدہ کروں جوں ہی یہاں پہنچا غیب سے کان میں آواز آئی۔ تدخل بیت الحبیب فی قلبک و محارات الحبیب (دوست کے گھر میں قدم رکھ رہا ہے اور دل میں دوست کی دشمنی لیے ہوئے ہے۔) اللہ اللہ

حسن و جمال کی یہ کشش، منکروں تک یہ شوقِ دید! وہ جو کمال کے منکر ہیں جمال کا انکار ان سے نہ بن پڑا! عبد اللہ بن مبارکؒ کی روایت چھوڑیئے اسے سینکڑوں برس کا زمانہ ہو چکا ہے، اپنے زمانے کو دیکھئے آج اس بیسوی صدی میں اس روشنی اور روشن خیالی کے زمانہ میں کیا حال ہے؟ کتنے امریکی اور کتنے افریقی، کتنے برطانوی اور کتنے اطالوی اور کتنے جرمن اور کتنے فرنچ اس تمنا اور اس آرزو میں رہتے ہیں اور کس کس طرح بھیس بدل بدل کر وضع قطع نام و قومیت تبدیل کر کے جھوٹے مسلمان اور جعلی عرب بن بن کر اس گھر کے دیدار کو آتے رہتے ہیں۔

اور رجعیت پر اس محبوبیت پر حیرت کیوں کیجئے، آخر یہ دعا کس مقبول اور برگزیدہ کس چہیتے اور محبوب بندہ کی زبان سے نکلی تھی۔ رب اجعل ھٰذا البلد اٰمناً واجنبنی وبنی ان نعبد الاصنام ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتک المحرم ربنا لیقیموا الصلوٰۃ فاجعل افئدۃ من الناس تھوی الیھم وارزقھم من الثمرٰت لعلھم یشکرون۔ ساری دعا کو چھوڑیئے صرف اتنے ٹکڑے کو لیجیئے۔ فاجعل افئدۃ من الناس تھوی الیھم لوگوں کے دلوں میں اس وادیٔ غیر ذی زرع میں بسنے والوں کی طرف اس بے آب و گیاہ سرزمین میں ڈیرے جمانے والوں کی طرف اپنے اس پاکیزہ گھر کے جوار میں وطن بنانے والے کی طرف رغبت و کشش پیدا کر دے۔ دعا کس نے کرائی تھی! دعا کے الفاظ کس کے تعلیم کیئے ہوتے تھے؟ دعا کے لفظ خلیل اللہ کی زبان سے ادا ہوئے لیکن دعا کا القا کہاں سے ہوا تھا جس نے دعا سکھائی اس نے دعا قبول بھی کی اور جو سب کے دلوں کا مالک و حاکم ہے اسی نے دلوں میں رغبت اور کشش پیدا کر دی اور پھر مکین کے کے دل میں مکان کی عظمت، ذرا دیکھنا دعا میں یہ نہیں کہلایا جا تاکہ اس گھر کی طرف کشش ہو۔ بلکہ صرف یہ کہ اس گھر کے آس پاس بسنے والوں کی طرف کشش ہو۔ جس گھر کے جوار میں یہ مرجعیت

یہ محبوبیت یہ کشش ہو تو خود اس گھر کی کشش اور محبوبیت کو کن لفظوں میں ادا کیا جائے دعا کے لیئے اجابت خود استقبال کو آئی دعا قبول ہوئی اور ایسی قبول ہوئی کہ ابراہیم اور اسمٰعیل والے محمد صلی اللہ علیہ وسلم والے اور رب محمد والے تو الگ رہے کلکتہ اور بمبئی والے دہلی والے کشمیر اور مسوری والے نینی تال اور دار جلنگ والے، آکسفورڈ اور کیمبرج والے، لندن اور پیرس والے آج دنگ و حیران ہیں اور شمال اور جنوب سے مشرق سے مغرب سے خشکی اور تری سے ریل سے اور جہاز سے موٹر سے اور اونٹ سے، ہزاروں لاکھوں مرد و عورت بوڑھے اور جوان اُدھیڑ اور بچے ہیں کہ ٹڈی دل کی طرح امنڈے چلے آتے ہیں۔

جس گھر کی محبوبیت اور جاذبیت، گھر کے نافرمانوں اور باغیوں تک کی نظر میں ہو تو گھر کے مالک کے غلاموں اور حلقہ بگوشوں کے دلوں کی کیفیت اس کے متعلق کیا ہوگی حرم کے اندر داخل ہوتے ہی اور کعبۂ مطہر پہ نظر پڑتے ہی نہ پوچھیئے کہ دل کی کیا کیفیت ہوئی، معلم نے اس وقت کیا دعا پڑھی یہ تو یاد نہیں اور کوئی دعا پڑھی بھی تھی یا نہیں یہ بھی اب پوری طرح حافظ میں نہیں اس وقت اتنا ہوش اور دماغ کسے تھا البتہ یہ خوب یاد ہے کہ جمال مجسّم پر نظر پڑتے ہی بے اختیاری کے عالم میں بے ساختگی کے ساتھ جو دعا زبان پہ آئی وہ بے حساب و کتاب اپنی آمرزش و مغفرت کی دعا تھی خود غرضی کا یہ عالم تھا اس وقت کوئی دوسرا یاد نہیں پڑا میدانِ حشر کی طرح صرف نفسی نفسی زبان پر تھا اور سب سے پہلے صرف اپنے ہی حق میں دعا نکلی مگر چند ہی لمحوں کے بعد اپنے والے بھی بزرگ اور عزیز و دوستوں اور امتِ اسلامیہ میں جو جو بڑے یاد پڑتے گئے سب

کے حق میں دعائیں ہوتی رہیں۔ یہ تو آپ بیتی تھی لیکن کتابوں میں عموماً یہ لکھا ہوا ہے کہ خانۂ کعبہ پر اول نظر پڑتے ہی یہ دعا پڑھے اور یہی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے۔ (بہ تغیر بعض الفاظ)

اللھم زد بیتک ھٰذ تعظیما وتشریفاً ومھابۃ وزد من تعظیم وتشریفہ من حجہ وعمرۃ تعظیما وتشریفا ومھابۃ۔

ایک روایت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کے یہ الفاظ بھی منقول ہیں۔

اعوذ برب البیت من الدین والفقر ومن ضیق الصدر وعذاب القبر

حضرت عمرؓ کی بابت منقول ہے کہ وہ جب خانۂ کعبہ کو دیکھتے تو یہ دعا پڑھتے اللھم انت السلام منک السلام فحینا ربنا بالسلام۔ اور فقہائے حنفیہ نے عموماً یہ لکھا ہے کہ سب سے پہلے تین بار اللہ اکبر کہے اور کلمہ لا الہ الا اللہ پڑھے اور اس کے بعد جو دعا چاہے مانگے اس پر سب کا اتفاق ہے کہ فان الدعا مستجاب عند رویۃ البیت رویتِ کعبہ کے وقت جو دعا کی جاتی ہے مقبول ہوتی ہے مقبولیت دعا کا یہ خاص اور اہم وقت ہے آئندہ کے لئے تمام عازمین حج وعمرہ اس وقت کی اہمیت کو یاد رکھیں اور اس وقت عزیز کو ہرگز اپنی غفلت و تساہلی سے ضائع و برباد نہ ہونے دیں

صفدر گنوری

استفسار

تمرد، زعم، خود بینی، رعونت، سرکشی، کب سے
الٰہی تیرے بندوں کو خدائی آ گئی کب سے

مجھے تو انتظارِ ساقیِ محفل ہے اے رندو
پڑی ہے میرے پیچھے ورنہ شیشے کی پری کب سے

محبت کا صلہ مانگے گا عاشق اپنے ہی منہ سے
مزاجِ دوست! تجھ میں آ گئی ہے شاعری کب سے

ترے منہ میں شکر قاصد! خبر لایا ہے تو کیسی
انہیں بھی مجھ سے الفت ہو چلی ہے واقعی کب سے

چلو مانا، محبت حادثے کا نام ہے لیکن
ذرا یہ تو بتاؤ تم یہ سوجھی ہے نئی کب سے

خداوندانِ نعمت کی پناہیں چھوڑ کر سوچو
تم اپنے نفس کی چھوڑو گے کرنا پیروی کب سے

میں صفدر خود پہ حیراں ہوں کسی کا ذکر کیا اس میں
محبت کی زباں میں اتنی سختی آ گئی کب سے

بروک بانڈ کی گولڈ لیبل چائے

خوشبو والی... لذّت والی
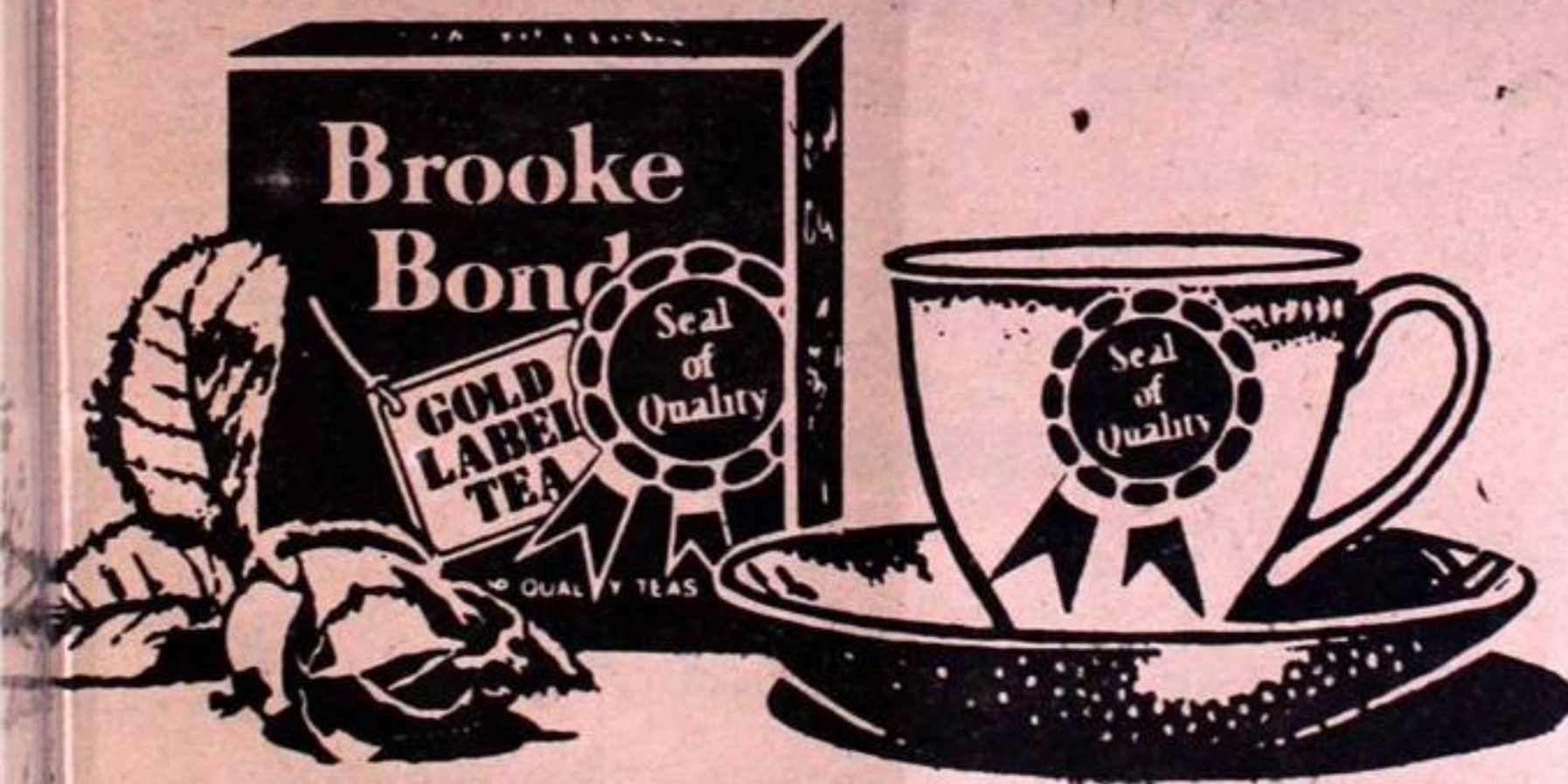
خوشبو والی... لذّت والی

گولڈ لیبل چائے کی پیالی

E 113 (U)

manhattan international

کیبا متھراوی

مولانا سیماب اور وحیٔ منظوم

ترجمہ قرآن مرقوم معہ معانی و مفہوم

شاعری ہمیشہ سے زوال و کمال اور تخریب و تعمیر کی منہ بولتی تصویر رہی ہے۔ شاعری نے قوموں کو بگاڑا بھی اور بنایا عری نے انسانوں کو سلا دیا بھی اور جگایا بھی۔ شاعری لوری بھی ہے اور رجز بھی۔ شاعری گلوں کی داستان بھی ہے اور کی زبان بھی۔ شاعری تصنع بھی ہے اور حقیقت بھی۔ شاعری نعرۂ فاسقانہ بھی ہے اور نعرۂ قلندرانہ بھی۔ شاعری جام و مینا یب بھی ہے اور میخانہ شکنی کا پیام بھی۔ شاعری دہریت کا پرچار بھی ہے اور حق کی تبلیغ بھی۔ شاعری ہوس پرور اور ہوس کار ے اور حرص و ہوس کی قطع کرنے والی تلوار بھی۔ شاعری سفلی جذبات کی ترجمان بھی ہے اور علوی خیالات کی آئینہ دار بھی۔

شاعر صاعقۂ رزم بھی ہوتا ہے۔ اور شمع بزم بھی ایک شاعر پھولوں کے سایہ میں محبوب کی یاد میں گم رہتا ہے اور ایک شاعر اروں کی چھاؤں میں رجز پڑھتا ہے۔ ایک شاعر جنسی جذبات بھڑکاتا ہے اور سفلی خیالات ابھارتا ہے اور ایک شاعر اپنے پیام لوں کو گرماتا ہے۔ اور روح کو نکھارتا ہے۔ ایک شاعر گمراہ کن خیالوں کی وادی میں بھٹکتا پھرتا ہے اور ایک شاعر حقیقت عالم میں منزل کا نشاں بن جاتا ہے۔ ایک شاعر کذب و افترا اور غلو و اغراق کے جام پلاکر حقیقت سے دور کرتا ہے اور شاعر صدق و صداقت کے چراغ روشن کر کے حقیقت کا راستہ دکھاتا ہے۔ ایک شاعر صرف باتیں بناتا ہے جو کہتا ہے اس نہیں کرتا اور ایک شاعر خود بھی عمل کرتا ہے اور دوسروں کو بھی دعوت عمل دیتا ہے۔ ایک شاعر دہریت کا نقیب ہوتا ہے اور شاعر ایمان و عرفان کا خطیب اس لیے کلام ربانی میں دونوں قسم کے شعرا کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

والشعراء یتبعھم الغاون ۝ الم تر انھم فی کل واد یھیمون ۝ وانھم یقولون مالا یفعلون ۝ الا الذین امنوا وعملوا الصلحت وذکروا اللہ کثیرا وانتصروا من بعد ما ظلموا وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون ۝ (الشعراء)

رہے شعرا تو ان کے پیچھے بہکے ہوئے لوگ چلا کرتے ہیں۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں اور ایسی باتیں کرتے ہیں جو کرتے نہیں ہیں۔ بجز ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے۔ اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے ہیں اور جب ان پر ظلم کیا گیا تو صرف بدلہ لیا۔ اور ظلم کرنے والوں کو عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس انجام سے دوچار ہوئے ہیں۔

ان آیاتِ مبارکہ کی تفسیر و مفہوم مولانا مودودی کی تفہیم القرآن (جلد سوئم) کی روشنی میں ملاحظہ ہو۔

ایسے بھی شاعر ہیں جو ہر وادی میں بھٹکتے ہیں"۔ یعنی کوئی ایک متعین راہ نہیں ہے جس پر وہ سوچتے اور اپنی قوتِ گویائی صرف کرتے ہوں بلکہ ان کا توسنِ فکر ایک بے لگام گھوڑے کی طرح ہے جو ہر وادی میں بھٹکتا پھرتا ہے اور جذبات یا خواہشات و اغراض کی ہر نئی رَو ان کی زبان سے ایک نیا مضمون ادا کرتی ہے جسے سوچنے اور بیان کرنے میں اس بات کا کوئی لحاظ سرے سے ہوتا ہی نہیں کہ یہ بات حق و صدق کی بھی ہے؟

اور ایسے شاعر بھی ہیں کہ جن کے شعروں کے متعلق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تھا کہ "ان من الشعر لحکمہ۔ بعض اشعار حکیمانہ ہوتے ہیں"۔ اُمیہ بن ابی الصلت کا کلام سن کر آپ نے فرمایا۔ "امن شعرہ و کفر قلبہ" اس کا شعر مومن ہے مگر اس کا دل کافر ہے"۔ ایک مرتبہ ایک صحابی نے سو کے قریب عمدہ عمدہ اشعار آپ کو سنائے، آپ فرمانے لگے

ایسے بھی شاعر ہیں جن کے لئے ارشادِ باری ہے کہ وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں۔

اس کی تفسیر و بیان کرتے ہوئے مولانا مودودی فرماتے ہیں۔ "وہ سخاوت کا مضمون اس زور سے بیان کریں گے کہ آدمی سمجھے گا کہ شاید ان سے بڑھ کر دریادل کوئی نہ ہوگا مگر عمل میں کوئی دیکھے تو معلوم ہوگا کہ سخت بخیل ہیں۔ بہادری کی باتیں کریں گے مگر خود بزدل ہونگے بے نیازی، قناعت و خودداری کے مضامین باندھیں گے مگر خود حرص و تمنا میں ذلت کی آخری حد کو پار کر جائیں گے۔ دوسروں کی ادنیٰ کمزوریوں پر گرفت کریں گے مگر خود بدترین کمزوریوں میں مبتلا ہوں گے"۔

ایسے شاعر ہر دور میں رہے عصرِ حاضر میں بھی ایسے شاعر بکثرت ہیں جو کسانوں کے غمخوار بنتے ہیں، مزدوروں کے ہمدرد کہلاتے ہیں غریبوں کی وکالت کرتے ہیں۔ ظلم و تشدد کے خلاف بڑی بڑی نظمیں لکھتے ہیں۔ مگر اپنی نجی زندگی میں کسانوں کا خون ان کے لئے بادۂ ناب بن جاتا ہے، مزدوروں کا خون نچوڑتے ہیں، ان کی اجرت ہضم کر کے فاتحانہ مسکراتے ہیں۔ غریبوں کو نفرت و حقارت سے ٹھکرا دیتے ہیں۔ مظلوموں پر ظلم ہوتا دیکھ کر اپنے ہونٹ سی لیتے ہیں۔

اور ایسے شاعر بھی ہیں جن کے لئے ارشاد ہوا کہ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے اور اللہ کو کثرت سے یاد کیا اور ان پر جب ظلم کیا گیا تو صرف بدلہ لے لیا۔

مولانا مودودی لکھتے ہیں کہ "یہاں شعرا کی اس عام مذمت سے جو اوپر بیان کی گئی ہے ان شعرا کو مستثنیٰ کیا گیا جو چار خصوصیات

کے حامل ہوں۔

(۱) اوّل یہ کہ وہ مومن ہوں۔ یعنی اللہ اور اس کے رسول اور اس کی کتابوں کو سچے دل سے مانتے ہوں اور آخرت پر یقین رکھتے ہوں۔

(۲) دوسرے یہ کہ عملی زندگی میں صالح ہوں بدکار اور فاسق و فاجر نہ ہوں، اخلاق کی بندشوں سے آزاد جھک مارتے نہ پھریں
تیسرے یہ کہ اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے ہوں اپنے عام حالات اور واقعات میں بھی اور اپنے کلام میں بھی یہ نہ ہو کہ شخصی زندگی تو زہد و تقوٰی سے آراستہ ہے مگر کلام سراسر رندی و ہوسناکی سے لبریز۔ اور یہ بھی نہ ہو کہ شعر میں تو بڑی حکمت و معرفت باتیں بگھاری جا رہی ہوں مگر ذاتی زندگی دیکھئے تو یادِ خدا کے سارے آثار سے خالی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں حالتیں یکساں مذموم ہیں۔ ایک پسندیدہ شاعر وہی ہے جس کی نجی زندگی بھی خدا کی یاد سے معمور ہو اور شاعرانہ قابلیتیں بھی اس راہ میں وقف رہیں خدا سے غافل لوگوں کی نہیں بلکہ خدا شناس، خدا دوست اور خدا پرست لوگوں کی راہ ہے

چوتھی صفت ان مستثنیٰ قسم کے شاعروں کی یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ شخصی اغراض کے لیئے کسی کی ہجو نہ کریں نہ ذاتی یا نسلی و قومی عصبیتوں کی خاطر انتقام کی آگ بھڑکائیں۔ مگر جب ظالموں کے مقابلے میں حق کی حمایت کی ضرورت پیش آئے تو پھر زبان سے وہی کام لیں جو ایک مجاہد تیر و شمشیر سے لیتا ہے۔ ہر وقت گھگھیاتے ہی رہنا اور ظلم کے مقابلے میں نیاز مندانہ معروضات پیش کرتے رہنا مومنوں کا شیوہ نہیں ہے۔"

مولانا سیماب اکبر آبادی ان شعرا میں سے تھے جنہیں عام شعرا کی روش سے مستثنیٰ قرار دیا جا سکتا ہے۔ رندی و سرمستی، بادہ نوشی، فحش گوئی، بے عملی اور غیر سنجیدگی سے انہیں ہمیشہ نفرت رہی۔ ان کی زندگی دیانت دارانہ جد و جہد مجاہدانہ عمل اور سرگرمِ صادقانہ مساعی کا نمونہ رہی۔ قدرت نے انہیں خصوصیات کے پیشِ نظر ان سے وہ عظیم کارنامہ انجام دلایا جو رہتی دنیا تک محفوظ و مامون رہے گا۔ کلام الہٰی کا منظوم ترجمہ کرنے کا اہل ایسی ہی خصوصیات کا حامل شاعر ہو سکتا ہے۔

مولانا سیماب کی زندگی اور شاعری مجموعی حیثیت سے صالح شعرا کے معیار پر کافی حد تک پوری اترتی ہے۔
مولانا سیماب اللہ، اس کے رسولؐ اور اس کی کتابوں کو سچے دل سے مانتے تھے۔ آخرت پر یقین رکھتے تھے راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ ذاتی مشاہدے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ مذہبی احکامات کی پابندی پر مائل تھے اُن کی زندگی صاف ستھری پاکیزہ اور مہذب تھی۔ محلہ کی مسجد میں فجر کی نماز باجماعت پڑھتے اور دوسری نمازیں مشاغل کی کثرت کی وجہ سے جہاں موقع مل جاتا ادا کرتے۔ تلاوتِ کلام ان کا شغف تھا۔ راست گوئی ان کا شعار، صبر و ضبط، ایثار و ہمدردی اور خوش اخلاقی ان کی خوبی
مجھے یاد آتا ہے کہ اب سے چالیس۔ پینتالیس سال قبل برصغیر کے ادبی رسائل میں مشاہیر شعرا نے اپنی زندگی کے نظام الاوقات اور مقاماتِ ملاقات منظوم شائع کرائے تھے۔ وہ نظمیں تو اب میرے پاس نہیں رہیں۔ اپنی یادداشت کے سہارے بعض مصرعے پیش کر رہا ہوں جن سے مفہوم واضح ہو جائے گا۔

کسی نے اپنے لئے کہا تھا — وہ سیرِ کتاں صحنِ گلستاں میں ملے گا
کسی نے کہا تھا — وہ نغمہ فشاں بزمِ حسیناں میں ملے گا

کسی نے کہا تھا — وہ نعرہ زناں حلقۂ رندان میں ملے گا

کسی نے کہا تھا — وہ جام بدست اپنے خمستان میں ملے گا

لیکن سیماب اور صرف سیماب نے کہا تھا۔ وہ وقتِ سحر معبدِ یزداں میں ملے گا

شاعری میں مولانا سیماب ہمیشہ پاکیزہ خیالات اور متعین اسالیب بیان کے مناد رہے انہوں نے مشاعروں میں اپنے خطبات کے ذریعہ اپنے مسلک اور اپنے خیالات کا اظہار علیٰ رؤس الاشہاد کیا۔ انہوں نے خود بھی عمل کیا اور دوسروں کو بھی دعوت عمل دی فحش نگاری کے وہ سخت دشمن تھے۔ کورانہ تقلید کے خلاف تھے اور اجتہاد کے قائل۔

اس قسم کی شاعری جس میں تقلید اور غیر فطری جذبات کے زیادہ سے زیادہ جراثیم پائے جاتے ہیں۔ ایک رواجی بدعت ایک بے اصولی اور ایک غلط ذہنی تربیت کے ماتحت مروج ہے جس میں عام اور پست نیز قدیم معاشرت کی تصویریں کھینچی جاتی ہیں وصل وصال۔ ہم خوابی، ہم آغوشی۔ بوس وکنار اور ایسے ہی مخرب اخلاق اور تہذیب سوز مناظر دکھائے جاتے ہیں۔ اور پھر رونا یہ ہے کہ یہ موضوعات بھی اس صادق جذباتی کیفیت سے خالی لہجے میں ظاہر کئے جاتے ہیں جس سے تقلید اور نقالی تو ضرور ہوتی ہے لیکن حقیقت کا کہیں پتہ نہیں چلتا اگر اس قسم کی شاعری پر ملک کا تعلیم یافتہ اور مہذب طبقہ ہنستا ہے تو میرے خیال میں وہ حق بجانب ہے۔"

(خطبۂ صدارت مشاعرہ امدادی بہرار ۲۹ر نومبر ۱۹۳۰ء خطبات شاعری)

"یاد رکھیے شاعری جس طرح جذبات قومی کے نشر واعلان کے لیئے ایک ذریعہ مخصوص ہے اسی طرح مذہب کے اثرات کو سماعت گزیں اور دل نشین کرنے کا بھی ایک خاص وسیلہ ہے" (خطبۂ صدارت آل انڈیا قومی مشاعرہ گیا ۲۴ر دسمبر ۱۹۲۲ء)

"مشاعروں میں شریک ہونا کسی مصرعۂ مطروحہ پر غزل کہہ لینا اور اس کے صلہ میں واہ واہ کی داد حاصل کر لینا آج ایک مبتدی اور نومشق طالب علم شعر کے لیئے بھی آسان ہے لیکن آپ حضرات میں سے جو لوگ اپنی عمر میں اس فن شریف ولطیف کی نشو میں صرف کر چکے ہیں اب ان کا کام کچھ اور ہونا چاہیئے — ان کا کام یہ ہونا چاہیئے کہ وہ شاعری میں اجتہاد کے دروازے اپنے آزمودہ کار قلم کی قوت سے کھول دیں اور اردو شاعری کو اس ارتقاع پر پہنچا دیں جس کے لیئے وہ حقیقت میں بنائی گئی ہے۔" (خطبۂ صدارت مشاعرہ بزم ادب ڈیرہ دون ۱۳ر دسمبر ۱۹۳۰ء)

"میں غزل میں پاکیزہ تغزل کا مخالف نہیں لیکن شاعری کو تغزل محض تک محدود رکھنا بھی نہیں چاہتا۔ غزل کی تعریف معاملہ بندی کہہ کر خاموش ہو جانا غزل اور تغزل دونوں کی توہین ہے۔ تغزل کو قدرتی طور پر نغمانیت سے پاک اور روحانیت سے لبریز ہونا چاہیئے۔ حقیقی تغزل وہی ہے جس کی بنیادیں جذباتِ لطیفہ پر قائم کی گئی ہوں اور جس میں ابتذال اور رکاکت کا شائبہ تک نہ ہو"۔

سیماب کی غزلیں ہوں، نظمیں ہوں، رباعیاں ہوں غرض ان کا تمام کلام فحش اور متبذل خیالات سے پاک ہے۔ ان کی زبان زمزم سے دھلی اور ان کے خیالات کوثر میں نہائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اس سے بڑھ کر ان کی شاعری کی پاکیزگی کا اور کیا ثبوت ہوگا کہ انہوں نے شاعری سے جام و مینا بادہ و سبو، ساقی و میخانہ کے قبیل کے تمام الفاظ کانفی نفسہ اس

طرح اخراج فرمایا کہ بدمستی کے معنی پیدا نہ ہوں۔ بغیر اضافت اور استعارے کے ان الفاظ کا استعمال ممنوع قرار دیا ہے۔ خود بھی اجتناب کیا تلامذہ سے بھی اجتناب کرایا اور باقاعدہ اس کی تحریک چلائی۔ ان کی ضرب میخانہ شکن مشہور ہے انہوں نے قوم وطن اور انسان کو خوابِ غفلت سے جگایا۔ مدہوشی اور بیخودی سے چونکایا اور ذلت و پستی سے ابھارا فرماتے ہیں۔

میں غفلت سے سونے والوں کی نیند اڑانے آیا ہوں — دنیا کو جگا کر چھوڑوں گا دنیا کو جگانے آیا ہوں
میں سوز وفا کا دنیا کو پیغام سنانے آیا ہوں — جو بجھنے لگے تو بجھ نہ سکے وہ آگ لگانے آیا ہوں
انوار حقیقت کی کرنیں جور و کے رو کے رہتی ہیں — وہ اونچی اونچی باطل کی دیواریں ڈھانے آیا ہوں
ساقی و شراب و میخانہ میری دنیا سے خارج ہیں — میں تشنہ لبوں کو صہبائے تجدید پلانے آیا ہوں
انفاس محبت میں بھر کے پیغام حیاتِ باقی کے — مرنے والوں کو جینے کے انداز سکھانے آیا ہوں
سیماب مرا ساز ہستی نغمات ازل کا حامل ہے — کچھ گیت سنا کر جاؤں گا کچھ گیت سنانے آیا ہوں

مولانا سیماب کی نجی زندگی میں فرض شناسی کا جذبہ بھی تھا اور پیہم محنت اور مسلسل جدوجہد کا عملی اظہار بھی انہوں نے اپنی انتھک سعی اور مستقل دیانت و صداقت کے سہارے اپنا بلند مقام خود پیدا کیا تھا۔ انہوں نے اپنی شاعری میں جو پیغام دیا اس پر اپنی زندگی میں خود عمل کیا۔ خمریات کے وہ پاس بھی ہو کر نہیں گزرے۔ عجب و تکبر کا ان پر سایہ بھی نہیں پڑا تھا ان کا دل اخلاق حسنہ کا سرچشمہ تھا محبت ان کی فطرت تھی اور مروت ان کی عادت ہر چھوٹے بڑے سے خندہ پیشانی سے ملتے اور ان کی دلداری کو دلجوئی کرتے۔

جھکائے سر بہ ادائے نیاز بیٹھ گئے — غرور حسن کو بے اعتبار کیا کرتے
کوئی یہ شکوہ سرایان جور سے پوچھے — وفا بھی حسن ہی کرتا تو آپ کیا کرتے

شورش انہیں پسند نہیں تھی وہ خاموشی سے اپنی دھن میں لگے رہتے۔

لفظوں کے پرستار خبر ہی تجھے کیا ہے — جب دل سے لگی ہو تو خموشی بھی دعا ہے

بے نیازی ان کی فطرت تھی۔

رئیس لامکاں ہوں بے نیازی میری فطرت ہے — مذاق آرزو تو بر بنائے آدمیت ہے

قدرت کی طرف سے مسلسل جد و جہد کرنے کی صلاحیت انہیں عطا ہوئی تھی۔

حریم حسن بھی گیا بن کے سنگ آئینہ بیٹھوں — میں پروانہ ہوں مجھ کو رقص کرنے کی اجازت ہے

زندگی کے طوفانوں سے وہ کبھی نہ گھبرائے۔ ناخدا کا سہارا انہیں پسند نہیں تھا وہ ناخدا کی بے بسی جانتے تھے خود شناسی۔ خود اعتمادی اور خدا دوستی کے سہارے وہ ہر موج بلا سے نبرد آزما رہے

ناخدا مایوس ہے، تو میری کشتی چھوڑ دے — ناخدا کی کیا ضرورت ہے خدا رکھتا ہوں میں
راہبر ہٹ جائیں میرے جادہ دشوار سے — اپنی ہر ٹھوکر میں اک منزل نما رکھتا ہوں میں
صبح گل سے اخذ کر لیتا ہوں شام گلکدہ — ذہن میں ہر ابتدا کی انتہا رکھتا ہوں میں

ہیں جو کافر مجھ کو آمادہ مٹانے کے لئے ۔ کوئی ان سے صرف یہ کہہ دے، خدا رکھتا ہوں میں

ان پر جا و بیجا اعتراضات ہوتے رہے ان کی ذاتی مخالفتیں کی گئیں۔ ان کے خلاف سازشیں ہوئیں۔ ان کے نے انہیں ان کے بلند مقام سے گرانے کی کوششیں کیں۔ لیکن انہوں نے ذاتی طور پر کسی کے خلاف کبھی ایک لفظ نہیں کہا۔ اپنے تلامذہ کو بھی منع کرتے رہے کہ میری ذاتی مخالفتوں کا جواب نہ دو انہوں نے کبھی کسی کی ہجو نہیں لکھی اور نہ کبھی شان میں قصیدے پڑھے لیکن جب ادبی مذہبی۔ قومی ملکی اور ملی، کوئی محاذ قائم ہوا تو ان کا قلم تیر و سناں بن گیا۔ وہ برق و شرر بن کے چھپٹے۔ طوفانی موجوں سے لڑے اور باطل کی قوتوں سے نبرد آزما ہو گئے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ وہ فرشتہ تھے غلطی و خامی سے مبرا۔ خامیاں اور کمزوریاں بشریت کا تقاضا ہیں۔ اس کا انہیں خود بھی اعتراف تھا۔

ازل سے سہو و خطا ہے سرشت میں میری۔ ہے اعتراف کہ سیماب آدمی ہوں میں

لیکن بہ حیثیت مجموعی ان کی زندگی اور ان کی شاعری اعلیٰ اقدار کی حامل رہی انہوں نے جس بات کو حق سمجھا اس کے اظہار میں کبھی تامل نہیں کیا۔

مولانا سیماب کی ہمہ گیر شخصیت اور ان کی ادبی خدمات کا جائزہ ایک مختصر مقالہ میں سمندر کو کوزہ میں بند کرنے کے مترادف ہے جس عظیم شخصیت نے کلام ربانی اور مولانا روم کے ضخیم دفتروں کا اردو منظوم ترجمہ کر کے عظیم ابدی کارنامے انجام دیئے ہوں۔ جو ساز آہنگ کار امروز، کلیم عجم، سدرۃ المنتہیٰ ورائے سدرہ، لغیر غم ۔ سرود غم اور عالم آشوب جیسے شاہکار تخلیق کر چکا ہو۔

جو زود گوئی میں بے مثال ۔ اور تاریخ گوئی میں لاجواب ہو نظم میں ہی نہیں جس نے نثر میں بھی موتی بکھیرے ہوں بلکہ بکثرت چھوٹی بڑی اصلاحی اور اخلاقی کتابیں چھوٹے بڑوں کیلئے لکھی ہوں۔ جس نے خطبات شاعر لکھ کر مقدمہ شعر و شاعری کی شاعروں کو مشعل راہ دکھائی ہو اور شعر و ادب کی اصلاح کی ہو جس نے صحافت میں تاج، پیمانہ، ثریا، اور پرچم جیسے روزنامے ماہنامہ چراغ روشن کیئے ہوں اور جس نے آخر عمر میں سیرۃ النبیؐ لکھ کر زاد آخرت اکٹھا کیا ہو اس پر تو باقاعدہ تحقیقی کتابیں شائع کرانے کی ضرورت ہے۔ اس کی خدمات کا احاطہ سالانہ یوم سیماب پر صرف چند تقریروں اور جرائد میں چند مقالوں کی صورت میں نہیں کیا جا سکتا۔ شکر ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں اب کچھ طالبانِ ادب اس پر تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ اور کچھ خاصانِ ادب اس پر پی ایچ ڈی کر چکے ہیں۔ بہر طور ابھی مزید اور مزید کام کی ضرورت ہے۔

زیر نظر مقالہ میں مولانا سیماب کے ایک ابدی شاہکار وحی منظوم ترجمہ قرآن پاک مرقوم پر کچھ اظہار خیال کرنے کی سعی کی جا رہی ہے تاکہ مستقبل کے مورخ کو اس کے متعلق کچھ ارشادات مل سکیں۔ السعی منی والاتمام من اللہ

وحیٔ منظوم کے محرکات۔ مولانا سیماب مومنانہ طبیعت رکھتے تھے۔ مذہب سے انہیں دلی شغف تھا اسلامی اقدار انہیں عزیز تھیں۔ مذہبی کتب مطالعہ میں رہتی تھیں۔ تلاوت کلام مجید ان کا معمول تھا۔ فطری شاعر تھے قدرت نے انہیں غیر معمولی قوت انجذاب بھی دی تھی اور قوتِ ابلاغ بھی وہ اپنے محسوسات کو محسوس کرانے کی صلاحیت

بھی رکھتے تھے۔ نیکی کرو اور نیکی پھیلاؤ۔ قرآن پڑھو اور قرآن پڑھاؤ ان کا مسلک تھا۔ زبان و بیان پر انہیں غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ اس کا اظہار وہ مثنوی مولانا روم کے ضخیم دفاتر کو اردو کا منظوم جامہ پہنا کر پہلے ہی کر چکے تھے۔ انہیں قدرت کی اس عطا کردہ قدرت پر اعتماد تھا۔ رضائے الٰہی پیش نظر تھی اس لئے انہوں نے اللہ کا نام لے کر یہ عظیم کام شروع کر دیا اور اللہ نے مدد فرمائی۔ مولانا کے دل میں یہ کارنامہ انجام دیتے وقت۔ نہ ستائش کی تمنا تھی نہ صلے کی پروا۔ نہ شہرت کی تمنا۔ خدا کے فضل سے شہرت انہیں حاصل تھی۔ داد و ستائش انہیں میسر تھی۔ ہندوستان کا کوئی گوشہ ایسا نہیں تھا جو سیماب کے نام اور کام سے نا آشنا ہو۔ متوسط زندگی بہ آرام گزر رہی تھی۔ بیرون ہندوستان بھی ان کی شہرت کے پرچم لہرا رہے تھے۔

بساطِ دہر کی سیماب گرمی ہیں مرے نغمے
مرا چرچا عرب تک ہے مری شہرت عجم تک ہے

وحیٔ منظوم کے محرکات میں دو جذبوں کو بڑا دخل تھا۔ (۱) رضائے الٰہی کا حصول (۲) دل کی یہ تمنا کہ قرآن مجید کا ہمہ گیر قانون ہر خاص و عام تک دلنشین اور پر اثر انداز میں پہنچانا فرض انسانیت ہے۔

انہیں دو جذبوں سے بے چین ہو کر مولانا اس مشکل کام کو انجام دینے کے لئے کمر بستہ ہو گئے۔ توفیق الٰہی اگر مدد نہ کرتی تو اس کی تکمیل ایک مختصر عرصہ میں ممکن نہ تھی۔ یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے۔

انعام و اکرام ۔ مولانا سیماب کا شعر ہے۔

فطرتِ طلب معلوم۔ ہاں مگر یہ دیکھا ہے
جس نے چھوڑ دی دنیا اس کے ساتھ دنیا تھی۔

یہاں دنیا چھوڑ دینے میں تو مولانا نے بڑی رمزیت سے کام لیا ہے لیکن اتفاق کی کرشمہ کاری دیکھئے کہ مولانا نے دنیا کو خیرباد کہہ تو دیا، دنیا نے ان کے عظیم کارنامے کی قدر کی۔ ۲۵ رمضان المبارک ۱۳۶۵ھ ہجری کو جس کی بنیاد ڈالی گئی اس شاہکار (وحیٔ منظوم) پر ۲۸ رمضان المبارک ۱۴۰۱ھ ہجری کو پورے ۳۷ سال بعد صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کی چشم توجہ پڑی اور اسے انعامات سے نوازا گیا۔ ایک خصوصی تقریب میں، اردو، بلوچی، سرائیکی، اور سندھی میں قرآن پاک کے ان تراجم کو صدرِ پاکستان نے انعامات عطا کیے جنہیں حکومت کی ایک منتخبہ کمیٹی نے برائے انعام منتخب کیا تھا۔ اردو میں یہ اعزاز مولانا سیماب کے وحیٔ منظوم کو ملا۔ اس تقریب کی روداد ریڈیو پر سنائی گئی۔ ٹی وی پر دکھائی گئی اور اخبارات میں شائع ہوئی۔

روزنامہ جنگ میں شائع شدہ روداد کا اقتباس آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

”بیش بہا موتی“

”صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے ان دانشوروں اور اہل علم کو بیش بہا موتی قرار دیا جن کو انہوں نے قرآن پاک اور اس کے ترجمے کی اشاعت کرنے کی نمایاں خدمات انجام دینے پر انعامات دیئے۔“

یہ الفاظ انہوں نے قومی ہجری کمیٹی کے زیر اہتمام ۲۸ رمضان المبارک ۱۴۰۱ھ ہجری کو منعقد ہونے والی تقریب کے اختتام پر کہے۔ جناب صدر، مہمانانِ گرامی اور اہل علم نے یہیں روزہ افطار کیا۔ اور نماز مغرب ادا کی اس تقریب کا اہتمام قومی ہجری کمیٹی اور اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد نے کیا جو جشنِ ہجری کا ایک حصہ تھا۔ اس تقریب میں اسلامی یونیورسٹی کے ریکٹر اور قومی ہجری کمیٹی کے چیئرمین جناب اے کے بروہی وفاقی شرعی عدالت کے چیئرمین جناب جسٹس آفتاب حسین وزارتِ اطلاعات و نشریات

کے سکریٹری میجر جنرل مجیب الرحمن۔ وزارت تعلیم کے جناب اے زیڈ فاروقی۔ اسلامی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر اے ڈبلیو۔ جے ہالیپوٹا۔ ایڈمنسٹریٹر اسلام آباد جناب اسلم باجوہ اور چند دیگر اسکالروں نے شرکت کی۔

جن اہلِ علم کو ان انعامات کے لئے منتخب کیا گیا ان میں علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم، مولوی عبدالصمد مرحوم، مولوی خیر محمد ندوی۔ ڈاکٹر عبدالحق مہر، مولانا الحاج احمد علی مرحوم، ماسٹر عبداللہ اور قاری عبدالسبحان شامل تھے۔

علامہ سیماب اکبرآبادی کے صاحبزادے جناب مظہر صدیقی نے انعام وصول کیا۔ علامہ مرحوم نے جن کا انتقال ۱۹۵۱ء میں ہوا وحی منظوم کے نام سے قرآن پاک کا منظوم ترجمہ کیا تھا یہ ترجمہ سیماب اکیڈمی (پاکستان) کراچی کی جانب سے زیر طبع ہے۔

علامہ مرحوم ایک نامی گرامی شاعر اور اہلِ علم تھے۔"

مولانا سیماب عمر بھر پیکر توکل رہے۔ خوددار و خودشناس۔ کبھی کسی کے آگے جیب منفعت کے لیئے مرخم نہ ہوئے۔

جادۂ توکل بھی ایک عجیب جادہ تھا میں جدھر بھی جاتا تھا ٹھوکروں میں دنیا تھی۔

ترجمہ کا آغاز و اختتام۔ مولانا سیماب نے ۲۵ رمضان المبارک ۱۳۶۵ھ کو کلام الٰہی کے منظوم ترجمہ کا آغاز کیا اور درمیان میں کچھ وقفوں کے بعد ۲۱ شعبان المعظم ۱۳۶۶ھ کو مکمل کر لیا تقریباً سات مہینے اور کچھ دن اس شاہکار کی تکمیل میں صرف ہوئے جس سے ابدیت کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں اور پھوٹتی رہیں گی۔

امدادی کتب اور طریقۂ ترجمہ۔ حسبِ حوالہ "الوارث" بمبئی سیماب نمبر۔ اثنائے ترجمہ میں مولانا کے سامنے دو میزوں پر مختلف مشاہیر علماء اور فقہا کے مشہور ترجمے، تفسیریں اور لغات رہتے تھے مولانا قرآن مجید کی ایک آیت پڑھتے خود اس کا ترجمہ کرتے اور پھر مختلف تراجم پر نظر ڈالتے اس کے بعد تفسیریں دیکھتے بعد ازاں اس آیت کا ترجمہ فرماتے۔ پارے کی تکمیل کے بعد شیرینی پر فاتحہ دیتے اور بچوں میں تقسیم کر دیتے۔

آدابِ ترجمہ نگاری ترجمہ کرنے سے پہلے مولانا ہمیشہ وضو کر کے بیٹھتے۔ پاکیزگی کا بطور خاص خیال رکھتے۔ حتی الامکان قبلہ رو رہتے۔

تطبیق و استناد۔ تکمیل ترجمہ کے بعد مولانا ترجمہ منظوم لے کر دہلی تشریف لے گئے۔ وہاں دو مہینے کامل قیام فرما کر مولانا حفظ الرحمن سیوہاری۔ مفتی عتیق الرحمن عثمانی اور مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی ایم اے فاضل دیوبند، ایڈیٹر رسالہ "برہان" سے تطبیق آیات کے ساتھ ترجمے کی صحت کی گئی۔ ان تینوں حضرات کی تصدیقات خاتمہ ترجمہ پر انہیں کے قلم سے ثبت ہیں۔ اس کے بعد مولانا نے پھر ایک دورہ کیا۔ اس دورے میں دہلی۔ دیوبند، لکھنو، لاہور اور کراچی کا سفر کیا۔ مولانا حسین احمد مدنی۔ مولانا احمد علی صاحب لاہوری۔ خواجہ حسن نظامی دہلوی۔ مفتی محمد صادق صاحب کراچوی، مولوی محمد میاں صاحب وغیرہ سے تصدیقات حاصل کیں۔ اس طرح بارہ تصدیقات ہیں جو تصدیق کرنے والے حضرات کے قلم سے وحیِ منظوم کے آخر میں درج ہیں۔

"ترجمے کی خصوصیات۔ عام طور پر کسی ترجمہ میں حسب ذیل خصوصیات ہونی چاہیئے۔

۱۔ ترجمہ اصل کے مطابق ہو ۲۔ حتی الامکان ترجمے میں اصل کے ہر لفظ کے معنی ہوں۔ ۳۔ ترجمہ عام فہم ہو، گنجلک اور غیر مانوس نہ ہو۔ ۴۔ جس زبان میں ترجمہ ہو اس کے روزمرہ کا خیال رکھا جائے۔ ۵۔ صحتِ زبان بھی ہو اور زورِ بیان بھی۔

قرآن پاک کے ترجمہ میں بطور خاص خیال رہے کہ دوسرے مستند مترجمین کی ڈگر سے علیحدہ نہ ہو یا منظوم ترجمے میں اگر وزن پورا کرنے کے لیے کسی لفظ کا اضافہ ناگزیر ہو وہ لفظ سیاق وسباق کے مطابق ہو۔ لبطور وضاحت اور ربط استعمال کیا جائے۔ اس اضافی لفظ کو بریکٹ میں علیحدہ لکھا جائے۔ ترجمے کی کامیابی یہ ہے کہ اگر اس وضاحتی لفظ کو علیحدہ کر لیا جائے یا نہ پڑھا جائے تو بھی تشنگی محسوس نہ ہو بلکہ مفہوم واضح رہے۔ اضافی الفاظ کی کثرت نہ ہو۔

مولانا سیماب کے منظوم ترجمے میں اصل کی مطابقت بھی ہے، ہر لفظ کے معنی بھی ہیں۔ سلاست و روانی بھی ہے، صحتِ زبان بھی ہے۔ اور زورِ بیان بھی ہے۔ مستند مترجمین کے تراجم کے مطابق ہے۔ اضافی اور وضاحتی الفاظ مختصر ہیں۔ کہیں کہیں ہیں اور جہاں ہیں وہاں سیاق وسباق کے مطابق ہیں۔ روزمرہ کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔ اور عام فہم ہوتے ہوئے بھی ترجمہ ادبیت لئے ہوئے ہے

بطور نمونہ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

اصل کے مطابق۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ترجمہ۔ نام سے اللہ کے کرتا ہوں آغازِ (بیاں) جو بڑا ہی رحم والا ہے نہایت مہرباں

صرف ایک اضافی لفظ بیاں ہے۔ جو بریکٹ میں بند ہے۔ اس لفظ کو نکال کر پڑھیئے ترجمہ اصل کے مطابق بالترتیب معنی اور رواں ہے۔

الحمد للہ رب العالمین لا الرحمٰن الرحیم ۵ مالک یوم الدین ۵

ترجمہ۔ ہیں سزاوارِ خدائے (پاک) ساری خوبیاں (جو ہے) رب سارے جہانوں کا رحیم و مہرباں
ہے وہی انصاف کے دن کا بھی مالک (بے گماں)

تین مصرعوں میں صرف تین لفظ وضاحتی ہیں۔ پاک، جو ہے، بے گماں، انہیں نہ پڑھیئے تو بھی ترجمہ اصل کے مطابق ہے

۲ اصل کے ہر لفظ کے معنی۔ ایاک نعبد وایاک نستعین

ترجمہ۔ (یاالٰہی) ہم فقط کرتے ہیں تیری بندگی اور ہوتے ہیں تجھی سے طالب امداد بھی

ہر لفظ کے معنی موجود ہیں لفظی ترجمہ ہے جس میں روانی بھی ہے اور برجستگی بھی صرف یاالٰہی جو بریکٹ میں ہے وضاحت اور ربط کے لیئے لایا گیا ہے۔ جو سیاق وسباق کے مطابق ہے۔

اھدنا الصراط المستقیم لا صراط الذین انعمت علیھم لا

ترجمہ (یاالٰہی) ہم کو سیدھے راستے پر تو چلا ان کا رستہ جن پہ انعام (وکرم) تیرا ہوا

پہلے مصرعہ میں وضاحت کے طور پر (یاالٰہی) اور دوسرے مصرعہ میں انعام (وکرم) اضافی الفاظ ہیں، جو سیاق وسباق کو ملحوظ رکھتے ہوئے نظم کئے گئے ہیں ان سے زورِ بیان بھی پیدا ہو گیا اور وضاحت بھی ہو گئی۔ ان کے علاوہ ترجمہ میں ہر لفظ کے معنی اس کی ترتیب کے مطابق موجود ہیں۔ ہم کو سیدھے راستہ پر تو چلا ان کا رستہ جن پر انعام تیرا ہوا۔

غیر المغضوب علیھم ولا الضالین ع

ترجمہ (نگاہ) راستہ ان کا نہیں جن پر غضب (کی) ہے نگاہ۔۔ اور نہ ان کا راستہ جو ہو گئے گم کردہ راہ

صرف پہلے مصرعہ میں کی اور نگاہ۔ ربط اور سیاق و سباق کے مطابق اضافی الفاظ آئے ہیں۔ ان کے نکال دینے کے بعد بھی مفہوم واضح ہے اور ترجمہ میں ہر لفظ کے معنی موجود ہیں (راستہ ان کا جو گم کردہ راہ ہو گئے)

۳ ترجمہ میں روانی۔ وحیٔ منظوم کے ہر شعر اور ہر مصرعہ میں روانی اور برجستگی ہے پڑھتے وقت یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ ہے۔

الذین یومنون بالغیب و یقیمون الصلوۃ و مما رزقنٰھم ینفقون ۝

ترجمہ۔ غیب پر جن کو یقین ہے اور جو پڑھتے ہیں نماز ۔ خرچ کرتے ہیں ہمارے رزق سے جو (پاکباز)

و الذین یومنون بما انزل الیک و ما انزل من قبلک ۝ و بالآخرۃ ھم یوقنون ۝

ترجمہ۔ تم سے پہلے اور تم پر اب جو کچھ نازل ہوا ۔ لائے ایماں اس پہ عقبیٰ پر یقیں بھی کر لیا۔

اولئک علیٰ ھدی من ربھم و اولئک ھم المفلحون۔ ______ و لھم عذاب عظیم

ترجمہ۔ اپنے رب کی دی ہوئی راہِ ہدیٰ پر ہیں یہی ۔ پائیں گے اپنی مرادیں (قوم بہتر ہیں یہی)

اور جو منکر ہیں تمہارا وہ نہ مانیں گے کہا ۔ جو نہ ہو تخویف لائیں گے نہ ایماں بے حیا

مہر کر دی ہے خدا نے ان کے گوش و قلب پر ۔ (کر دیا اندھا انہیں) آنکھوں پہ پردے ڈال کر

ہے انہیں کے واسطے آخر عذاب سخت تر

و من الناس ______ و ما ھم بمومنین ۝ (البقرآیت ۸

ترجمہ۔ بعض ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر ۔ اور روزِ آخرت پر لائے ہیں ایماں مگر

فی الحقیقت وہ نہیں لائے ہیں ایماں (ہیں نڈر)

یخٰدعون اللہ و الذین ______ و ما یشعرون۔ ۹

فی قلوبھم مرض ______ بما کانو یکذبون ۱۰

و اذا قیل لھم ______ انما نحن مصلحون ۱۱

الا انھم ھم المفسدون ______ و لکن لا یشعرون ۱۲

و اذا قیل لھم ______ لا یعلمون ۱۳

و اذا لقوا الذین ______ نحن مستھزءون ۱۴

اللہ یستھزی ______ یعمھون ۱۵

ترجمہ۔ مومنوں سے اور خدا سے کرتے ہیں دھوکا (وہ کیا) ۔ یہ نہیں ان کو خبر دھوکے میں ہیں وہ خود مبتلا

تھا مرض ان کے دلوں میں کفر کا جو (لادوا) ۔ اس لئے اللہ نے دی ان کی بیماری بڑھا

چونکہ وہ جھوٹے ہیں (جھوٹا ان کا ہر کردار) ہے ۔ اس لئے ان پر عذاب سخت (دکھ کی مار ہے)

ان سے جب کہتے ہیں دنیا میں نہ پھیلاؤ فساد ۔ وہ یہ کہتے ہیں ہے اصلاح اپنی تو مراد

ہوشیار ان سے کہ یہ مفسد ہیں فتنہ ساز ہیں — اور سمجھتے ہی نہیں (نا آشنائے راز ہیں)
جب یہ کہیئے لاؤ ایماں اور لوگوں کی طرح — کہتے ہیں کیا لائیں ایماں بے وقوفوں کی طرح
ہوشیار ان سے کہیں یہ لوگ خود ہی بے وقوف — کچھ وقوف ان کو نہیں (اور بن رہے ہیں فلیسوف)
مومنوں سے مل کے کہتے ہیں کہ باایمان ہیں — کہتے ہیں شیطانوں سے، خلوت میں (ہم شیطان ہیں)
ہم تمہارے ساتھ ہیں (اور تابع فرمان ہیں) — ہم بناتے ہیں مسلمانوں کو (وہ نادان ہیں)
(یوں) ہمارے رب کی یہ گویا اڑاتے ہیں ہنسی — اور تمہارا رب اڑاتا ہے ہنسی ان لوگوں کی
وہ بڑھا دیتا ہے ان کی سرکشی و گمرہی۔

مثلہم کمثل الذی ــــــــــــــــــــ لا یبصرون ۳
صمٌ بکمٌ ــــــــــــــــــــ لا یرجعون ۱۸

ترجمہ جس طرح سلگائی آگ ایک شخص نے (اپنے لیے) — اور جب ماحول روشن ہو گیا اس آگ سے
چھین لی اللہ نے ایک بار وہ سب روشنی — ان کو چھوڑا بے بصارت درمیانِ تیرگی
بہرے ہیں گونگے ہیں اور اندھے ہیں (یہ سب بالیقین) — (جانب ماحول روشن) لوٹ سکتے ہی نہیں

ترجمہ عام فہم ہو گنجلک نہ ہو

یکاد البرق ــــــــــــــــــــ علی کل شیئٍ قدیر ۲۰
یا ایہا الناس ــــــــــــــــــــ لعلکم تتقون ۲۱
الذی جعل لکم ــــــــــــــــــــ وانتم تعلمون ۲۲

ترجمہ۔ جب وہ چمکی۔ روشنی میں اس کی وہ چلنے لگے — جب اندھیرا ہو گیا طاری کھڑے سب رہ گئے
گر خدا چاہے تو چشم و گوش ان سے چھین لے — وہ ہر اک شے پہ ہے قادر سب پہ قدرت ہے اُسے
آؤ اے لوگو عبادت اپنے رب ہی کی کرو — اس نے ہی پیدا کیا ہے تم کو اور اسلاف کو۔
(تاکہ اس عرفان سے) ہو جاؤ تم پرہیزگار — کر دیا ہے اس نے اس فرش زمین کو استوار
اور بنایا آسماں کو چھت تمہارے واسطے — پھر زمیں پہ پانی برسایا عروج چرخ سے
رزق اور میوے کیئے پیدا پھر اس سے بے شمار — پس نہ ٹھہراؤ کسی کو اس کا ہمسر زینہار
تم کو تو خود علم ہے (پھر کیوں جہالت ہے شعار؟)

قلنا اہبطوا منہا ــــــــــــــــــــ وہم یحزنون ۳۸
والذین کفروا ــــــــــــــــــــ ہم فیہا خالدون ۳۹
یٰبنی اسرائیل اذکروا ــــــــــــــــــــ فارھبون ۴۰

ترجمہ۔ پھر کہا ہم نے کہ اترو تم یہاں سے سب کے سب — اب مری جانب سے پہنچے گی ہدایت کوئی جب

اس ہدایت کی کرے گا جو کوئی بھی پیروی
پھر نہ اس کو خوف ہوگا اور نہ ہوگا غم کوئی
ہو کے منکر جو ہماری بات کو جھٹلائیں گے
دوزخی ہیں وہ اور اس میں دائمی دکھ پائیں گے
یاد کر اولادِ اسرائیل میری نعمتیں۔
میں نے دیں از روئے احساں کیسی کیسی نعمتیں
یاد رکھو تم نے اپنا عہد گر پورا کیا
میں بھی اپنے عہد کو پورا کروں گا برملا
اور مجھی سے تم (فقط) ڈرتے رہو (میں ہوں خدا)

جس زبان میں ترجمہ ہو اس کے روزمرہ کا استعمال

واذ قلتم ________ وانتم تنظرون ۵۵
ثم بعثنکم ________ تشکرون ۵۶
وظللنا علیکم الغمام ________ یظلمون ۵۷

تم نے موسیٰ سے کہا ایمان نہ لائیں گے کبھی
دیکھ لیں گے ہم نہ جب تک صورت اس اللہ کی
کوندی اور تم پر گری بجلی کڑک کر ناگہاں
اور تم آنکھوں سے اپنی دیکھتے تھے یہ سماں
بعد مرنے کے جلایا ہم نے پھر تم کو (سنو)
اس توقع پر کہ شاید شکر تم اب بھی کرو
ابر کو سر پر تمہارے سایہ افگن کر دیا۔
من وسلویٰ بھی تمہارے واسطے نازل کیا
اور کہا یہ پاک چیزیں کھاؤ جو کی ہیں عطا
ہم کو کیا نقصان پہنچا اپنا ہی نقصان کیا

واذ قلتم یا موسیٰ ________ وکانوا یعتدون ۶۱

جب کہا تم نے کہ اے موسیٰ کریں گے ہم نہ صبر
ایک ہی کھانے پر (یہ تو ہم پہ ہے یک گونہ جبر)
کر دعا۔ اگتی ہیں جو چیزیں زمین سے دے وہی
ساگ ککڑی اور گیہوں بھی مسور اور پیاز بھی
بولے موسیٰ تم اگر وہ شے ہو لینا چاہتے
نسبتاً جو شے ہے ادنیٰ ایک بہتر چیز سے
تو چلو (جنگل سے) اور بس جاؤ چل کے شہر میں
تاکہ جو تم مانگتے ہو تم کو وہ چیزیں ملیں۔
بعد ازیں ان پر مسلط ذلت و پستی ہوئی
مستحق قہر الٰہی کے ہوئے وہ آدمی)۔
اس لئے تھا یہ کہ ان لوگوں نے طاعت تو نہ کی
اور اپنی حد سے آگے بڑھ گئے (اہل خودی)

صحت زبان اور زورِ بیان

واذ اخذنا میثاق ________ وانتم مومنین ۸۳
واذ اخذنا میثاقکم ________ وانتم تشہدون ۸۴

عہد اسرائیلیوں سے جب یہ ہم نے لے لیا
بندگی کرنا کسی کی بھی نہ تم غیر از خدا۔
کرنا تم ماں باپ سے اچھا سلوکِ واقعی
کنبے داروں اور یتیموں اور محتاجوں سے بھی
اور لوگوں سے دم گفتار کرنا نیک بات
پڑھتے رہنا تم نماز اور دیتے رہنا تم زکوٰۃ

ماسوائے چند تم سب پھر گئے اس عہد سے
تم تو خوگر ہو ہمیشہ ہی سے نقضِ عہد کے
ہم نے جب وعدہ لیا کہ نہ خونریزی باہم
لوگوں کا اخراج شہروں سے نہ کرنا بیش و کم
کر لیا اقرار تم نے اس کو تم ہو مانتے
مستعد ہو پھر بھی باہم (قتل و غارت کے لیے)

ثم انتم ھؤلاء ____ عما تعملون ۸۵

اولئک الذین اشتروا ____ ولا ھم ینصرون ۸۶

اپنے اک فرقے کو کرتے ہو وطن سے تم بدر
کستے ہو ان کے مقابل ظلم و عصیاں پر کمر
جب وہ قیدی ہو کے آتے ہیں کسی کے (کید سے)
دے کے تم تاوان چھڑا لیتے ہو ان کو قید سے
گو کہ اخراج اُن کا تھا تم پر حرام (اور ناروا)
مانتے ہو ایک حکم اور ایک سے منکر ہو گیا
کیا سزا ہے اُن کی تم میں سے جو یہ کرتا ہے کام
یہ کہ دنیا میں رہو رسوا (آخرت میں بے مرام)
اور قیامت میں پھریں سوئے عذابِ سخت تر
(ہاں) نہیں اللہ کاموں سے تمہارے بے خبر
ہے یہی تو وہ جنہوں نے (بر سبیل گمرہی)
زندگی دنیا کی عقبیٰ کے عوض میں مول لی
پس کبھی ہلکا نہ ہوگا ایسے لوگوں کا عذاب
وہ مدد پائیں گے کبھی ہر گز نہ ہوں گے کامیاب

دوسرے مستند ترجموں سے مطابقت

مولانا سیماب نے وحی منظوم میں اس بات کا بطور خاص خیال رکھا ہے کہ ان کا ترجمہ دوسرے مستند ترجموں کے مطابق ہو اور قدیم و جدید مستند مترجمین کی ڈگر سے علیحدہ نہ ہو۔ ہم یہاں چند ممتاز مترجمین کا بعض آیات کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔ دیکھیے مولانا سیماب کا ترجمہ منظوم ہونے کے باوجود ان سے کس قدر مطابقت رکھتا ہوں

ولقد اتینا موسی الکتٰب ____ تقتلون ۸۷ البقرہ

ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا مفتی محمد شفیع دہلوی معارف القرآن اور بے شک دی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور پے در پے بھیجے رسول اور دیے ہم نے عیسیٰ مریم کے بیٹے کو معجزے صریح اور قوت دی اس کو روحِ پاک سے پھر بھلا کیا۔ پھر اک جماعت کو جھٹلایا اور ایک جماعت کو تم نے قتل کیا۔

ترجمہ مولانا آزاد بیان القرآن۔ "اور پھر دیکھو ہم نے تمہاری رہنمائی کے لیے پہلے موسیٰ کو کتاب دی پھر موسیٰ کے بعد ہدایت کا سلسلہ پے در پے رسولوں کو بھیج کر جاری کیا بالآخر مریم کے بیٹے عیسیٰ کو سچائی کی روشن نشانیاں دیں اور روح القدس کی تاکید سے ممتاز کیا (لیکن ان میں سے ہر دعوت کی تم نے مخالفت کی) پھر کیا تمہارا شیوہ یہی ہے کہ جب کبھی اللہ کا کوئی رسول ایسی دعوت لے کر آئے جو تمہاری خواہشوں کے خلاف ہو تو تم اس کے مقابلے میں سرکشی کر بیٹھو کسی کو جھٹلاؤ۔ کسی کو قتل کرو۔

ترجمہ مولانا مودودی تفہیم القرآن حصہ اوّل۔ ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اس کے بعد پے در پے رسول بھیجے۔ آخرکار عیسیٰ ابن مریم کو روشن نشانیاں دے کر بھیجا اور روح پاک سے اس کی مدد کی۔ پھر یہ تمہارا کیا ڈھنگ ہے کہ جب بھی کوئی رسول تمہاری خواہشاتِ نفس کے خلاف کوئی چیز لے کر تمہارے پاس آیا تو تم نے اس کے مقابلے میں سرکشی ہی کی۔ کسی کو جھٹلایا کسی کو قتل کر ڈالا۔

اب سنیئے مولانا سیماب کا منظوم ترجمہ۔ **وحی منظوم**

ہم نے موسیٰ کو کتاب (پاک) بیشک کی عطا — اور پے در پے پھر اس کے بعد بھیجے انبیاء
ہم نے عیسیٰ ابنِ مریم کو دیئے کچھ معجزے — اور قوت بھی عطا کی ان کو روح قدس سے
جب کبھی لائے تمہارے پاس حکم الیسا رسول — جو تمہارے نفس یا تم کو نہ تھا ہرگز قبول
ہو گئے مغرور تم (تم میں تکبر آگیا)۔ — بعض کو جھوٹا بتایا قتل بعضوں کو کیا

وقالوا قلوبنا ________ مایومنون البقرہ آیت ۸۸

ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن
مفتی محمد شفیع دہلوی معارف القرآن

اور کہتے ہیں ہمارے دلوں پر غلاف ہے بلکہ لعنت کی ہے اللہ نے ان کے کفر کے سبب سو بہت کم ایمان لائے۔ (البقرہ ۸۸)

ترجمہ مولانا آزاد بیان القرآن۔ کہتے ہیں ہمارے دل غلافوں میں لپٹے ہوتے ہیں (یعنی اب کسی نئی بات کا اثر ان تک پہنچ ہی نہیں سکتا: حالانکہ یہ اعتقاد کی پختگی کردار حق کا ثبات نہیں) بلکہ انکار حق کے تعصب کی پھٹکار ہے۔ (کلام حق سننے اور اثر پذیر ہونے کی استعداد ہی کھودی) اس لئے ایسا ہوتا ہے کہ وہ دعوت حق سنیں اور قبول کریں۔

ترجمہ مولانا مودودی تفہیم القرآن۔ وہ کہتے ہیں ہمارے دل محفوظ ہیں۔ نہیں اصل بات یہ ہے کہ اُن کے کفر کی وجہ سے ان پر اللہ کی پھٹکار پڑی ہے اس لئے وہ ایمان کم ہی لاتے ہیں۔

ترجمہ منظوم مولانا سیماب وحی منظوم۔ مولانا سیماب نے اس ترجمہ کو اس خوبصورتی سے نظم کیا کہ مضمون وہی رہا جو ان لائق مفسرین نے بیان کیا ہے اور شعریت کا مزہ آگیا۔

وہ یہ کہتے ہیں کہ ہیں محفوظ ان کے دل مگر — کفر کے باعث ہے ان پر حق کی لعنت سربسر
اس لئے ان میں بہت کم ہیں جو ہیں ایمان پر

واذ یرفع ابراہیم القواعد ________ انت السمیع العلیم ۰ ۱۲۷ آیت سورۃ البقرہ
ربنا واجعلنا ________ انت التواب الرحیم ۰ ۱۲۸ "
ربنا وابعث فیہم ________ انت العزیز الحکیم ۱۲۹ "

ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود حسن
مفتی محمد شفیع دہلوی معارف القرآن

۱۔ اور یاد کر جب اٹھاتے ہوتے ابراہیم بنیادیں خانہ کعبہ کی اور اسمٰعیل دعا کرتے۔ اے پروردگار ہمارے قبول کر ہم سے بے شک تو ہی سننے والا اور جاننے والا ہے۔ ۲ اے پروردگار ہمارے کر ہم کو حکم بردار اپنا اور ہماری اولاد میں بھی کر ایک جماعت فرمانبردار اپنی۔ بتا ہم کو قاعدے حج کرنے کے اور ہم کو معاف کر بے شک تو ہی تو بہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔ ۳ اے پروردگار ہمارے اور بھیج ان میں ایک رسول انہیں میں کا کہ پڑھے ان پر تیری آیتیں۔ سکھا دے کو ان کو کتاب اور تہہ کی باتیں اور پاک کرے ان کو تو ہی ہے بے شک زبردست بڑی حکمت والا۔

ترجمہ مولانا آزاد بیان القرآن۔ ۱۔ جب ابراہیم خانۂ کعبہ کی نیو ڈال رہا تھا اور اسمٰعیل بھی۔ (دل اور زبان پر یہ دعا جاری

تھی) اے پروردگار ہمارا یہ عمل تیرے حضور قبول ہو بلاشبہ تو ہی ہے جو دعاؤں کا سننے والا اور مصالح عالم کا جاننے والا ہے

۲۔ اے پروردگار اپنے فضل و کرم سے ایسی توفیق دے کہ ہم سچے مسلم (یعنی تیرے حکم کے فرمانبردار ہو جائیں) اور ہماری نسل میں سے ایک ایسی امت پیدا کر دے جو تیرے حکموں کی فرمانبردار ہو۔ خدا ہمیں ہماری عبادت کے طریقے بتلا دے۔ اور ہمارے قصوروں سے درگزر فرما۔ بلاشبہ تیری ہی ذات ہے جو رحمت سے درگزر کرنے والی ہے

۳۔ اور خدایا (اپنے فضل و کرم سے) ایسا کیجیو کہ اس بستی کے بسنے والوں میں تیرا ایک رسول پیدا ہو جو انہی میں سے ہو وہ تیری آیتیں پڑھ کر لوگوں کو سنائے کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور اپنی پیغمبرانہ تربیت سے ان کے دلوں کو مانجھ دے اے پروردگار بے شک تیری ذات ہے جو حکمت والی ہے اور سب پر غالب ہے۔

ترجمہ مولانا مودودی تفہیم القرآن۔ ۱۔ اور یاد کرو ابراہیم اور اسمٰعیل جب اس گھر کی دیواریں اٹھا رہے تھے تو دعا کرتے جاتے تھے، اے ہمارے ہم سے یہ خدمت قبول فرما لے تو سب کی سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

۲۔ اے ہمارے رب ہم دونوں کو اپنا مسلم مطیع فرمان بنا۔ ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا جو تیری مسلم ہو ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما تو بڑا معاف کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔

۳۔ اور اے رب ان لوگوں میں خود انہیں کی قوم سے ایک ایسا رسول اٹھا جو انہیں تیری آیات سنائے۔ ان کو کتاب حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوار دے تو بڑا مقتدر اور حکیم ہے۔

یہ تو تھے نثر پارے اب شاعری کا اعجاز دیکھئے اور مولانا سیماب کی قدرتِ کلام کہ ان مفاہیم کو کس بلاغت کے ساتھ نظم کا جامہ پہنایا ہے اصل مضمون میں کمی نہیں ہوئی ترجمہ کا ترجمہ رہا۔ اور ایجاز و اختصار اور شعریت کا حسن بھی پیدا ہو گیا

ترجمہ منظوم مولانا سیماب اکبر آبادی۔ (وحی منظوم)

۱۔ خانۂ کعبہ کی دیواریں اٹھانے جب لگے — یہ دعائیں مانگیں ابراہیم اور اسمٰعیل نے
اے ہمارے رب قبول اب یہ ہمارا کام کر — تو ہے بے شک سننے والا۔ صاحبِ علم و خبر

۲۔ اے ہمارے رب ہمیں اپنا ہی فرماں بر بنا — کر ہماری نسل کو اک امتِ مسلم عطا
کچھ طریقے بھی عبادت کے ہمیں تعلیم کر — بخش دے ہم کو۔ قصوروں سے ہمارے درگزر

۳۔ اے ہمارے رب انہیں میں سے اٹھا ایسا نبی — جو انہیں کتب سنائے آیتیں پڑھ کر تری
جو سکھائے حکمت و قرآں سنوارے (خلق و خو) — غالب القدرۃ ہے اور کامل الحکمۃ ہے تو

بخشنے والا تو ہی ہے مہرباں (و دادگر)

وضاحتی یا اضافی الفاظ بریکٹ میں۔ مندرجہ بالا مثالوں سے بھی ظاہر ہے کہ مولانا سیماب وضاحتی یا اضافی الفاظ اپنے ترجمہ منظوم میں بہت کم استعمال کرتے ہیں۔ جہاں بھی استعمال کیئے ہیں وہ بریکٹ میں بند ہیں اور ان کے استعمال کی خصوصیت یہ ہے کہ اگر انہیں علیحدہ کر دیا جائے یا نہ پڑھا جائے تو بھی ترجمہ گنجلک اور بے معنی نہیں ہوتا متن کے مطابق رہتا ہے

مزید دو ایک مثالیں اور پیش کی جاتی ہیں۔

وقالوا لن تمسنا النار ـــــــــــــ مالا تعلمون ۵ ۸۰ آیت

کسب سیئۃ و ـــــــــــــ ھم فیھا خالدون ۵ ۸۱ آیت

کہتے پھرتے ہیں یہودی (ہو گا جب روزِ شمار)	صرف کچھ گنتی کے دن تک ہم کو چھو سکتی ہے نار
اُن سے پوچھو کہ لیا ہے۔ وعدہ کیا اللہ نے؟	جو، نہ وہ اب پھر سکے گا اپنے قول و عہد سے
یا خدا پر ایسی باتوں کا یہ کرتے ہیں قیاس	کوئی بھی علمی سند جس کی نہیں ہے ان کے پاس
بے شبہ جو شخص قصداً کرتا رہتا ہے گناہ	اور خطاؤں میں گرا رہتا ہوا اپنی (روسیاہ)
بس یہی وہ لوگ ہیں جو دوزخی ہیں (بے گماں)	اور بے شک وہ جہنم میں رہیں گے جاوداں

پہلے شعر کے پہلے مصرعہ میں "ہوگا جب روزِ شمار"۔ چوتھے شعر کے دوسرے مصرعہ میں "روسیاہ" اور پانچویں شعر کے پہلے مصرعہ میں "بے گماں" وضاحتی الفاظ ہیں۔ انہیں نہ پڑھ کر دیکھئے۔ ترجمہ میں کوئی الجھن پیدا نہیں ہوتی۔ لفظی ترجمہ بالکل متن کے مطابق رہ جاتا ہے۔ ایک اور مثال۔

واذ آتینا موسی الکتب ـــــــــــــ انہ ھو التواب الرحیم ۵

ترجمہ کی عطا جب ہم نے موسیٰ کو شریعت اور کتاب	تاکہ تم پاؤ ہدایت (ہو کے اس سے فیضیاب)
جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم سے (واحسرتا)	تم نے گئو سالہ بنا کر ظلم ہے خود پر کیا
اب یہ لازم ہے کہ تم اللہ سے توبہ کرو	اور کر دو قتل ان افراد میں سے بعض کو
ہے تمہارے رب کے نزدیک اس میں تم کو بہتری	(تم نے جب تعمیل کی) توبہ قبول رب ہو گی

ہے بڑا ہی مہرباں وہ اور ہے تواب بھی

وضاحتی الفاظ نکال کر پڑھیئے۔ ترجمہ مکمل اصل کے مطابق رہ جائے گا۔ یہی حال وحی منظوم میں تمام ترجمہ کا ہے۔ پڑھتے چلے جایئے۔ گرانی، الجھن اور بے جا اختصار یا طوالت محسوس نہیں ہو گی الفاظ کی موجیں اٹھتی ہوئی نظر آئیں گی۔ کہیں سبک خرام کہیں پر زور اور پر جوش۔

وحی منظوم اور کلام الٰہی کے دوسرے منظوم ترجمے۔ مولانا سیماب کے ترجمے سے پہلے کلام الٰہی کے حسب ذیل مکمل اور نامکمل منظوم ترجموں کا پتہ چلتا ہے۔

۱ سید غضنفر علی صاحب غضنفر بی اے منشی فاضل سونی پت ضلع رہتک نے صرف پارہ الم کا ترجمہ کیا ہے اس پر تقریظ لکھتے ہوئے مولانا سید اولاد حسین شاداں بلگرامی تحریر فرماتے ہیں کہ۔ "قرآن مجید کا نظم ترجمہ کرنے میں کیا عجب ہے کہ یہ پہلے یا دوسرے شخص ہوں۔

۲۔ دوسرا منظوم ترجمہ شاہ شمس الدین صاحب شائق لاہوری کا ہے۔ اس کا بھی صرف پہلا ہی پارہ دستیاب ہوا ہے

۳۔ تیسرا منظوم ترجمہ پورے کلام مجید کا محمد مطیع الرحمن صاحب خادم نے نظم المعانی کے نام سے کیا ہے۔

۴ چوتھا منظوم ترجمہ حضرت آغا شاعر قزلباش دہلوی کا ہے اس کے صرف تین پارے چھپے ہیں۔

۵ پانچواں منظوم ترجمہ مولوی عبدالطیف صاحب افغانی مدرس مدرسہ عالیہ جامع مسجد آگرہ کا ہے اور یہ بھی صرف پہلے ہی پارہ کا ترجمہ ہے۔

۶۔ چھٹا منظوم ترجمہ مولوی عبدالسلام صاحب متخلص بہ سلام کا ہے موسوم بہ تفسیر زادِ آخرت۔

ایک اور ترجمہ کا پتہ چلتا ہے جو حمائل شریف کی صورت میں ملا۔ علیگڑھ سے چھپا تھا یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کا ناظم کون ہے۔ ایک ترجمہ ابوالبشر صاحب فیضی نے شروع کیا تھا مگر وہ مکمل نہ ہو سکا۔ ماہنامہ الوارث بمبئی سیماب نمبر مندرجہ بالا منظوم ترجموں کے علاوہ ایک منظوم ترجمہ پاکستان میں مولانا زبیری صاحب نے کیا ہے۔ مولانا سیماب کا منظوم ترجمہ وحی منظوم ہندوستان میں تقسیم سے قبل ہی مکمل ہو گیا تھا لیکن اس کی طباعت پاکستان میں ہوئی سیماب اکیڈمی کے زیر اہتمام پچیس پارے چھپ چکے ہیں بقیہ پانچ زیر طباعت ہیں۔

مندرجہ بالا منظوم ترجموں میں سے (جو دستیاب ہو سکے ہیں) سورۂ فاتحہ کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۂ فاتحہ

الحمد للہ رب العالمین ۙ الرحمٰن الرحیم ۙ مالک یوم الدین ؕ ایاک نعبد و ایاک نستعین ؕ اھدنا الصراط المستقیم ۙ صراط الذین انعمت علیہم ۙ غیر المغضوب علیہم ولا الضالین ؕ

۱۔ ترجمہ منظوم سید غضنفر علی صاحب غضنفر بی اے منشی فاضل ساکن سوہنی پت ضلع رہتک مطبوعہ جدید برقی پریس

ابتدا ہے مری بنام خدا　　مہرباں و رحیم ہے جو بڑا۔۔
ہے خدا کے لئے ثنا ساری　　سب جہانوں کا ہے وہی والی
مہرباں و رحیم ہے جو بڑا　　مالکِ روزِ حشر و روزِ جزا
ہیں عبادت گزار تیرے ہی　　چاہتے ہیں مدد بھی تجھ سے ہی
راہ سیدھی ہمیں (خدا) بتلا　　راہ ان کی کہ جن پر فضل کیا
جن پر غصّے ہوا نہ ان کی راہ　　اور نہ ان کی جو ہو گئے گمراہ۔

۲۔ شاہ شمس الدین شائق ساکن لاہور اکبری دروازہ (مطبوعہ مطبع پنجابی سنہ ۱۳۳۶ھ)

ابتدا ہے نام اللہ سے بیاں　　ہے جو بخشش کرنے والا مہرباں
سب ستائش ہے سزاوارِ خدا　　جو کہ رب ہے ساری مخلوقات کا
وہ ہے بخشش کرنے والا مہرباں　　مالک روز جزائے انس و جاں
تیری ہی ہم بندگی ہیں کر رہے　　اور تجھی سے ہم مدد ہیں مانگتے
تو چلا ہم کو براہِ راستی۔　　راہ ان کی جن پہ بخشش تو نے کی
نہ پڑا ان کی رہ غضب جن پر ہوا　　اور نہ ان کی جو ہیں گمراہ از ہدیٰ

(تفسیر زاد الآخرت)

۳۔ ترجمہ منظوم مولوی عبدالسلام بہ متخلص بہ سلام موسوم تفسیر زاد الآخرت مطبوعہ مطبع نولکشور لکھنؤ سنہ ۱۲۹۹ھ

ہے جو خوبی خدا کو ہے شایاں   کہ ہے پروردگارِ عالمیاں ۔
کہ بہت رحم و مہر والا ہے   جس کی رحمت جہاں سے بالا ہے
کہ وہی بادشاہ روز جزا   شاہی اس دن کی ہے اسی کو سزا
تجھ کو ہی کرتے ہیں عبادت ہم   اور تجھ سے، عنایت ہم ۔ (اس مصرعہ میں کیا لفظ رہ گیا ہے سمجھ میں نہیں آسکا)
کر ہدایت ہمیں وہ سیدھی راہ   کہ مراد اس سے ہے کتاب اللہ
راہ ان کی ہمیں ہدایت کر ۔   تو نے انعام کر لیا جن پر ۔
اے سوا ۔ ان کے جو بھی تھے مغضوب   تھے جو محروم سب دے اور مطلوب
اور نہ گمراہوں کی وہ ہوے راہ   ایسی راہوں سے ہم کو رکھے نگاہ

ترجمہ منظوم فیضی صاحب دیوبند ۔

اُسی کے واسطے ہیں حمد و تعریف و ثنا سب کچھ   وہی ہے مالک و پرگار دو جہاں سب کچھ
وہ بے حد مہرباں ہے اور بے حد رحم والا ہے   وہ یوم الدین کا مالک ہے مختار و یگانہ ہے
اسی کی اپنے دل سے ہم عبادت کرتے ہیں پیہم   اسی سے اپنے کاموں میں مدد بھی چاہتے ہیں ہم
خدایا ہم کو سیدھی راہ کی ہر دم ہدایت کر   دکھا دے راہ ان کی کی ہیں تو نے رحمتیں جن پر
نہ ان لوگوں کی ہاں جن پر ہوا قہر و غضب تیرا   نہ ان کی جو ہوئے گمراہ کا فر اور تجھے چھوڑا

ترجمہ منظوم از افسر الشعرا حضرت آغا شاعر قزلباش دہلوی

ہے نام سے خدا کے آغاز کا (اجالا)   جو مہرباں بڑا ہے بے حد رحم والا ۔۔
تعریف سب خدا کی جو رب ہے عالموں کا   جو مہرباں بڑا ہے بے حد جو رحم والا ۔۔
محشر کے دن کا مالک (روز جزا کا والی)   تجھ کو ہی پوجتے ہیں ہم تیرے ہی سوالی
سیدھی ڈگر پہ لے چل ۔ (ثابت قدم بنادے)   نعمت جنہیں عطا کی ان کی روش سجھا دے
نے ان کی راہ جن پر قہر و غضب ہوئے ہیں   نے ان کی جو بہک کر گمراہ ہو گئے ہیں

ترجمہ وحی منظوم علامہ سیماب اکبر آبادی ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔

نام سے اللہ کے کرتا ہوں آغاز (بیاں)   جو بڑا ہی رحم والا ہے نہایت مہرباں
ہیں سزاوار ے خدائے (پاک) ساری خوبیاں   (جو ہے) رب سارے جہانوں کا رحیم و مہرباں
ہے وہی انصاف کے دن کا بھی مالک (بے گماں)
(یاالٰہی) ہم فقط کرتے ہیں تیری بندگی ۔   اور ہوتے ہیں تجھی سے طالبِ امداد بھی
(یاالٰہی) ہم کو سیدھے راستے پر تو چلا   ان کا رستہ جن پر انعام (و کرم) تو نے کیا
راستہ ان کا نہیں جن پر غضب کی ہے (نگاہ)   اور نہ ان کا راستہ جو ہو گئے گم کردہ راہ

بعض اور مختلف آیاتِ قرآنی کے منظوم تراجم

سورۃ المزمل کی چند آیتوں کے منظوم ترجمے۔

یاایھا المزمل ———— تبتیلا ط پارہ ۲۹ آیات ۱ تا ۸

ترجمہ منظوم ۔ حمائل شریف بطرز مثنوی مولانا روم ۔ شائع کردہ دفتر رسالہ اشاعتِ علوم وفنون علیگڈھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔ ابتدا کرتا ہوں با نام خدا
مہرباں اور رحم والا ہے بڑا
سن لے کملی اوڑھنے والے (نبی)
رات کو تو اٹھ ولیکن تھوڑا (ہی)
آدھی اس کی کہ کم اس میں سے کر
تھوڑی یا زیادہ کر اس پر (بے خطر)
اور پڑھ آہستہ قرآں (اے نبی)
پڑھنا ہولے ہولے (بہ آہستگی)
ہم تو ڈالیں گے تیرے اوپر ضرور
ایک بھاری بات (لے والا شعور)
بیشک اٹھنا شب کو وہ ہے سخت تر
رنج اور کلفت کی رو سے (سربسر)
اور بہت ہی راست از روئے مقال
یعنی ایک سورہتا ہے شب کو (خیال)
واسطے تیرے بلا چون وچرا
بیچ دن کے شغل ہے بیشک بڑا۔
اور کر یاد اپنے رب کے نام کو
اور ہو جا منقطع دنیا سے تو
اس کی جانب منقطع ہو جان کر
یعنی کر یاد اس کی ہی شام وسحر

ترجمہ وحی منظوم ۔ مولانا سیماب اکبرآبادی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔

نام سے اللہ کے کرتا ہوں آغاز (بیاں)
جو بڑا ہی رحم والا ہے نہایت مہرباں ۔
کملی والے (مصطفےٰ) شب کو (عبادت کیلئے)
چاہیئے تم کو کھڑا ہونا مگر کم چاہیئے ۔
(صرف) آدھی رات یا اس میں سے بھی کچھ کم کرو
کچھ زیادہ نصف سے یا (عبادت میں رہو
اور ٹھہر کر صاف صاف (آیات) قرآں پڑھو

ڈالنے والے ہیں تم پر عنقریب ایک بار ہم
شک نہیں اس میں کہ اٹھنا رات کا (ہی بیش وکم)
زیر کر دیتا ہے سختی سے (حرارت) نفس (کی)
اور نکلتی ہے (دعا بھی) ٹھیک (دل سے بات بھی
رہتی ہے دن میں تمہیں مصروفیت (بیشک بڑی)
اپنے رب کا نام تم لیتے رہو اور (اے نبی)
قطع کر کے (سب سے) اس کے ہو رہو (تا زندگی)

سورۃ یوسف کی چند آیات۔

وقال نسوۃ فی المدینہ ———— من الصٰغرین (پارہ ۱۲۔ رکوع ۴ آیت ۳۰ تا ۳۲)

ترجمہ منظوم ۔ محمد مطیع الرحمن صاحب خادم (کلام ربانی نظم المعانی) مطبوعہ مظہر پریس علیگڈھ

اور بولیں عورتیں اس شہر کی — زن عزیز مصر کی ہے چاہتی۔

اک غلام اپنے کو اس کے نفس سے — اس کا دل از روئے الفت پھاڑ آیا ہے

دیکھتے ہیں ہم تو اس کو واقعی — ایک ظاہر گمرہی میں ہے پڑی

پس سنا جب زلیخا نے مکر عورات کا — آدمی ایک بھیج سمت ان کے دیا

اور کیں تیار اُن کے واسطے — مسندیں۔ اور دیں ہر اک کو ان میں سے

اک چھری اور بولی باہر آن پہ آ — عورتوں کو حسن دے اپنا دکھا

پس جب اس کو دیکھا ان عورات نے — حسن کے اندر بڑا پایا اُسے

اور کاٹے ہاتھ اپنے برملا — اور بولیں پاک ہے ذاتِ خدا

ہے نہیں یہ آدمی بے ریب و شک — یہ نہیں پر ہے مقرب اک ملک

پھر زلیخا بولیں بس یہ ہے وہی — کہ ملامت تم نے مجھ کو اس میں کی

اور بے شک میں نے اس کو چاہا تھا — نفس سے اس کے مگر مجھ سے بچا

اور کرے گا گر نہ وہ اس کام کو — کہ میں اس کو کر رہی ہوں حکم جو

قید وہ البتہ جائے گا کیا — اور ذلیلوں میں سے وہ ہو جائیگا

وحیٔ منظوم۔ مولانا سیماب اکبرآبادی۔

شہری جو عورتیں تھیں ان میں چرچے تھے یہی — زلیخا ہے خادم پہ گھر والی عزیز مصر کی۔۔

ہو گیا ہے اس کے دل میں جاگزیں عشق (غلام) — دیکھتے ہیں ہم کہ وہ بھٹکی ہوئی ہے (لاکلام)

عورتوں کے طعنے مینے جب زلیخا نے سنے — ان کو بلوایا اور اک مجلس سجی ان کے لیئے

(پہلے) سب کے ہاتھ میں اک چھری دیدی گئی — پھر کہا یوسف سے ان پر کیجیے جلوہ گری

عورتوں نے دیکھا جب یوسف کو ششدر رہ گئیں — کاٹ ڈالے ہاتھ اپنے اور یوں کہنے لگیں

حاشا للہ یہ فرشتہ ہے بڑا۔ انساں نہیں۔

(اہلیہ ، بولی عزیز مصر کی) یہ ہے وہی۔ — جس کے بارے میں مجھے دیتی تھیں طعنے تم سبھی

میں نے چاہا تھا کہ اس کے نفس کو میں موہ لوں — لیکن اس نے نفس کو اپنے بچایا کیا کروں

اور بے شک وہ نہ مانے گا اگر کہنا مرا — ہوگا بے عزت (بہت) اور قید خانے جائیگا (الوا...

ترجمہ منظوم۔ افسر الشعرا آغا شاعر قزلباش دہلوی

واذ قیل لھم لاتفسدوا فی الارض — فی طغیانہم یعمھون (سورۃ البقرۃ آیات...

اور جب کہا ان سے۔ جھگڑو نہ تم زمین پر — کہتے ہیں ہم تو خود ہی اصلاح کے ہیں خوگر

سن لو وہی ہیں مفسد وہی تو ہیں فسادی۔ — لیکن نہیں سمجھتے (اور نہ ہی سمجھ ہے ان کی)

اور جب کہا ہے ان سے ایماں لاؤ تم بھی
جیسا کہ اور لائے (کی بندگی خدا کی)۔
تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایماں ایسا لائیں
جس طرح چند احمق (پھندے میں پھنس گئے ہیں)
سن لو وہی ہیں احمق پر جانتے نہیں ہیں
(اپنی حماقتوں کو پہچانتے نہیں ہیں
لیکن (جب اپنی ٹکڑی ملتی ہے ان کو) تنہا
شیطانوں سے وہ اپنے ملتے ہیں جب کسی جا
کہتے ہیں مرتے مرتے بھی ساتھ ہے تمہارا
(ان کو بناتے تھے ہم) کرتے تھے ان سے ٹھٹھا
اللہ (اصل میں ہے) ان کی ہنسی اڑاتا۔
تاکہ وہ سرکشی میں بھٹکا کریں (ہمیشہ)

ترجمہ وحی منظوم۔ علامہ سیماب اکبر آبادی

اُن سے جب کہتے ہیں دنیا میں نہ پھیلاؤ فساد
وہ یہ کہتے ہیں کہ ہے اصلاح اپنی تو مراد
ہوشیار اُن سے کہ یہ مفسد ہیں (فتنہ ساز ہیں)
اور سمجھتے ہی نہیں (نا آشنائے راز ہیں)
جب یہ کہیئے لاؤ ایماں اور لوگوں کی طرح
کہتے ہیں کہ لائیں ایماں بیوقوں کی طرح
ہوشیار ان سے کہ ہیں یہ لوگ خود ہی بیوقوف
کچھ وقوف ان کو نہیں اور بن رہے ہیں (فلسفی)
مومنوں سے مل کے کہتے ہیں کہ "با ایمان ہیں"
کہتے ہیں شیطانوں سے خلوت میں ہم شیطان ہیں
ہم تمہارے ساتھ ہیں اور تابع فرمان ہیں
ہم بناتے ہیں مسلمانوں کو (وہ نادان ہیں)
(یوں) تمہارے رب کی یہ گویا اڑاتے ہیں ہنسی
اور تمہارا رب اڑاتا ہے ہنسی ان لوگوں کی

وہ بڑھا دیتا ہے ان کی سرکشی و گمرہی

ولتجدنہم احرص الناس علیٰ حیوٰۃ ... بل اکثرھم لا یومنون۔ سورۃ البقرۃ آیات ۹۶ تا ۱۰۰

ترجمہ افسر الشعرا آغا شاعر قزلباش دہلوی۔

اور پاؤ گے تم ان کو سب لوگوں سے زیادہ
جینے پہ مرنے والے اکثر حریص (دنیا)
اور مشرکین سے بھی (جو اس میں کچھ ہیں آگے)
یہ حرصِ زندگی میں ان سے بھی ہیں (نکلتے)
اک اک ان میں سے ہے اس آرزو کا قیدی)
عمرِ ہزار سالہ اے کاش اس کو ملتی۔
اور چھوٹ نہیں سکیں گے جتنا بھی وہ جئیں گے
مہلت عذاب سے وہ ہرگز نہ پا سکیں گے
دو دن کی زندگی پہ بے موت مر رہے ہیں
اللہ دیکھتا ہے جو کچھ وہ کر رہے ہیں۔
کہہ دو (نبی) اسے جو جبرئیل کا عدو ہے
بے شک اسی نے دل پہ نازل کیا تمہارے
اذنِ خدا سے (اترا قرآن سر لبسر ہے)
اس کا ہے یہ مصدق اترا جو اس سے پہلے
اور ہے ہدایت ان کو ان کے لئے بشارت
مومن ہیں جو (جنہوں نے کی اس طرح اطاعت)
دشمن ہے جو خدا کا، اس کے ملائکہ کا۔
اور اس کے انبیاء کا (دشمن جو کوئی ہوگا)
جبریل اور میکائیل سے بھی ہے جن کی ان بن
تو ایسے کافروں کا اللہ بھی ہے دشمن۔

اور ہم نے تجھ پہ روشن آیات ہیں اتاری
(ایک اک کھلی نشانی ان میں سے ہے ہماری)
اور ہو نہیں سکیں گے (ہرگز بھی) منکر ان سے
لیکن وہی جو ہوں گے فسق و فجور والے
یہ کیا کہ جب انہوں نے باندھا ہے عہد کوئی
ان میں سے اک جماعت ہے اس کو توڑ دیتی
ان میں سے بلکہ اکثر ایماں نہیں ہیں رکھتے
(وعدے کا پاس کرنا پیدا ہو ان میں کیسے)

ترجمہ وحیٔ منظوم۔ مولانا سیماب اکبرآبادی۔

بلکہ تم ان سب کو پاؤ گے حریص زندگی
اور سب لوگوں سے بڑھ کر، شرک کرنے والے بھی
ایک ایک ان میں سے اس کا ہے بکوشش خواستگار
کاش اس کی عمر (فانی) کے برس ہوں اک ہزار
کیا بچائے گی سزا سے ان کو لمبی زندگی؟
دیکھتا ہے سب خدا کرتے ہیں یہ جو کام بھی
دشمنِ جبریل سے کہہ دو کہ اس نے (لاکلام)
اذنِ حق سے یہ تمہارے دل میں ڈالا ہے کلام
جو ہے تصدیق ان کی پہلے جو صحف نازل ہوئے
ہے ہدایت اور بشارت مومنوں کے واسطے
جو خدا کا دشمن اور اس کے فرشتوں کا ہوا
انبیاء کا۔ نیز جبریل اور میکائیل کا
تو خدا بھی دشمن اُن کفار کا ہے (برملا)
ہم نے نازل کی ہیں بے شک تم پہ روشن آیتیں
ان سے منکر ہیں وہی فاسق ہیں جو (اس دور میں)
عہد و پیماں جب کسی سے بھی کریں گے یہ کہیں
اک جماعت ان کی اس کو توڑ ڈالے گی یہیں
بلکہ اکثر ان میں ہیں محروم ایمان (ویقین)

مختلف شعرا کے منظوم تراجم کے اقتباسات آپ نے ملاحظ فرمالئے۔ آپ کا مذاقِ سلیم جس نتیجہ پر بھی پہنچے۔ ہم اپنی رائے مسلط کرنا نہیں چاہتے۔ "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است" وحیٔ منظوم کے ترجمے کے متعلق یہ ضرور کہیں گے کہ مولانا سیماب نے ترجمے میں حتی الا[مکان] اس بات کی کوشش کی ہے کہ ترجمہ اصل کے مطابق رہے اضافی اور وضاحتی الفاظ کم اور بہت کم لائے جائیں جو الفاظ لائے جائیں وہ سیاق وسباق اور مزاج و روح کلام الہی کے مطابق ہوں۔ پورے پورے مصرعے اضافی نہ ہوں۔ ترجمے میں شعریت، روانی، ایجاز، صحتِ زبان اور زورِ بیان ہو۔ لیکن ترجمہ ترجمہ رہے، شاعری نہ ہو جائے، مبالغہ اور غلو سے بھری ہوئی۔ منظوم ترجمے میں روکھا پن بھی نہ ہو۔ زبان اور انداز بیان روزمرہ کے مطابق ہو۔

وحیٔ منظوم میں ایک خاص خصوصیت یہ بھی ہے جو اور منظوم تراجم میں نہیں کہ اس میں مروجہ تفاسیر کی طرح بعض آیات۔ کنایا[ت] اور مشکلات کی تشریح حاشیہ پر کر دی گئی ہے۔ سورہ، رکوع، اور آیات کے نمبر بھی دیئے گئے ہیں۔ ہر سورت کے شروع میں اُس کا مقا[م] نزول اور تعدادِ آیات بھی درج ہے۔ ایک صفحہ پر متن ہے اور اس کے سامنے کے صفحے پر اس متن کا ترجمہ اور حاشیہ پر بقدر ضرورت تفس[یر و] تشریح۔ ممتاز اور مستند مفسرین کی اسناد کی روشنی میں تاکہ قاری کو اصل قرآن پڑھنے، سمجھنے، اور بہ آسانی یاد کرنے کے مواقع بہم ہو جائیں۔

مولانا سیماب اکبرآبادی شعر و ادب کے مجتہد تھے۔ قادر الکلام، پختہ کار، ہر صنف ادب پر عبور رکھنے والے اور شاعری کو حقی[قت] و متانت کا جامہ پہنانے والے۔ مولانا نے تنہا اپنی ذات اور قلم سے جو کارنامے انجام دیئے وہ بڑے بڑے اداروں سے نہ ہو سکے، اسی

بابائے اردو مولانا عبدالحق نے فرمایا تھا کہ "مولانا سیماب اپنی ذات سے اک ادارہ تھے۔ انہوں نے تنہا جو کام کیا وہ پوری پوری تنظیموں سے نہ ہو سکا۔ ان کی ادبی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔"

مولانا سیماب کی قدر جیسی ہونی چاہیئے نہ ہو سکی۔ ان کی حق گوئی، مذہب پرستی اور اسلام دوستی اس طبقہ کو پسند نہ آئی جو برصغیر ہند و پاک میں زیر اثر تمام ذرائع ابلاغ اور قوتِ نقد و نظر کے ذریعہ ایک خاص بیرونی ادب کی تبلیغ میں مصروف ہے۔ جس میں لادینی خیالات کی تشہیر، پیٹ اور جنسی بھوک کا ڈھنڈورا پرچار اور مزدور اور کسان کی ہمدردی کے کھوکھلے نعرے ہیں۔ ان کے خلاف منظم سازشیں کی گئیں، انہیں نظر انداز کیا گیا اور ان کو ان کے مقام بلند سے گرانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے زندہ و جاوید ہے سیماب مر سکتا نہیں۔"

وحیٔ منظوم کی تکمیل کی پر مسرت اطلاع جب مولانا سیماب مرحوم نے راقم الحروف کو دی تھی تو ایک قطعۂ تاریخ برجستہ ذہن میں آیا تھا جو مولانا کی خدمت میں اسی وقت پیش کر دیا گیا تھا اور مولانا نے وحیٔ منظوم کے اختتامی آخری صفحہ کی پشت پر اسے ثبت فرمالیا تھا۔ مضمون کی مناسبت سے اختتام مضمون پر اسے درج کر رہا ہوں۔ — صبا

پُر زور ہوئی قوتِ ایمانی بھی ۔ ضو بار ہوئی شعلِ عرفانی بھی
سیماب کا اعجازِ سخن اللہ اللہ ۔ منظوم ہوا صحیفِ یزدانی بھی

۱۳۶۵ھ

حوالہ جات

۱۔ تفہیم القرآن (مولانا مودودی) جلد اوّل، دوم، سوئم۔ ۲ بیان القرآن (مولانا آزاد)
۳۔ معارف القرآن (مفتی محمد شفیع دہلوی) ۴۔ القرآن الحکیم مرتبہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن۔
۵۔ کلیم عجم و سدرۃ المنتہیٰ۔ مولانا سیماب اکبرآبادی۔ ۶ ماہنامہ الوارث بمبئی کا سیماب نمبر ۷ شاعر آگرہ اسکول نمبر
۸۔ نظم مقدس منظوم ترجمہ قرآن مجید۔ حضرت آغا شاعر قزلباش دہلوی۔ ۹ وحیٔ منظوم مولانا سیماب اکبرآبادی

صاحبزادہ باقی احمدپوری

صاحبزادہ باقی احمدپوری ماہر القادری مرحوم کے دوست بھی تھے اور پسندیدہ سخنور بھی، ان کی غزلیں، ان کی نعت، ان سب کو وہ بڑے فخر اور اہتمام سے فاران میں شائع کرتے تھے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ باقی کے اشعار، خاص توجہ اور خاص تونیر کے حقدار ہیں۔
یہ غزل راقم الحروف کی فرمائش پر انہوں نے کویت سے خاص برائے فاران بھیجی ہے۔ پوری غزل ایک حالت کی آئینہ دار ہے۔ اور بزبان حال گویا ہے کہ سے دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور.....

——— مدیر فاران

چھٹتے نہیں ہیں درد کے بادل کسی طرح
اے پربتوں کی تیز ہوا چل کسی طرح

بے خواب کر گیا مجھے تعبیر کے لئے
ایک خواب جو ہوا نہ مکمّل کسی طرح

خوشبو کا زہر کتنے دماغوں کو کھا گیا
گلشن کو پھونک دے کوئی پاگل کسی طرح

ہموار کب ہیں راستے شہر شباب کے
چھلکے گی ایک روز تو چھاگل کسی طرح

میں زندگی کی دھوپ میں جلنے سے بچ گیا
ہاتھوں میں آگیا ترا آنچل کسی طرح

باقیؔ میں جس کے واسطے جاں سے گزر گیا
پھیلا نہ اس کی آنکھ میں کاجل کسی طرح

ادارہ

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا

محترمی جناب مینائی صاحب، سلام و رحمت۔

گرامی نامہ معہ پیکٹ شمارہ جات (فاران) مئی و اگست ۱۹۸۱ء ملا شکریہ۔ یہ بھی معلوم ہوا پچھلے ڈیڑھ سال سے فاران کس لئے غائب تھا۔ یہ خبر اچھی ہے کہ "فاران" کی ادارت اعلیٰ قابلیت و باصلاحیت خاندان منتقل ہو گئی ہے۔ اب زندہ رہے گا اور محنت کے ساتھ پھل پھول سکے گا۔ انشاءاللہ۔

کچھ اپنے بارے میں۔" ماہر صاحب سے میرے بھی عجیب و غریب مراسم رہے ہیں، دوستی بھی تھی، نیازمندی بھی، محبت بھی تھی اور عقیدت بھی۔ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۷۰ء تک یہی صورت رہی۔ ہندوستان آتے تھے تو مجھے پہلے سے لکھ دیتے تھے۔ اپریل ۱۹۷۰ء میں میری درخواست پر ٹونک بھی تشریف لے آئے اور تین دن قیام رہا۔

۱۹۵۶ء میں حج بیت اللہ شریف کے موقع پر مکہ شریف تک سے نوازا۔ "کاروانِ حجاز" چھپی تو مجھے بھیجی۔ "ذرِ یتیم" مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند نے چھاپی تو انہیں لکھ کر ایک نسخہ مجھے پہنچایا۔ تقریباً سوا سو خط ہوں گے۔ اور "فاران" کی سال وار جلدیں بھی مکمل موجود ہیں سوائے اس زمانے کے جو بین المملکتی کشیدگی کے باعث رسل و رسائل میں مانع رہا۔ خدا بخش لائبریری "پٹنہ" فاران کی تمام جلدیں اور ماہر صاحب کے خطوط کو مائیکرو فلم کرانا چاہتی ہے۔ مجھے چھ ماہ سے مانگ رہی ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ انہیں کیسے کسی کے حوالے کروں۔

اپریل ۱۹۲۹ء سے ۱۹۷۶ء تک کا فاران ماہر صاحب کے قلمی ایڈریس سے ملا۔ غرضیکہ چالیس سال آناً فاناً میں نکل گئے جانے کتنے معرکے سر ہوئے۔ کتنے سفر ساتھ ہوئے۔ دو بار "کیمبل اسٹریٹ" میں خود میرا اچھا خاصا قیام رہا۔

اردو زبان کا ادنیٰ طالب علم ہوں۔ بدقسمتی سے مزاج تنقیدی مل گیا۔ دادا صاحب مرحوم امام الشعرا حافظ محمد عالمگیر خانصاحب (کیف) استاد امیر مینائی علیہ الرحمہ کے شاگرد تھے۔ فن اور زبان کیلئے برسوں لکھنؤ اور دہلی پڑے رہتے ایک قطعہ میں فرماتے ہیں کہ

رہا ہوں کیف فرنگی محل کے کلوں میں۔ یونہی تو آتی ہے اردو کی بول چال مجھے۔

امیر مینائی علیہ الرحمہ سے تلمذ و تعلق کے سبب لکھنؤ کی زبان کے دلدادہ و شیفتہ تھے۔ حالانکہ دہلی کی زبان پر بھی اہل زبان (دہلی کے نزدیک مستند اور استاد تسلیم کیئے جاتے تھے۔ سید وحید الدین احمد بیخود دہلوی، جانشینِ حضرتِ داغ مرحوم سے ایسی

دانت کاٹی کہ برسوں دہلی سے نہیں آنے دیا جاتا۔ دربار جھالاواڑ (راجپوتانہ) میں دربار کے معزز و منتخب شاعر دربار بھوانی سنگھ (آنجہانی) بھرے دربار میں کیفؔ بھگوان کہہ کر پکارتے۔ جہاں استاد حضرت داغؔ اور استاد امیر مینائی علیہ الرحمۃ کی ہم طرح غزلوں سے پورا دیوان بھرا پڑا ہے جو ابھی تک طبع نہ ہو سکا۔ ایک مقطع میں فرماتے ہیں۔

اس طرز اس روش کا جادو بیان شاعر یا کیفؔ ٹونک میں ہے یا داغؔ تھا دکن میں

دربار دکن سے دعوت آئی تھی۔ نہیں گئے۔ غزل (طرحی) بھیج دی۔ مقطع یوں تھا۔ کہ

عزت افزائی کی خاطر کیفؔ کیوں جائے دکن قدرداں راجہ بھوانی سنگھ جب پاٹن میں ہے

(جھالرا پاٹن بھی ریاست جھالاواڑ ہی کا نام ہے۔) خط طویل ہو گیا ہے۔ بات جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔

اچھا اب اجازت دیں۔ خدا حافظ۔

محمد عمر سیفی۔ امیر گنج ٹونک، راجستھان، (انڈیا)

والد مرحوم بھی شاعر تھے بسمل سعیدی کے ہم عصر۔ رفیق اور ساتھی۔ عالم دین زاہد باالتقویٰ۔ بقول ماہر صاحب کے پاکباز شاعر سیفؔ تخلص فرماتے تھے اسی نسبت سے خاکسار اپنے آپکو سیفی لکھتا ہے

محترمی جناب بینائی صاحب سلام مسنون۔ مزاج گرامی۔

ستمبر ۱۹۸۱ء کا فاران موصول ہوتے ہی پڑھ لیا تھا لیکن خط اس لئے نہیں لکھا تھا کہ ضروری باتیں آپ کو لکھنی تھیں اور ان کے لئے وقت درکار تھا چار جنتریوں اور کئی ماہنامے اور دیگر اخبارات کے لئے بھی کچھ نہ کچھ لکھنا ضروری تھا۔ اب کچھ معمولی سا وقت نکال سکا ہوں۔ "فاران" کا معیار دیکھ کر آنجناب کی محنتِ شاقہ اور مخلص احباب کی دلچسپی اور وابستگی کا اندازہ مشکل نہیں۔ اسی لئے اطمینان ہے۔ البتہ کتابت پر توجہ کی ضرورت ہے۔ جا بجا سہو پایا جاتا ہے۔ یہ صرف اظہار خیال کر رہا ہوں۔ نکتہ چینی نہ سمجھ لیجیے گا۔ میں اپنے معنفقین سے التماس کرتا ہوں کہ "خُرد" بمعنی چھوٹا، مہین یا ریزہ ریزہ وغیرہ ہے۔ "خورد" لکھنا یا املا کرنا غیر حقیقی ہے۔ اس لفظ پر بھائی ماہر القادری سے تبادلۂ خیال ہو چکا ہے اور بالآخر انہوں نے مجھ سے اتفاق کیا۔ یہ چند الفاظ فاران میں "خورد" پڑھ کر لکھ دیئے ہیں۔ "خوردن" مصدر ہے جس کا مضارع "خورد" ہے۔ "خردبین"۔ "الائچی خورد"۔ "خرد و کلاں" وغیرہ صحیح ہیں لیکن "خوردبین" "الائچی خورد" اور "خورد و کلاں" درست نہیں۔ مرحوم نیاز فتح پوری کو بھی میں نے ان کے ایک مستقل عنوان "کلامِ غالب کا خوردبینی مطالعہ" پر متوجہ کیا۔ الحمدللہ کہ انہوں نے بھی اس پر سنجیدگی سے غور کیا۔

"فاران" کے تمام مضامین معیاری ہیں۔ اور جو حضرات کہ اس کارِ خیر میں حصّہ لیتے ہیں۔ انہیں محبت و احترام کی نظر سے دیکھتا رہا ہوں۔ محترم جناب عبدالقدوس ہاشمی بہترین لکھنے والے ہیں ان کی تحریریں جہاں کہیں نظر آتی ہیں شوق سے دیکھتا انہوں نے اس مرتبہ فاران کو تعویذ بخشا ہے۔!

"حسن" اعتدال اور انصاف کی حقیقی شکل کا نام ہے۔ تعویذ ایک ایسا مضمون ہے جس میں حالات واقعات کی عبرتناک تصویر کشی کی گئی ہے اور اپنے انداز میں "قوم پرستی" کو ضرب پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن جذبات کی رو میں مضمون کے ساتھ انصاف و اعتدال روا نہیں رکھا اس طرح ان کا یہ لسانیؔ "چاند پر دھبہ" نظر آتا ہے۔! زیر نظر مسئلہ اس قابل ہے کہ اس پر یقین و اعتماد کے ساتھ لکھا

...یئے لیکن فاضل مصنف نے جا بجا "گمان واحتمال" کا سہارا لے کر اپنی بے یقینی کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً صفحہ ۹۵ پر پندرہویں سطر
شروع کی ہے ــــ "ہوا یوں ہوگا کہ انسان نے اپنی گمراہی کی ابتدا میں الخ..." بعد میں بھی۔ "ایسا ہوگا اور ویسا ہوا ہوگا
...کے ہی "خیال آرائی" کی ہے اس تمام مسئلہ پر اظہار خیال کا وزن ہلکا ہو گیا ہے پر اثر تحریر میں اعتماد و یقین کا رنگ ضرور آنا
...ہیئے۔ یا وہ خود بھی صفحہ ۱۰۰ پر آخری سطر میں لکھتے ہیں کہ۔ قانون یا شریعت میں یہ کسی کے لئے جائز نہیں کہ جس بات کا اسے خود
...ن نہ ہو سکا، دوسروں کو یقین دلائے۔ ان کے یہ الفاظ بھی اعتدال سے چشم پوشی ہے کہ ــــ" اور جو لوگ قرآن مجید کی آیات
...ی دعاؤں سے تعویذ لکھتے ہیں انہیں بھی یہ عمل چھوڑ دینا چاہیئے! اگر یہ عمل نیکی کا عمل ہوتا تو خود رسول اللہ کرتے۔"
...لانکہ بعض تہدیدی حوالے موجود ہیں کہ ــــ بسم اللہ کیوں نہ کہی ــ ؟" ــــ" انشاءاللہ کیوں نہ کہا! ــــ
...رے مسلمان بسم اللہ پڑھتے اور لکھتے ہیں۔ انشاءاللہ بھی کہتے اور لکھتے ہیں۔ قدم قدم پر کوئی نہ کوئی دعا کی جاتی
... مسجد سے بیت الخلا اور جلوتوں سے خلوتوں تک ہر قسم کی دعا موجود ہے ــ! ہمہ اوقات "اللھم اخفظنی من
...ے بلاء" ــــ "اھدنا الصّراط المستقیم" وغیرہ بہت سی دعائیں ہیں جو ورد زبان رہتی ہیں ــ! اگر ان میں
...ی برکت یا سعادت نہ ہوتی تو زحمت کیوں کی جاتی؟ ــ نماز استسقاء کیوں پڑھی جاتی۔ آلام و مصائب سے نجات
...صل کرنے کی نیت سے اذانیں کیوں دی جاتیں۔

صفحہ ۹۹ پر مقامات علیین وسجین کا ذکر ہے معلوم نہیں "مقام" سے کیا مراد لی گئی ہے ــ؟ علیین وسجین اگر
...رجات نہیں جیسا کہ مضمون سے ظاہر ہے تو قبر کی کیا حیثیت رہجاتی ہے۔ جس کے پاس جا کر السلام علیکم یا اھل القبور
...ے خطاب کیا جاتا ہے۔ گو کہ جواب میں اہل القبور بھی دعا دیتے ہیں اگرچہ ہم انہیں دیکھتے یا سنتے نہیں۔؟ اب ایک دوسرا
...رخ بھی ہے کہ نہ صرف غیر مسلم مرنے کے بعد جلائے یا دریا میں بہائے جاتے ہیں جو جانوروں کی خوراک بن جاتے ہیں بلکہ
...سلمان بھی آگ میں حادثاتی طور پر جل جاتے ہیں اور پانی میں ان کا جسم ضائع ہو جاتا ہے۔ تو ایسی حالت میں "عذاب قبر" کا
...تصور و عقیدہ بے معنی قرار پاتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ" لفظ "قبر" عام نگاہوں میں زمین کا وہ گڑھا ہے جسمیں مردے کو چند
...فوس دفنا دیتے ہیں اس طرح قبر کا اصل مفہوم پس منظر میں چلا گیا "صور پھونکا جائے گا اور مردے اپنی قبروں سے نکل
...یں گے یہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے اور درست ہے اب غور فرمایئے کہ اگر قبر سے مراد صرف ایک زمین کے گڑھے سے ہے تو ان
...ردوں کا کیا بنے گا جو جل کر راکھ ہو گئے یا جنہیں مچھلیوں وغیرہ نے اپنی غذا بنا لیا۔ ؟ اہل بصیرت وفراست جانتے ہیں کہ قبر کا
...مفہوم لامحدود اور نہایت وسیع ہے۔ اور علیین وسجین درجات ہیں۔ یہ روحانی معاملات ہیں جن کا مادیت سے کوئی تعلق نہیں!
...یں جادو، ٹونہ، طلسمات، تعویذات، گنڈے، اور جھاڑ پھونک کا دفاع نہیں کر رہا ہوں۔ فاضل مصنف کا پر جوش مؤید ہوں
...لیکن توہم پرستی کے سلسلے میں ان کے استیصال کی اعتدال سے ہٹی ہوئی کوشش پر متاسف ضرور ہوں کہ وہ ناقابلِ قبول کلمات
...ے بھی محتاط نہ رہ سکے، جوشِ خطابت نے مسئلہ کے ایک ہی رخ کو سامنے کر دیا ہے تسامحات تو بہت ہیں اگر ان کا ذکر
...لیا جائے تو نکتہ چینی کا احتمال ہوگا لہذا یہی کافی ہے۔

امید کہ مزاجِ گرامی بعافیت ہوں گے۔ والسلام۔ ــــــــ صفدر گنتوروی ملیر کالونی کراچی۔ ۲۶ر نومبر ۱۹۸۱ء

مکرم و محترم بینائی صاحب! وعلیکم السلام۔

ابھی ابھی "ماہر نمبر فاران اور اکتوبر نمبر فاران موصول ہوئے" "کس منہ سے شکر کیجیے اس لطف خاص کا"! سنا ہے کہ طلوع اسلام میں میرے حوالے سے کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ ابھی میری نظر سے نہیں گزرا۔ اقبال کو ہر مکتبِ فکر کے لوگ اپنے حق و حمایت میں استعمال کر رہے ہیں۔ سوشلسٹ، منکرین اسلام، بریلوی، دیوبندی، دشمنانِ پاکستان، اہلِ حدیث، بلکہ میں نے ایک احمدی کو سنا کہ وہ یہ مصرع پیش کر رہا تھا۔ "یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے"۔ وہ براہیم جس کے اقبال منتظر تھے۔ وہ مرزا صاحب تھے۔

میرے محترم بھائی بینائی صاحب! ہم یا آپ کس کس کا منہ بند کریں گے میں نے کراچی کے یوم اقبال میں فیض احمد فیض کی ایک انگریزی تقریر سنی، میرے ایک دوست نے مجھے اس کا مفہوم اردو میں بتایا کہ تقریر بہت شاندار تھی اس میں اقبال کو "منکر آخرت" ثابت کیا ہے۔ اقبال کے مشہور شارح سلیم چشتی اقبال کو وحدت الوجودی ثابت کرتے رہتے ہیں جس کے جی میں جو آتا ہے وہ کہہ دیتا ہے۔ اقبال عجیب و غریب اور عظیم شخص تھے۔ وہ اپنی نجی مجالس میں ایسی باتیں کر جاتے تھے جو اشاعت میں نہیں آتی تھیں خود مجھے انہوں نے ایک دفعہ ایک خیالی ڈرامہ متعلق مرزا قادیانی سنایا اور ساتھ ہی اس کی اشاعت سے روک دیا میں نزول بخار کے علاج کے لئے ٹیکسلا ہسپتال میں جا رہا ہوں آپ کے مفصل جواب کے لئے فرصت و یکسوئی کی ضرورت ہے جو حاصل نہیں عبد السلام ندوی کی کتاب "اقبال کامل" میں عنوان "اقبال کا مذہب" دیکھیے۔ آپ عالی ظرفی سے ہر رنگ کے مضامین چھاپ دیتے ہیں۔ شاباش۔ مرشی۔ اقبال روڈ۔ دفتر انجمن فیض الاسلام راولپنڈی۔

برادرم مکرم، السلام علیکم۔

ایک عرصے سے آپ کو خط لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ ڈاک کی ہڑتال نے اس ارادہ کو اور تاخیر میں ڈال دیا۔ خط لکھنے کا مقصد اس لیے ضروری تھا کہ آپ کی غیر معمولی کرم فرمائی کا اپنی بساط بھر شکریہ ادا کروں۔ آپ نے اسلامک آرڈر بھی باقاعدگی سے روانہ فرمایا بلکہ اس پر مستزاد کرم "فاران" بھی عنایت فرمایا۔ اس دور دراز مقام پر تنہائی دور کرنے کے یہی ذرائع ہیں اس لیے آپ کی توجہ فرمائی کا شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ نہیں ہیں۔

فاران کا معیار بہت بلند کر دیا ہے یہ اندازہ نہ تھا کہ آپ ایڈیٹر شپ کی ایسی اعلیٰ صلاحیت رکھتے ہیں نفس مضمون اور مضمون نگار کے متعلق ایسی وضاحت کرنا وسیع اور گہرے تجربہ کی نشاندہی کرتا ہے۔

جگر مرحوم کے متعلق اپنے ذاتی علم کی بنا پر اور حقیقی واقعات پر مبنی جو وضاحت کی اس سے ان کی شاعری پر ہی نہیں بلکہ ایسے اعلیٰ کردار کا انسان ہونا شاید پہلی بار منظرِ عام پر آیا ہے۔ اس مضمون کے پڑھنے سے مجھ جیسے ناواقف شخص کے سامنے حیدر آباد کی ادبی زندگی کا نقشہ کھنچ گیا۔ حضرت جلیل، طباطبائی وغیرہ سے یہ روایات ادبی، جامعہ عثمانیہ کے نوجوانوں نے کس طرح اپنی ذاتی اہلیت کی بنا پر خود بخود پیدا کیا۔ یہ آپ نے بڑی تفصیل کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔ جزاک اللہ۔

ماہر نمبر میں مجھے کچھ تشنگی محسوس ہوئی۔ حبیب احمد صدیقی صاحب نے بہت مختصر لکھا ہے۔ لیکن ان کا مضمون گہرائی کا حامل ہے۔ آپ ماہر کے بعد سے قدیم اور قریب دوست ہیں۔ شاید آپ کو قلم اٹھانے کا موقع نہیں ملا۔ ماہر مرحوم کی ہمہ گیر شخصیت چند

حضرات کی محنت چاہتی ہے۔ ہر شخص ایک پہلو کو لے لے اور اس پر سیر حاصل بحث کرے۔ یہ غرض نہیں کہ ماہر کی شہرت بلند ہو وہ تو ابھی سے بالا تر ہو گئے ہیں۔ بلکہ ان کے کارناموں سے اردو زباں میں اضافہ ہو گا اور کم علم ہم جیسے لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے پیش نظر اب کوئی پروگرام ہو گا۔

ذبلیر اللہ ایڈ مانٹن کینیڈا

یا کسی روزنامہ میں فلمی ستاروں کی نجی زندگی کے متعلق سوالات کا جواب دیتا ہو مجھے بذات خود کسی کے "کل وقتی شاعر" یا "کل وقتی ادیب" ہونے پر کوئی اعتراض نہیں۔ اور نہ اس کی شکایت ہے کہ شاعری اور ادب نے بھی اب ایک مستقل پیشہ کی شکل اختیار کر لی جس کو یہ راس آئے خدا اس کو مبارک کرے لیکن دل یہ ضرور چاہتا ہے کہ اس دور میں بھی اگلے وقتوں کی طرح ادب تخلیق ہو نہ بے معنی ہو نہ تخریبی۔ جو با صلاحیت نوجوان لکھنا چاہتے ہیں وہ ضرور لکھیں لیکن لکھنے سے پہلے وہ یہ فیصلہ کر لیں کہ وہ لکھنا کیا چاہتے ہیں اور کیوں لکھنا چاہتے ہیں۔ اور کیا واقعی ان کو ضرور لکھنا ہی چاہیئے کیوں نہ ایک بار پھر میں جناب رشید احمد صدیقی مرحوم کا وہ مقولہ یاد دلادوں کہ اردو کی خدمت یوں بھی ہو سکتی ہے کہ اس میں قلم فرسائی کی زحمت گوارا نہ کی جائے یعنی اس غریب کو خود اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔

اب ایک آخری بات یہ بھی کہہ دوں کہ ممکن ہے شاید کو یہ خدشہ ہو کہ میں ان کے ادبی ذوق اور خوش مزاجی کی تعریف بھی کروں گا تو میں انہیں یہ اطمینان دلانا چاہتا ہوں کہ اس وقت میں ماشاء اللہ سے زیادہ اور نہیں کہوں گا حالانکہ میں جانتا ہوں کہ باوجود اپنی تمام فطری صلاحیتوں کے یہ بھی صبیح محسن کی طرح خدا کے فضل سے "کل وقتی ادیب" نہیں ہیں۔ میرے لیے ایک مجبوری یہ بھی ہے کہ انہی کے والد مرحوم کا جو ایک ممتاز ہیڈ ماسٹر بھی رہ چکے تھے یہ خیال تھا کہ بچے اگر پڑھنے میں دل نہ لگائیں تو ان کو تنبیہ کرنی چاہیئے اور کبھی کسی ذہین بچے سے کوئی کارنامہ سرزد ہو جائے تو اس کی تعریف کبھی اس کے منہ پر نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ اس سے بچے اترانے لگتے ہیں۔

اگست ۱۹۸۱ء کے شمارے میں صفحہ نمبر ۵ پر

جناب ظہیر رضوی کی غزل کے قوافی۔ آتے، جاتے، پاتے وغیرہ ہیں۔ مگر مطلع کے دونوں مصرعوں میں غلطی سے "نظر آتے ہیں" لکھ دیا گیا ہے۔ دراصل مطلع یوں تھا۔

طور بے طور نظر آتے ہیں۔　　　اپنے بھی غیر ہوئے جاتے ہیں۔

ادارہ اس سہو کتابت کے لئے معذرت خواہ ہے

ارشادات خسروی

یہ مانا قفل محبس تو نہ ٹوٹے گا کبھی لیکن۔
ہر ایک دیوار و در ہو جائیگی فصل بہاراں میں

سلاسل سے دبے گا کب جنوں، جب ہر نفس ہر دم
شمیم گل تو خمیرہ وحشت سے پھوٹے گی زنداں میں

جنون عقل میں انسان کا یہ حال ہوا
جسے سمجھ نہ سکے اس کو مانتا ہی نہیں

کمال علم کا دعویٰ ہے مگر کمال یہ ہے
خدا کا نام اگر تو تو جانتا ہی نہیں

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

شوق ماہری (کھنٹا بھارت)

وہ بچھڑ کر رہ گئے وہ بزم آرائی گئی
رہ گئیں آنکھیں مگر آنکھوں کی بینائی گئی

جوشِ وحشت کم ہوا یا اور دفرنت تھم گیا
تم نے کیا سوچا تھا کیوں زنجیر پہنائی گئی

ذکرِ غم آیا جہاں ہم مسکرا کر رہ گئے
وہ سمجھتے ہیں کہ دل کی چوٹ دکھلائی گئی

اے دلِ ناشاد کچھ حاصل دعاؤں سے ہوا
صبحِ راحت آگئی یا شامِ تنہائی گئی۔

یہ مری تقدیر ہے مجھ کو قرار آیا نہیں
آپ کی جانب سے گو کوشش تو فرمائی گئی

ان کے دم سے تھی حقیقت میں بہار رنگ و بو
وہ چمن سے کیا گئے پھولوں کی رعنائی گئی

میری غزلوں نے مجھے اے شوق رسوا کر دیا
دور تک میں دیکھتا ہوں میری رسوائی گئی

اتنی جلدی نہ موت آئی پاس
لے کے ڈوبی طبیعت حساس

کیوں فسردہ سی ہیں مری صبحیں
میری شامیں ہیں کیوں اُداس اُداس

کب کی انسانیت ہوگی رخصت
اب رہا ہے خلوص کس کے پاس

کتنے دلدوز تھے وہ تیر نظر
چوٹ کھا کے ہوا مجھے احساس

صرف کہنا تھا رازِ دل طارق
کاش آ بیٹھتے وہ میرے پاس

محمد طارق خاں طارق رام پوری

ہادی القادری
(بھارت)

جلوۂ حُسن ہے نظر دشمن
شوق اپنا سہی مگر دشمن

عشق ہی وہ مقام ہے کہ جہاں
دوست قاتل ہے چارہ گر دشمن

ہیں عجب دردِ عشق کے آداب
آہ کھینچو مگر اثر دشمن

وسعتِ کائنات ہو ہم ہوں
شوق کا ولولہ ہے گھر دشمن

کیا اٹھائےگے ننگ بے ہنری
ہے جو ہادی جہانِ ہنر دشمن

متفرقات — شاہد صدیقی مرحوم

سن کر اک خاموش تقاضا ماضی کے افسانوں کا
میں نے خاکہ ڈال دیا مستقبل کے ایوانوں کا

زحمتِ استقبال اٹھا کر سو گئے میرے اہل وطن۔
آنکھ کھلی تو سارے گھر پر قبضہ تھا مہمانوں کا

دوریٔ منزل کا شکوہ خامیٔ تدبیر ہے۔
جو قدم غفلت میں اُٹھ جائے وہی زنجیر ہے

کلیاں جتنا چاہیں ہنس لیں آج انہیں آزادی ہے۔
کل کی نسبت کون کہے آئین گلستاں کیا ہوگا

ہم تو پیاسے ہی چلے جائیں گے لیکن ساقی
انقلاب آ کے رہے گا ترے میخانے میں

ہماری نظر میں

نام کتاب　آپا بتاییے　مرتبہ　ایس ایم شاہد
قیمت　۱۵ روپے　صفحات معہ تصاویر　۷۰
پرنٹر اور ملنے کا پتہ۔　فیروز سنز آئی آئی چندریگر روڈ کراچی۔

سید محمد شاہد، کراچی کے ایک باذوق اور خوش باش ادیب ہیں۔ مشغلے کے لحاظ سے وہ ایک اشتہار باز ادارے سے منسلک ہیں کبھی کبھی مشاعرے یا نجی شعری محفلیں بھی ترتیب دیتے رہتے ہیں۔ ان سب خصوصیات کے باوجود مجھ کو ان سے تعلق اور دلچسپی ہونے کا باعث یہ ہے کہ وہ میرے عزیز دوست شرف الدین عظیم آبادی کے بھتیجے ہیں۔

شاہد نے حال ہی میں ایک تصنیف شائع کی ہے۔ "ابا بتاییے" جو بچوں کے ادب میں ایک گراں بہا اضافہ ہے۔ شرف الدین احمد صاحب نے اس پر اور　مصنف کتاب پر جو تبصرہ لکھا ہے وہ اس قدر پر مغز، دلاویز اور مفید ہے کہ "ہماری نظر میں" کے عنوان کے تحت اس کو ہدیہ قارئین کرنا ضروری معلوم ہوا۔　——　مدیر فاران

یہ بات ہے شاہد کی پیدائش سے بہت پہلے کی میں اس وقت اسکول کا طالب علم تھا۔ اسی زمانے میں بچوں کے ایک ہفتہ وار رسالہ غنچہ میں میرا ایک مضمون شائع ہوا جس کا عنوان تھا "اقبال کا اقبال"۔ یہ وہ دور ہے جب کسی طالب علم کی سب سے بڑی خوشی یقینی یہ سمجھی جاتی تھی کہ وہ آئی، سی، ایس کا امتحان پاس کر لے چنانچہ میرے اس افسانہ کا پلاٹ بھی کچھ ایسا ہی تھا کہ اقبال جو اپنی بیوہ ماں کا اکلوتا بیٹا تھا محض محنت سے آئی سی ایس کے مقابلے میں آگیا اور ٹریننگ کے لیے ولایت بھیجدیا گیا۔ جہاں سے واپس آنے کے بعد وہ ضلع کا مجسٹریٹ ہوگیا اور پھر اس کی شادی ایک بڑے آدمی کی اکلوتی لڑکی کے ساتھ ہوگئی۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے یہ مضمون بھائی جان (شاہ محمد حامد صاحب مرحوم) کو جن کے نام سے شاہد نے اپنی تصنیف "ابا بتاییے"، منسوب کی ہے۔　وہ اپنی غیر معمولی قابلیت کے علاوہ ایک عظیم انسان بھی میرا مضمون اسکول کے ایک طالب علم کا جیسا ہو سکتا ہے بس ویسا ہی تھا۔ مگر بھائی جان نے میرا دل بڑھانے کے لیے اس کی تعریف کی، پاس ہی ہماری چھوٹی بہن جو اس وقت "ابا بتاییے" کی ایک اہم کردار سعدیہ سے بھی کافی چھوٹی تھی۔ بیٹھی

سے غور سے سن رہی تھی اور پھر بڑی معصومیت سے اس نے پوچھا۔ بھیا بتائیے تو یہ کس لڑکے کا قصہ ہے؟" میں نے اس وقت ایسا محسوس کیا کہ بھائی جان میرے مضمون سے زیادہ اپنی چھوٹی بہن کے اس سوال سے محظوظ ہو رہے ہیں۔ بہرحال میں نے وہی کہا جو کہہ سکتا تھا کہ کسی خاص لڑکے کا قصہ نہیں ہے، بس یونہی اپنے دل سے لکھ دیا ہے ظاہر ہے یہ میرا جواب اس معصوم ذہن کو بالکل مطمئن نہ کر سکا۔ میری بہن نے حیرت سے مجھے دیکھا اور پھر اس کی زبان سے بے ساختہ جو الفاظ نکلے وہ تھے۔ "ایں بھیا! اِتّا جھوٹ! اس واقعہ کو نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا۔ بھائی جان اور بہن دونوں ہی آج اس دنیا میں نہیں ہیں۔ مگر جب شاہد نے اپنی اس تصنیف کے متعلق مجھ سے پوچھا کہ چچا ابا بتائیے آپ نے اسے کیسا پایا۔" تو میں نے ایسا محسوس کیا جیسے دراصل اس کے تین حصے ہیں۔ "بھیا بتائیے" "ابا بتائیے" "چچا ابا بتائیے"۔ پہلا حصہ آپ نے سن لیا دوسرا آپ نے پڑھ لیا ہوگا رہا تیسرا حصہ تو اس کو مختصراً میں خود ہی سنائے دیتا ہوں کیونکہ اسے صرف میں ہی سنا بھی سکتا ہوں

اس موقعے پر ایک کشمکش اور بھی ہے اور اس کو شاید میں ہی سلجھا سکوں بیشتر لوگ اس کتاب کے مصنف کو صرف دو حیثیتوں سے جانتے ہوں گے۔ کچھ تو ان کے پیشے کی نسبت سے یعنی "ایڈورٹائزنگ" اور کچھ ان کے شوق کے حوالے سے یعنی موسیقی۔ مجھے ذاتی طور پر "ایڈورٹائزنگ" سے کوئی دلچسپی نہیں اور موسیقی میں اچھی غزل اور سریلی آواز سے ضرور لطف اندوز ہو لیتا ہوں لیکن پکے گانوں سے میری صحت پہ اثر پڑتا ہے یعنی یوں سمجھیے کہ "ایڈورٹائزنگ" اور موسیقی دونوں سے قطع نظر میں صاحبِ تصنیف کو محض شاہد کی حیثیت سے پیش کر رہا ہوں۔ اب سوال یہ ہے کہ انہوں نے اتنی دلچسپ کتاب کیوں اور کیسے لکھ دی تو اس سلسلے میں ایک یقین دہانی ضروری ہے اور وہ یہ کہ یہ تخلیق واقعی انہی کی ہے اور یہ اس کے لئے بالکل مجبور تھے، غالب، غالب ہو جانے کے بعد بھی اپنی خاندانی سپہ گری کو نہ بھول سکے۔ اسی طرح شاہد بھی اپنی ایڈورٹائزنگ اور موسیقی کے باوجود ادب کی بیماری سے بچ نہ سکے۔ یعنی جس طرح بعض بیماریاں خاندانی ہوتی ہیں بالکل اسی طرح ادبی جراثیم بھی نسلاً بعد نسلاً کسی نہ کسی شکل میں منتقل ہوتے رہتے ہیں شاہد کا تو اس میں کوئی قصور نہیں کہ یہ اسی اعظم آباد میں کیوں پیدا ہوئے، جہاں راسخ، شاد اور مبارک بھی پیدا ہو چکے تھے۔ شاید یہ اسی اعظم آباد کی کرامت ہے کہ شاہد کے آبا و اجداد میں بھی ایسی ہستیاں پیدا ہوئیں جن پر بجا طور پر وہ فخر کر سکتے ہیں علما اور صوفیوں کا یہ خاندان شعر و ادب میں بھی ہمیشہ ممتاز رہا۔

شاہد والد مرحوم کی شفقت اور تربیت سے بچپن ہی میں محروم ہو گئے اور پھر حالات کچھ اس تیزی سے بدلتے رہے کہ ان کو وہ اخلاقی اور ادبی ماحول نہ مل سکا۔ جس میں ان کے بزرگوں کی نشو و نما ہوئی تھی اس کے باوجود جب میں ان کی اس فطری صلاحیت دیکھتا ہوں جس کا ایک معمولی سا نمونہ ان کی یہ چھوٹی سی تصنیف ہے تو میری کچھ میں خود نہیں آتا کہ آخر ایسا کیونکر ہو جاتا ہے اس سوال کا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ بس ہو جاتا ہے۔!

اس کتاب میں دو بچیوں کے معصوم سوالات کو جس دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے اس سے اردو میں ایک نئے مصنف کا اضافہ ہوا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس میں خود بڑوں کیلئے بھی ایک اچھا خاصا درس موجود ہے مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب کے بچے کچھ زیادہ ہی ذہین ہوتے ہیں۔ اور بعض اوقات تو ایسے سوالات کر بیٹھتے ہیں کہ اگر ان کا تشفی بخش

جواب نہ دیا گیا تو ان کا تجسس خطرناک صورت بھی اختیار کر سکتا ہے بہر حال اس موضوع پر ماہرانہ گفتگو تو وہی حضرات کر سکتے ہیں جو اس کے اہل ہیں ذاتی طور پر مجھے اس قسم کی جرأت کرنے سے پہلے ہمیشہ اپنے شفیق اور محترم استاد جناب پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم کا وہ فقرہ یاد آجاتا ہے کہ اردو ادب کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ نا اہل حضرات قلم فرسائی کی زحمت گوارا نہ فرمائیں (زور ہے "نہ فرمانے" پر) میں تو صرف اس کی صراحت پر اکتفا کروں گا کہ مجھے خود اس چھوٹی سی تصنیف میں کونسی چیزیں واقعی پسند آئیں۔

پہلی نمایاں خوبی تو اس کی یہ ہے کہ ایک "ایڈورٹائزر" کی پہلی تصنیف کے ساتھ خدا کے فضل سے کوئی چھوٹا سا بھی SOVENIR نہیں ہے ورنہ اب تو اکثر تصنیف سے زیادہ تندرست اس کا SOVENIOR ہی ہوتا ہے جس کے اوراق مختلف ناموں کی سپاریوں، متعدد برانڈ کی اگر بتیوں، مغربی و مشرقی مشروبات، طرح طرح کے اچار چٹنیوں اور معاجات اور اکثر تو نئے ڈیزائینوں کے چپلوں کے معلوماتی اشتہارات سے مزین ہوتے ہیں اس سلسلے میں ایک بہت ہی بے ساختہ تبصرہ بھی سن لیجئے۔ میری اور شاہد کی ایک عزیزہ کو یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ اس کتاب میں کاغذ کی بڑی بربادی ہوئی ہے یعنی بقول ان کے یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ سارے کا سارا صفحہ تو سادہ چھوڑ دیا جائے اور نیچے بس ایک چھوٹا سا جملہ لکھ دیا مثلاً "ابا لوگ گناہ کیوں کرتے ہیں" اگر ہر صفحہ کی خالی جگہ میں ایک یا دو اشتہار بھی چھاپ دیتے تو اس میں ابھی کا فائدہ تھا۔

دوسری چیز مجھے اس میں یہ پسند آئی کہ اس کے پہلے ہی صفحے پر مصنف کی کوئی ایسی تصویر بھی نہیں ہے جس میں وہ ایک شاندار عینک لگائے اور ہاتھ میں قلم لیئے عالم فکر میں نظر آ رہا ہو اس کتاب کے کسی کونے میں ایک پریشان کن چھوٹی سی تصویر ضرور ہے لیکن یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا ہے کہ یہ کس کی ہے اسے دیکھ کر ممکن ہے سعدیہ ہی نے پوچھا بھی ہو کہ "ابا بتایئے کہ آپ نے اپنی ہی تصویر کیوں نہ چھپوا دی" چونکہ اس تصویر کے ساتھ ہی ڈاکٹر اسلم فرخی کا (جن کا انداز بیان مجھے بہت پسند ہے) مختصر مگر خوبصورت سا تبصرہ بھی موجود ہے اس لیئے کوئی وجہ نہیں کہ میں اسے خدانخواستہ ڈاکٹر صاحب کی تصویر نہ سمجھ لیتا

پسند نمبر ۳ — اس کا مختصر ترین "پیش لفظ" ہے جس میں نہ تو اپنی کم مائیگی کا رونا ہے، نہ دوستوں کی ہمدردی کا شکریہ اور نہ آخر میں قوم سے کسی مخصوص توجہ کی عاجزانہ اپیل۔

چوتھی اور آخری چیز جس سے مجھے خوشی ہوئی وہ یہ ہے کہ مصنف نے اپنی کتاب میں جو کچھ لکھا وہ مجھ جیسا انسان بھی آسانی سے سمجھ لیتا ہے یہاں تک کہ خود اپنی بچیوں کے جن سوالات کے جواب ان سے نہ دیئے جا سکے اس کی وجہ بھی میری سمجھ میں آگئی۔

حال ہی میں ایک اور کتاب بھی میری نظر سے گزری اور اس کی بھی یہی خوبی ہے کہ وہ سمجھ میں آجاتی ہے وہ ہے صبیح محسن کی "بین السطور" اس کتاب کا ذکر میں صرف اس لیئے کر رہا ہوں کہ اس میں مصنف نے شاعر کی ایک بالکل ہی نئی صنف دریافت کی ہے اور جس کو وہ کہتے ہیں "کل وقتی شاعر" یہ اصطلاح اتنی جامع اور معنی خیز ہے کہ اس کی کسی مزید تشریح کی ضرورت نہیں " کل وقتی شاعر" کا اطلاق صرف شاعر ہی پر نہیں ادیب پر بھی ہو سکتا ہے چاہے وہ ناول لکھتا ہو، افسانہ لکھتا ہو، ڈرامہ لکھتا ہو، کالم لکھتا ہو

باقی صفحہ نمبر ۵۵

یہ مسرت
دائم و قائم رہے
اِن صاحب کی طرح
اپنے خاندان کی مسرتوں کو دائمی بنانے کے لئے
نیشنل بینک کا مستقل آمدنی
کا منصوبہ اپنائیے

بانی: ماہر القادری

ماہنامہ

فاران

مدیر: اسمٰعیل احمد مینائی

۲۱۸، بہادر آباد، کراچی

(ٹیلیفون ۴۱۶۳۱۲)

ترقی کے ساحل کی سمت گامزن

بانی۔ مولانا ماہر القادری

ماہنامہ **فاران** کراچی

رجسٹرڈ ایس نمبر ۔۔۔۔ ۱۲۶۲

دسمبر سنہ ۱۹۸۱ء

جلد نمبر ۔۔۔۔ ۳۳

شمارہ نمبر ۔۔۔۔ ۳

ایڈیٹر

اسمٰعیل احمد مینائی

قیمت فی پرچہ ۔۔۔۔ ۵ روپے

چندہ سالانہ ۔۔۔۔ ۵۰ روپے

پبلشر ۔۔۔۔ اسمٰعیل احمد مینائی

دفتر

ماہنامہ فاران نمبر ۲۱۸

بہادر آباد کراچی

فاران کا تازہ شمارہ اور پرانے شمارے صدر ریگل کے بک اسٹالوں پر دستیاب ہیں۔ مینجر

اِس شمارے میں

"قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہوں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔"

پبلشر اسمٰعیل احمد مینائی نے انجمن پریس کراچی سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ فاران نمبر ۲۱۸ بہادر آباد کراچی سے شائع کیا۔ فون نمبر ۴۱۲۱۶۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

دسمبر کا مہینہ انگریزی سال کا آخری مہینہ ہے۔ اتفاق سے بڑے بڑے کام اسی مہینے میں انجام پاتے ہیں۔ بڑا دن بھی دسمبر میں آتا ہے۔ قائد اعظم کا یوم پیدائش بھی اسی مہینے میں منایا جاتا ہے۔ سردی عام طور پر اسی مہینے میں شباب پر ہوتی ہے اسی لیے تقاریب جلسے، مذاکرے، کانفرنسیں بیشتر اسی مہینے میں مقرر و منعقد کی جاتی ہیں۔ بیرونِ ملک جو پاکستانی ملازمت کرتے ہیں ان کی چھٹیاں بھی دسمبر ہی میں ہوتی ہیں اور وہ اپنی رخصتوں کا زمانہ بھی عام طور پر انہیں تعطیلات سے بلا لیتے ہیں تاکہ وطن آکر کچھ دنوں عزیز و اقارب میں رہ سکیں اس نقطۂ نظر سے یہ مہینہ مسافرت کا نہیں اقامت کا ہونا چاہیے۔ لیکن کیا کیا جائے کہ اور مملکتوں میں بھی وہی چلن ہے جو یہاں ہے وہاں بھی وہاں بھی تقاریب جلسے، مذاکرے، کانفرنسیں اسی مہینے میں برپا ہوتی ہیں۔ ایک غالب انسٹی ٹیوٹ ہے دہلی میں جو اپنی کارگزاری کے اعتبار سے بڑا فعّال ادارہ ہے۔ اس سال اس کے پروگرام میں ایک بین الاقوامی مذاکرہ شامل ہے جس کے لیے عنوان دیا گیا ہے "غالب اور اس کا دور یا عہد GHALIB-AND-HIS-AGE"

کارپردازانِ انسٹی ٹیوٹ نے خدا جانے کس مناسبت سے اور کس بنا پر امسال راقم الحروف کو بھی دعوت دی ہے اس مذاکرے میں شرکت کی اور مقالہ پڑھنے کی۔ ایک زمانہ تھا (اور وہ جوانی کا زمانہ تھا) جب غالب اور اقبال کا مطالعہ راقم الحروف کا سب سے محبوب مشغلہ تھا۔ اور لکھنے پڑھنے کی جس قدر مشغولیت و مصروفیت تھی وہ انہی دونوں مشاہیر کے نام و کام سے وابستہ تھی۔ پہلی تصنیف "دو مرزا" جس کو آنند پریس لکھنؤ نے باقاعدہ شائع کیا، دراصل غالب ہی سے متعلق ہے جس میں یگانہ کے ہفوات، کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور اس چنگیزی کے بمتر و تکبّر کی بت شکنی عمل میں آئی ہے"

قیام دکن کے دور میں جناب یگانہ" اس ضرب سے کبھی پنپ نہ سکے اور قیام پاکستان تک ان سے نوک جھونک ہوتی رہی اس لیے مطالعۂ غالب کا سلسلہ بھی باقی رہا، لیکن کراچی آنے کے بعد راقم الحروف علمی زندگی سے تقریباً کٹ کر رہ گیا۔ اور یہ شکل اس وقت تک باقی رہی جب تک فاران کی ادارت مجھ کو منتقل نہیں ہوئی۔

اپنی اس بے مائیگی کی بنا پر مجھ کو تامل تھا کہ اس عالمی ترتبت اجتماع میں شرکت کی دعوت کو قبول کیا جائے یا نہیں۔ رحمت کو درخواست دی ہے لیکن وہ اسی جاری کرنے کی جس کا ہنوز کوئی نتیجہ نہیں نکلا ہے۔ عرض کرنے کا مطلب یہ ہے

سفرِ ہند درپیش ہے اس لئے دسمبر کا شمارہ بھی قدرے تاخیر سے آپ تک پہنچے گا اور جنوری کا پرچہ جو میری واپسی کے بعد مرتب ہوگا یقیناً مؤخر ہو جائے گا اسی باعث جنوری ۱۹۸۲ء میں سیرت نمبر نکالنے کے منصوبے کو بھی ملتوی کرنا پڑا قارئین سے التماس ہے کہ سیرت نمبر کے بارے میں شمارہ اکتوبر ۱۹۸۱ء میں جو معروضات پیش کیے گئے ہیں ان پر ہمدردانہ غور و فکر کے بعد ادارہ فاران کی جانب دستِ تعاون بڑھایا جائے

اسمٰعیل احمد مینائی
۱۰ دسمبر ۱۹۸۱ء

آوازِ غیب

مسلمانوں کی بے علمی میں خود مسلمانوں کے بعض نادان طبقوں کے آئمہ وقائدین کی ناعاقبت اندیشی کو دخل ہے جنہوں نے نہ تعلیم اسلامی کی روح کو پہچانا نہ زمانے کے تقاضوں پر نظر کی۔ اُسی خوابِ گراں سے چونکانے کے لئے اقبالؒ کی یہ ولولہ انگیز نظم یہاں نقل کی جاتی ہے —— مدیر فاران

آتی ہے دمِ صبح صدا عرشِ بریں سے
کھویا گیا کس طرح ترا جوہرِ افلاک۔
کس طرح ہوا کند ترا نشترِ تحقیق۔
ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک؟
تو ظاہر و باطن کی خلافت کا سزاوار
کیا شعلہ بھی ہوتا ہے غلامِ خس و خاشاک
مہر و مہ و انجم نہیں محکوم ترے کیوں؟
کیوں تیری نگاہوں سے لرزتے نہیں افلاک
اب تک ہے رواں گرچہ لہو تیری رگوں میں!
نے گرمئ افکار، نہ اندیشۂ بیباک۔
روشن تو وہ ہوتی ہے جہاں بیں نہیں ہوتی
جس آنکھ کے پردوں میں نہیں ہے نگہِ پاک
باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری۔

طالب ہاشمی

حضرت فراس الاقرع تمیمی

۱

فتح مکہ اور غزوۂ حنین (۸ھ) کے بعد سارے عرب نے آستانۂ اسلام کے سامنے سر جھکا دیا اور عرب کے گوشے گوشے سے لوگوں نے وفدوں کی صورت میں مدینہ منورہ کا رخ کیا ان میں سے بیشتر وفود شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہونے کے لئے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے جو پہلے ہی سعادت اندوزِ اسلام ہو چکے تھے وہ حضورؐ کی زیارت اور بیعت سے مشرف ہونے کے لئے آئے اور کچھ ایسے بھی تھے جو اہلِ حق سے صلح و امن کا معاہدہ کرنے کے لئے مدینہ منورہ میں وارد ہوئے۔ ان میں سے بعض وفود نے اسلام کے مزاج سے ناآشنا ہونے کے باعث قبول اسلام یا اظہارِ اطاعت سے پہلے عجیب و غریب شرطیں پیش کیں جن کا رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مناسب جواب دیا۔ ایسا ہی ایک وفد بنو تمیم کا تھا۔ ستر یا اسی آدمیوں پر مشتمل یہ وفد ۹ھ (عام الوفود) میں بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے مدینہ منورہ آیا اس میں قبیلہ کے بڑے بڑے رؤسا اور اربابِ کمال شامل تھے۔ یہ لوگ بڑا اونچا دماغ رکھتے تھے اور اپنی زبان آوری، خطابت اور شعر و شاعری کے سامنے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ انہوں نے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر کہا کہ پہلے مسلمان ہم سے مفاخرہ کریں اگر وہ اس میں جیت جائیں تو پھر اسلام کی بات ہو گی۔

حضورؐ نے ان کے جواب میں فرمایا کہ میں فخاری اور شعر بازی کے لئے مبعوث نہیں ہوا لیکن اگر تم کو اسی پر اصرار ہے تو ہم اس سے بھی عاجز نہیں ہیں۔ بسم اللہ۔ اجازت پا کر بنو تمیم کی طرف سے پہلے عطارد بن حاجب کھڑے ہوئے انہوں نے ایک پر زور اور پر شکوہ تقریر کی جس میں اپنے قبیلے کے جاہ و حشم، اثر و اقتدار، بلند نسبتی، تمول، شجاعت اور مہمان نوازی کا نہایت مؤثر انداز میں ذکر کیا۔ جب ان کی تقریر ختم ہوئی تو حضورؐ نے حضرت ثابتؓ بن قیس انصاری کو حکم دیا کہ وہ اس کا جواب دے۔ انہوں نے کھڑے ہو کر پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ستائش کی اس کے بعد رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت، دعوتِ حق کی تفصیل، نزولِ قرآن اور مہاجرین و انصار کے فضائل کو ایسی فصاحت و بلاغت سے بیان کیا کہ ساری مجلس ساکت ہو گئی۔

اب بنو تمیم کی طرف سے زبرقان بن بدر شعر و شاعری کے مقابلے کے لئے کھڑے ہوئے اور نہایت پر زور اشعار پڑھے جن میں اپنے قبیلے کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ جب وہ بیٹھے تو حضورؐ نے حضرت حسانؓ بن ثابت سے

فرمایا کہ اٹھو اور جواب دو۔ حضرت حسانؓ نے تعمیلِ ارشاد کی اور ایسے اثر انگیز اشعار پڑھے کہ ان کے سامنے زبرقان بن بدر کے اشعار گرد ہو کر رہ گئے۔ جونہی وہ اپنے جوابی اشعار ختم کر کے بیٹھے، بنو تمیم کے وفد سے ایک بارعب شخص کھڑے ہو گئے۔ ان صاحب کے سر کے بال اڑے ہوئے تھے اور ایک ٹانگ میں لنگ بھی تھا۔ لیکن ان کے چہرے مہرے اور چال ڈھال میں امارت و ریاست اور تدبر کی شان تھی اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ قبیلے کے سربرآوردہ آدمی ہیں۔ انہوں نے ارکانِ وفد سے مخاطب ہو کر باآوازِ بلند کہا۔

"باپ کی قسم محمدؐ کا خطیب ہمارے خطیب سے افضل ہے اور ان کا شاعر ہمارے شاعر سے بہتر ہے ان کی آوازیں ہماری آوازوں سے زیادہ دلکش اور شیریں ہیں میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ اور آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اس سے پہلے جو کچھ ہو چکا وہ آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔"

تمام اہلِ وفد ان کے جواب میں بیک زبان پکار اٹھے "آپ نے سچ کہا، آپ نے سچ کہا" اور پھر آناً فاناً سارے تمیمیوں نے اپنے ہاتھ رحمتِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک میں دے دیئے۔

یہ صاحب جنہوں نے مفاخرت میں اپنے قبیلے کی ہار کو برملا تسلیم کیا اور سب اہلِ قبیلہ کو دائرہ اسلام میں لے گئے حضرت فراس الاقرع تمیمیؓ تھے۔

——— ۲ ———

حضرت فراس الاقرعؓ جو تاریخ میں بالعموم اقرعؓ بن حابس کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں، عرب کے مشہور قبیلہ بنو تمیم کے بہادر اور نامور سردار تھے سلسلۂ نسب یہ ہے۔

فراس (اقرع) بن حابس بن عبقان یا (عقال) بن محمد بن سفیان بن مجاشع بن دارم بن مالک بن حنظلہ بن مالک بن زید بن مناۃ بن تمیم۔

اہلِ سیر نے حضرت فراس کے تین القاب بیان کیے ہیں، الاقرع، الاعرج اور جرار۔ الاقرع اس لیے کہ ان کے سر کے بال اڑے ہوئے تھے الاعرج اس لیے کہ ان کے ایک پیر میں لنگ تھا۔ جرار (یعنی ایک ہزار لشکریوں کی قیادت کرنے والا) اس لیے کہ وہ نہایت شجاع تھے۔ اور انہوں نے زمانہ جاہلیت کی لڑائی یوم الکلاب الاول یا (الثانی) میں بنو حنظلہ کی قیادت کی تھی۔ نسب کی نسبت سے حضرت فراس الاقرعؓ کو التمیمی کے علاوہ المجاشعی الدارمی اور الحنظلی بھی کہا جاتا ہے۔

حضرت اقرعؓ بن حابس نہایت شجاع اور زیرک آدمی تھے۔ ابنِ اثیر کا بیان ہے کہ وہ شعر و شاعری میں بھی درک رکھتے تھے وہ نہ صرف اپنے قبیلے کے سرکردہ فرد تھے بلکہ عرب بھر میں ان کی عزت و شرافت مسلّم تھی۔ حافظ ابن حجرؒ نے "الاصابہ" میں اور محمد بن حبیبؒ نے کتاب المحبّر میں لکھا ہے کہ حضرت اقرعؓ بن حابس زمانہ جاہلیت کے عرب دانشوروں ثالثوں اور رہنماؤں (سربراہوں) میں شمار ہوتے تھے۔

علامہ مجدالدین فیروزآبادی صاحب القاموس کا بیان ہے کہ جاہلی دور میں سوق عکاظ کے موقع پر عرب قبائل کے گرد باہمی جھگڑوں کو نمٹانے کا فرض تمیم کے سپرد تھا گویا بنو تمیم اہلِ عرب کے ثالث یا جج تھے۔ ظہور اسلام کے وقت یہ عہدہ حضرت اقرع رض بن حابس کے پاس تھا۔ شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہونے کے بعد بھی حضرت اقرع رض کی دنیوی حیثیت برقرار رہی اور لوگ ہمیشہ انہیں ایک شریف دانا اور ذی اثر سردار کے طور پر مانتے رہے۔

حضرت اقرع رض نے قبول ایمان کی سعادت کب حاصل کی؟ اس کے بارے میں دو مختلف رائیں ہیں۔ ایک رائے کے مطابق وہ فتح مکہ سے پہلے اسلام لا چکے تھے اور انہوں نے ایک مسلمان مجاہد کی حیثیت سے فتح مکہ، غزوہ حنین اور غزوہ طائف میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم رکابی کا شرف حاصل کیا۔ (یہ رائے ابنِ حزم کی ہے) دوسری رائے جس کا اظہار ابنِ اثیر نے "اسد الغابہ" میں کیا ہے، یہ ہے کہ حضرت اقرع رض نے ۹ سنہ ھ میں وفد بنو تمیم کے ساتھ اسلام قبول کیا۔ تاہم یہ بات مسلم ہے کہ وہ فتح مکہ، حنین اور طائف میں حضور کے ساتھ تھے اور حضور نے ان کے ساتھ "مولفۃ القلوب" جیسا سلوک کیا۔ (مولفۃ القلوب میں نومسلم بھی شامل تھے اور وہ غیر مسلم بھی جو اسلام سے متاثر تھے) اگر ابنِ اثیر کی رائے کو درست تسلیم کیا جائے تو بھی اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت اقرع رض فتح مکہ سے پہلے اسلام سے متاثر ضرور ہو چکے تھے اور اسی اثر پذیری نے انہیں میدانِ رزم میں حضور کی حمایت میں لا کھڑا کیا تھا۔

غزوۂ حنین میں فتح کے بعد سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مالِ غنیمت تقسیم فرمایا تو حضرت اقرع رض کو بطور تالیفِ قلب ایک سو اونٹ مرحمت فرمائے۔ نامور شاعر صحابی حضرت عباس رض بن مرداس سلمی کو حضرت اقرع رض سے امتیازی سلوک پر بڑا رشک آیا کیونکہ انہیں کم اونٹ عطا ہوئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے فی البدیہہ چند اشعار کہے جن سے آزردگی کا اظہار ہوتا تھا۔ حضور نے یہ اشعار سنے تو حضرت علی رض سے فرمایا۔ اقطع عنی لسانہ۔ (اس کی زبان کاٹ ڈالو) حضرت علی رض عباس رض بن مرداس کا ہاتھ پکڑا اور کہا کہ میرے ساتھ چل۔ انہوں نے راستے میں حضرت علی رض سے پوچھا، علی کیا میری زبان کاٹو گے؟ حضرت علی رض نے فرمایا۔ تو میرے ساتھ چلا آ، میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کروں گا۔

اس طرح باتیں کرتے کرتے حضرت علی رض، عباس رض بن مرداس کو اونٹوں کے گلے میں لے گئے اور ان سے کہا۔ "سو اونٹ اس گلے میں سے اپنی پسند کے چن لے" حضرت عباس رض نے سو اونٹ چن لئے اور خوش ہو گئے

—— ۳ ——

۹ سنہ ہجری میں وفد بنو تمیم کی مدینہ منورہ میں آمد عہدِ رسالت کا ایک اہم واقعہ ہے کیونکہ اس موقع پر قرآن حکیم کی کئی آیات نازل ہوئیں۔ اگرچہ اس سال عرب کے گوشے گوشے سے وفود بارگاہِ نبوت میں حاضر ہو رہے تھے، لیکن امام بخاری اور حافظ ابنِ قیم کے قول کے مطابق وفد بنو تمیم کے ورود مدینہ کی تقریب یہ ہوئی کہ محرم ۹ سنہ ہجری میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عُیینہ بن حصن الفزاری کو پچاس سوار دے کر بنو تمیم کے ایک خانوادے بنو عنبر کی سرکوبی کے لئے روانہ فرمایا کیونکہ ان لوگوں نے دوسرے قبیلوں کو بہکا کر ادائے خراج سے منع کیا تھا۔ وہ لوگ اسلامی لشکر کو دیکھ کر بھاگ گئے۔ مسلمان ان کے باسٹھ ۶۲ افراد جن میں ۱۱ مرد اکیس عورتیں اور تیس بچے تھے، پکڑ کر مدینہ منورہ لے آئے۔ بنو تمیم

نے ان قیدیوں کو چھڑانے کے لئے اپنے سرکردہ آدمیوں کا ایک وفد مرتب کیا جس میں اقرع بن حابس بھی شامل تھے یہ وفد مدینہ منورہ پہنچا تو قیدیوں میں اپنی عورتیں اور بچے دیکھ کر سخت بے قرار ہوا۔ تمام ارکانِ وفد کاشانۂ نبوی کے باہر کھڑے ہو گئے۔ اقرعؓ نے بے چینی اور عجلت کے عالم میں باآواز بلند پکارا" اے محمدؐ باہر نکل کر ہماری بات سنو" حضورؐ کو ان کا اندازِ تخاطب ناگوار تو گزرا لیکن آپؐ باہر تشریف لے آئے اور بڑی نرمی سے ان لوگوں سے گفتگو کا آغاز فرمایا۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اسی موقع پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَکَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَکْثَرُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ ○ وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰی تَخْرُجَ اِلَیْهِمْ لَکَانَ خَیْرًا لَّهُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○ (سورہ الحجرات)

بے شک جو لوگ آپ کو حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں ان میں سے اکثر سمجھ نہیں رکھتے۔ البتہ ان کے لیے بہتر ہوتا کہ وہ صبر کرتے یہاں تک کہ آپ ان کی طرف نکلتے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

مولوی سید امیر علی نے تفسیر مواہب الرحمٰن" میں خود حضرت اقرعؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اس وقت مجھ میں جہالت اور بدویت موجود تھی اور میں اپنی بے تمیزی سے حجرے کے باہر سے چلایا کہ اے محمد نکل کر ہمارے پاس آؤ۔

مفاخرت کے مقابلے کے بعد جب بنو تمیم نے اپنی ہار کا اعتراف کر لیا تو حضرت اقرعؓ نے قیدیوں کی سفارش کی حضورؐ نے ان کی سفارش مان لی اور قیدیوں کی رہائی کا حکم دے دیا۔ اس کے بعد سارے ہی وفد بنو تمیم نے اسلام قبول کر لیا۔ حافظ ابن قیم نے "زاد المعاد" میں لکھا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارکانِ وفد کو انعام واکرام سے خوب نوازا۔

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے روایت ہے کہ وفد بنو تمیم بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا تو حضرت ابوبکرؓ نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کی کہ قعقاع بن معبد کو ان کا امیر بنا دیجئے حضرت عمرؓ بولے اقرع بن حابس کو امیر مقرر فرمایئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے (حضرت عمرؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا تم نے تو بس میری مخالفت ہی پر کمر باندھ رکھی ہے۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ میں آپ کی مخالفت نہیں کرتا (بلکہ میری رائے یہی ہے) دونوں کی آوازیں اس بحث وتکرار میں بلند ہو گئیں۔ اس پر یہ آیت اتری۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ○ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ کَجَهْرِ بَعْضِکُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ○ (الحجرات)

اے ایمان والو، اللہ اور اس کے رسول کے سامنے پیش قدمی مت کیا کرو اور ڈرو اللہ سے تحقیق اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے اے ایمان والو اپنی آوازوں کو نبی کی آواز سے بلند نہ کرو، اور جب وہ بات کر رہے ہوں تو بھی بیچ میں اپنی آواز بلند نہ کرو جیسا کہ تم میں سے بعض کرتے ہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے عمل اکارت جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔

فتح الباری میں حضرت ابوبکر صدیقؓ سے روایت ہے کہ ان آیات کے نزول کے بعد میں نے رسول اللہؐ کی خدمت میں

عرض کیا یا رسول اللہ میں نے قسم کھائی ہے کہ اب میں آپ سے اس طرح آہستہ بات کروں گا، جیسے کوئی اپنا راز کہتا ہے۔

دوسری طرف حضرت نافع رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی یہ کیفیت تھی کہ وہ بارگاہِ رسالت میں بے حد آہستہ گفتگو کرنے لگے اس قدر آہستہ کہ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے دوبارہ دریافت نہ فرماتے کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کہتے ہیں

— ۴ —

حضرت اقرع رضی اللہ عنہ نے اپنی دانائی، معاملہ فہمی، اصابت رائے، خاندانی وجاہت اور حق کی حمایت میں ہر وقت کمربستہ رہنے کی بدولت بارگاہِ نبوت میں درجۂ خصوصیت حاصل کر لیا تھا۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ان پر بڑی شفقت فرماتے تھے اور ان کو مولفۃ القلوب میں شمار کر کے مالِ غنیمت اور صدقات سے باقاعدہ حصہ دیا کرتے تھے۔ یہ اس ارشادِ الٰہی کے مطابق تھا۔

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ

(یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لئے ہیں اور ان لوگوں کے لئے جو صدقات کے کام پر مامور ہوں اور ان کے لئے جن کی تالیفِ قلب منظور ہو) حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ نے "الاصابہ" میں لکھا ہے کہ قبول اسلام کے بعد بھی حضرت اقرع رضی اللہ عنہ کی عزت و شرافت مسلم رہی اور وہ ایمان و اسلام میں بھی پختہ تھے۔

حجۃ الوداع سے پہلے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قیادت میں ایک مہم یمن بھیجی وہاں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کچھ سونا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں روانہ کیا آپ نے یہ سونا چار آدمیوں میں تقسیم کر دیا جن میں ایک حضرت اقرع رضی اللہ عنہ بن حابس تھے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی "صحیح" میں یہ واقعہ اس طرح بیان کیا ہے۔

> علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب نے یمن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ سونا (سونے کا بیترہ) دباغت شدہ چمڑے میں رکھ کر بھیجا۔ اس کی مٹی بھی ابھی جدا نہیں ہوئی تھی۔ آپ نے اس کو چار شخصوں عیینہ بن بدر، اقرع رضی اللہ عنہ بن حابس، زید الخلیل رضی اللہ عنہ اور چوتھے علقمہ یا عامر بن طفیل میں تقسیم کر دیا۔ آپ کے صحابہ میں سے ایک شخص نے کہا کہ ہم ان لوگوں کی بہ نسبت زیادہ حقدار تھے۔ آپ کو معلوم ہوا تو فرمایا کیا تم لوگ مجھ کو امین نہیں سمجھتے حالانکہ میں آسمان والے کا امین ہوں میرے پاس صبح و شام آسمان کی خبر آتی ہے۔ الخ (بخاری کتاب المغازی)

علامہ بلاذری رحمۃ اللہ علیہ نے انساب الاشراف میں لکھا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اقرع رضی اللہ عنہ بن حابس کو بنو دارم بن مالک بن حنظلہ کے صدقات کی فراہمی کے لئے عامل مقرر فرمایا تھا۔

علامہ بلاذری رحمۃ اللہ علیہ ہی نے فتوح البلدان میں بیان کیا ہے کہ جب نجران کے عیسائیوں کا وفد مدینہ منورہ آیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عہد نامہ لکھوا کر انہیں امان دیدی اس عہد نامہ پر جن گواہوں نے دستخط ثبت کیئے ان میں حضرت اقرع رضی اللہ عنہ بن حابس بھی شامل تھے۔

ان روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت اقرع رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مکمل اعتماد حاصل تھا۔

حضرت اقرع رضی اللہ عنہ اکثر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر فیضانِ نبوی سے بہرہ یاب ہوا کرتے تھے۔ طبرانی نے حضرت سائب رضی اللہ عنہ

بن یزید سے روایت کی ہے کہ ایک دفعہ حضرت اقرعؓ دربار نبوت میں حاضر تھے کہ حضرت حسنؓ کھیلتے کھیلتے وہاں آگئے حضورؐ نے فرط محبت سے ان کا منہ سر چوما۔ حضرت اقرعؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ میرے دس لڑکے ہیں میں نے کبھی کسی کا منہ سر نہیں چوما حضورؐ نے فرمایا اللہ اس پر رحم نہیں کرتا جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا۔

یہ روایت کچھ لفظی اختلافات کے ساتھ صحیح بخاری میں بھی موجود ہے، ایک دوسری روایت میں حضورؐ سے یہ الفاظ منسوب ہیں "اللہ اگر تمہارے دل سے محبت سلب کرلے تو میں کیا کروں" اس طرح حضورؐ نے حضرت اقرعؓ کو یہ سبق دیا کہ اولاد سے پیار کرنا اور ان کا منہ سر چومنا بھی اولاد کے حقوق میں داخل ہے۔

حافظ ابن قیمؒ نے زاد المعاد میں ایک واقعہ بیان کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اقرعؓ بڑے اثر و رسوخ کے مالک تھے۔ واقعہ یہ تھا کہ ایک مہم میں عامر بن اضبط الاشجعی کسی غلطی کی بنا پر حضرت محلمؓ بن جثامۃ اللیثی کے ہاتھ سے مارا گیا۔ بنو اشجع نے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر قصاص کا مطالبہ کیا۔ آپؐ نے دیت دینی چاہی۔ لیکن وہ لوگ راضی نہ ہوئے۔ آخر حضرت اقرعؓ کے سمجھانے بجھانے پر انہوں نے دیت قبول کرلی۔

۱۱ھ میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ سریر آرائے خلافت ہوئے تو دفعتہً سارے عرب میں فتنۂ ارتداد (ردہ) کے شعلے بھڑک اٹھے۔ یہ سخت امتحان کا وقت تھا کیونکہ انصار مدینہ، قریش مکہ اور بنو ثقیف کے سوا شاید ہی کوئی قبیلہ اس فتنہ میں مبتلا نہ ہوا ہو حضرت اقرعؓ بن حابس اس پر آشوب دور میں نہایت استقامت کے ساتھ اسلام کے جادۂ مستقیم پر قائم رہے اور حضرت خالدؓ بن ولید کے ساتھ ہو کر یمامہ کی خونریز لڑائی میں مرتدین کے خلاف نہایت بہادری سے لڑے اس سلسلے کے کچھ اور معرکوں میں بھی انہوں نے داد شجاعت دی فتنۂ ارتداد کے انسداد کے بعد ایران اور شام سے لڑائیوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس وقت حضرت اقرعؓ کافی عمر کو پہنچ چکے تھے لیکن بڑے چاق چوبند اور صحتمند تھے۔ شوق جہاد نے انہیں گھر میں نہ بیٹھنے دیا اور انہوں نے زندگی کے آخری دور کا بیشتر حصہ میدان جہاد میں گزارا۔ حافظ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ حضرت اقرعؓ نے حضرت شرجیلؓ بن حسنہ کے ساتھ ہو کر دومۃ الجندل کے معرکے میں حصہ لیا۔ (الاصابہ)

حافظ ذہبیؒ کا بیان ہے کہ حضرت اقرعؓ نے حضرت خالدؓ بن ولید کے زیر قیادت ایرانیوں کے خلاف کئی لڑائیوں میں اپنی تلوار کے جوہر دکھائے۔ مسلمانوں نے انبار پر لشکر کشی کی تو حضرت اقرعؓ ہراول فوج کے افسر تھے۔ (تجرید اسماء الصحابہ)

امام بخاریؒ نے "تاریخ صغیر" میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت اقرعؓ بن حابس عیینہ بن حصن کے ہمراہ حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے جاگیر کی درخواست کی حضرت عمرؓ بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے حضرت اقرعؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری تالیف قلب کیا کرتے تھے لیکن اب تمہیں محنت کرنی چاہیئے۔

مشہور مصری مصنف محمد حسین ہیکل نے اپنی کتاب عمر فاروق اعظمؓ میں یہ واقعہ مختلف انداز سے بیان کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے زمام خلافت سنبھالی تو انہوں عہد رسالت کے تمام عطیوں کو برقرار رکھا چند دن بعد عیینہ بن حصن اور اقرعؓ بن حابس بارگاہ خلافت میں حاضر ہوئے اور زمین طلب کی حضرت ابوبکر صدیقؓ نے زمین کے لئے انہیں

تحریری حکم دے دیا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد یہ دونوں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا حکم نافذ کیا جائے لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی درخواست یہ کہہ کر رد کر دی کہ اللہ نے اسلام کو سربلند اور تم سے بے نیاز کر دیا ہے اب تم (جاگیروں اور عطیوں کے بغیر) اسلام پر مضبوطی سے قائم ہو جاؤ ورنہ ہمارے اور تمہارے درمیان تلوار ہو گی۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے "مولفۃ القلوب" کہلانے والے تمام لوگوں کو عام مسلمانوں کے زمرے میں شامل کر دیا۔

امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے کا حضرت اقرع رضی اللہ عنہ نے کوئی اثر نہ لیا اور خلوص دل کے ساتھ میدانِ جہاد میں دادِ شجاعت دیتے رہے اور جہاد کرتے کرتے ہی انہوں نے جام شہادت پیا۔

حضرت اقرع رضی اللہ عنہ کے سال شہادت اور جائے شہادت کے بارے میں اہل سیر میں اختلاف ہے بقول رمنی الشاطبی انہوں نے جنگ یرموک (۱۵ھ) میں اپنے دس بیٹوں کے ہمراہ شہادت پائی لیکن حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ بلاذری نے لکھا ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں حضرت عبداللہ بن عامر نے حضرت اقرع رضی اللہ عنہ کو سالار لشکر بنا کر خراسان کے محاذ پر بھیجا تھا جہاں انہوں نے کئی معرکے سر کیے جوزجان کا اہم شہر بھی ان کے ہاتھ پر فتح ہوا لیکن لڑائی میں ان کو ایسے کاری زخم لگے کہ جانبر نہ ہو سکے اور خلعتِ شہادت پہن کر خلد بریں کو سدھارے۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اسی روایت کو ترجیح دی ہے اور ہمارے نزدیک بھی یہی صحیح ہے۔۔۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔
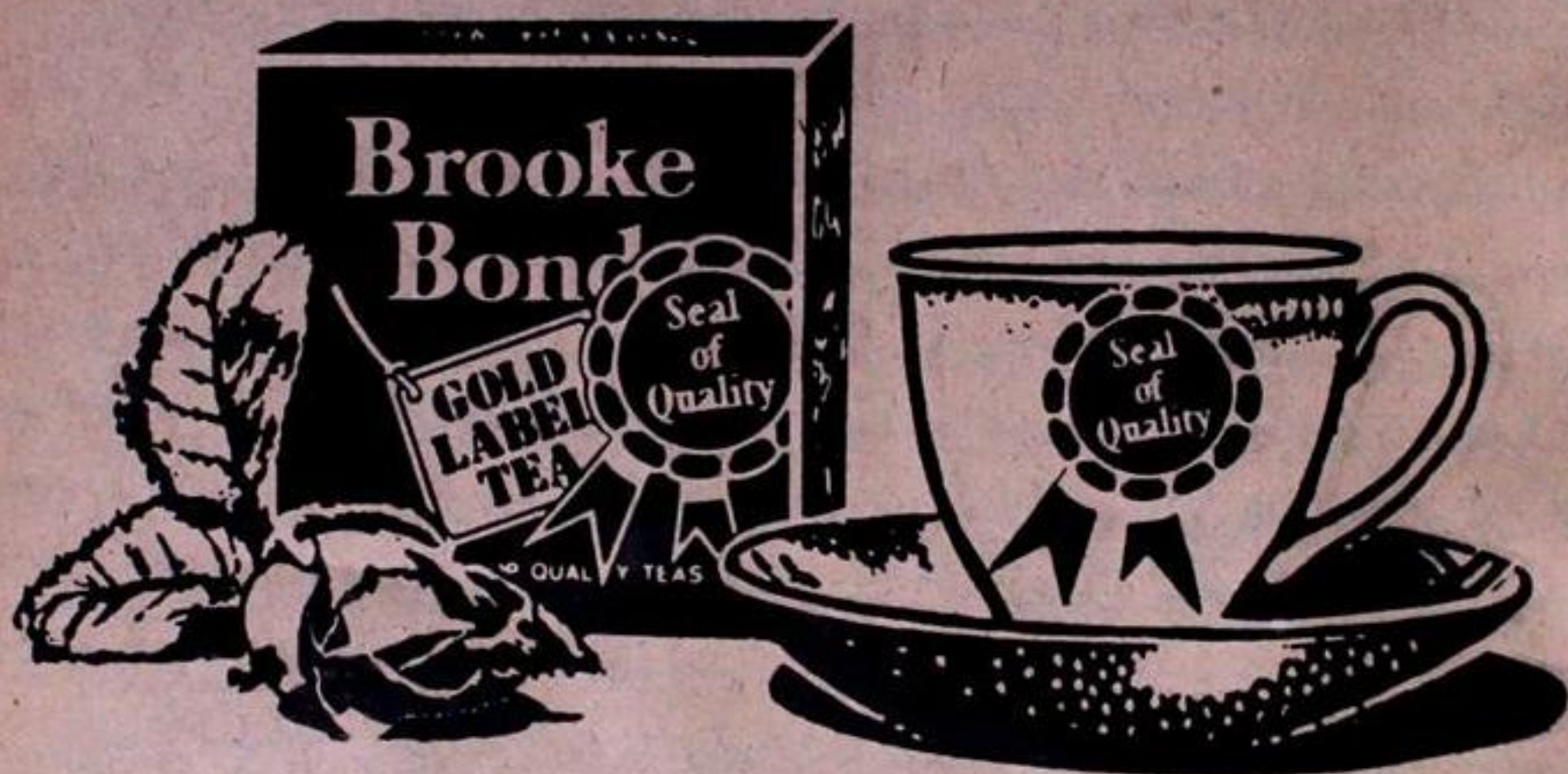
مولانا عبدالقدوس ہاشمی

اِسلام کی پہلی تربیت گاہ

مدینہ منورہ میں مسجد نبویؐ کے باہر بجانب شمال ایک چبوترہ ہے اس چبوترے پر ساری مسجد نبویؐ کی طرح کھجور کی پتیاں ڈال کر ایک چھپر بنا دیا گیا تھا اس صُفۃ المسجد کہا جاتا تھا جو بعد کو مختصر ہو کر الصفہ" کہلانے لگا۔ مختلف اوقات میں وہ صحابہ جو بے خانماں تھے وہ اس چبوترے پر رہا کرتے تھے۔ اور دن کے وقت وہاں بیٹھ کر دوسرے صحابہ کرام بھی قرآن مجید یاد کرتے تھے مختلف اوقات میں مختلف بزرگوں کی یہی چبوترہ رہائش گاہ رہا ہے۔ کسی کے لئے طویل مدت تک اور کسی کے لئے بہت تھوڑی مدت تک اور شاید کسی کے لئے مطلع وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ مستقل اقامت گاہ نہیں رہا۔ یہ قدسی صفات بزرگ زمانۂ قیام صفہ میں اپنا زیادہ وقت قرآن مجید اور کلام رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ علم دین حاصل کرنے میں صرف کیا کرتے تھے یا پھر ان خدمات کی انجام دہی میں اپنا وقت صرف کرتے تھے جو وقتاً فوقتاً حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ان کے سپرد کی جاتی تھیں وہ آپ کا پیغام قبائل تک پہونچاتے کبھی نومسلم جماعت کو قرآن مجید کی تعلیم دینے کے لئے بعض دوسرے مقامات پر بھی متعین کیئے جاتے تھے ان بزرگوں کو اسلامی تاریخ اور سیر میں اصحابِ صفہ ، ارباب صفہ اور اہل صفہ سے یاد کیا جاتا ہے۔

مادۂ صفہ کے اصلی معنی انسانوں، جانوروں یا کسی شے کا ترتیب کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑا ہونا ہیں اسی لئے تحریر حروف اور الفاظ کے برابر قائم ہونے کو صفہ اور سطر بھی کہتے ہیں کسی بڑی تعمیر کے برابر کوئی چبوترہ بیٹھنے کے لئے بنا دیا جائے تو صفۃ البناء یا صفۃ البیت کہتے ہیں۔ مسجد کے ساتھ ایسی نشست گا بنائی جائے تو اسے صفۃ المسجد کہا جاتا ہے۔ بعض لوگوں نے یہ فرق بھی بتایا ہے کہ بیٹھنے کی یہ جگہ کھلی ہو تو شرفۃ" اور اگر چھپر ہو تو اسے "سقیفہ یا صفہ" کہا جائے گا۔ سقیفہ بہت بڑے چوبارے کو کہتے ہیں اور صفہ چھوٹے سے مسقف کر چبوترے کو

صفہ کیسے بنا؟ مسجد نبویؐ کے ساتھ صفہ مدینہ منورہ یا عام عرب آبادیوں کے لئے کوئی نادر اور جدید بات نہ تھی گھروں کے ساتھ باغوں میں اور شکار گاہوں میں اس طرح کی بیٹھکیں بنائی جاتی تھیں اور انہیں صفہ ہی کہا جاتا تھا۔ گھوڑے زین اور اونٹ کی کاٹھی پر نرم جگہ بنانے کے لئے نرم گھاس کی ایک گدی بناتے اور اسے بھی صفۃ الرجال کہتے ہیں

سنہ ۶۲۲ء سنہ ۱ھ کے ماہ ربیع الاول میں جب حضور صلی اللہ علیہ اپنے مخلص و بے مثال دوست اور امتی حضرت سیدنا صدیق اکبرؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ساتھ لے کر مدینہ منورہ (اس وقت یثرب) کے قریب مقامِ قبا میں تشریف لائے تو آپ نے نزول قرآن مجید کے

بعد پہلی مسجد مقامِ قبا میں تعمیر فرمائی۔ مہاجر صحابہ کی بڑی تعداد پچھلے چند ماہ کے اندر تھوڑے تھوڑے آگے پیچھے ہجرت کر کے یہاں پہنچ چکی تھی اور اب یہ طے شدہ بات تھی کہ آئندہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مستقل قیام گاہ یثرب ہی ہوگا اور اسی کو اسلامی تبلیغ کے مرکز ہونے کا شرف حاصل ہونے والا ہے۔ مسلمانوں نے دار الہجرت کو مدینۃ النبی لکھنا شروع کیا جو بعد کو المدینہ کے نام سے مشہور ہوا۔ قرآن حکیم میں اس شہر کے دونوں نام یثرب اور المدینہ کا ذکر آیا ہے۔

اب مدینہ منورہ میں چند لوگ تو وہ آگئے جو ہجرت کر کے آتے اور کوئی ٹھکانہ نہ ہونے کی وجہ سے مسجدِ نبوی میں رات گزارنے کے لئے ٹھہرے اسلامی تبلیغ کا دائرہ اور وسیع ہوا تو دور افتادہ قبیلوں کے لوگ دین کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے آنے لگے وہاں مدینہ میں کوئی مہمان خانہ یا ہوسٹل تو تھا نہیں، ابتداءً جو مہاجرین آگئے اُن کے اور انصار مدینہ کے مابین مواخاۃ یعنی بھائی چارہ قائم کر دیا گیا تھا اور وہ اپنے انصاری بھائیوں کی مدد سے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن دو چار ایسے بھی تھے کہ وہ مستقل طور پر رہنے بسنے کو نہیں آئے تھے بلکہ کچھ دنوں کے لئے اس مختصر سی مدت میں دین اسلام کی تعلیم خود زبان فیض رساں وحی نبوت سے حاصل کریں اور اس کے بعد واپس جاکر اپنے قبیلوں کو دین کی تعلیم دیں۔

ایک بات یہ بھی اب پیدا ہوگئی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سرداری میں اب مدینہ کی شہری مملکت پیدا ہوگئی تھی۔ سربراہِ قوم کو اس کی ضرورت تھی کہ اس کے احکام انتظام کی تعلیم لئے۔ اور دوسری آبادیوں کو اس کے احکام پہنچانے کے لئے رضا کاروں کی ایک جماعت ہر وقت اس کے پاس موجود ہو جو بسر و چشم اس کے احکام کی تعمیل کے لئے تیار رہے، جہاں بھیجا جائے فوراً روانہ ہو جاتے اور جس کو اطلاع پہنچانے کا کام اس کو سپرد کیا جائے۔ وہ اس کام کی تکمیل میں اپنے گھریلو کاموں کی وجہ سے عاجز ثابت نہ ہو یا لکل ظاہر ہے کہ ایک دن میں سارے امور کی تکمیل ممکن نہیں ہوتی کسی حکومت و مملکت کے ضروری اجزاء کی تکمیل ہمیشہ آہستہ آہستہ اور تاریخی طور پر ہوتی ہے اس لئے ایسے رضا کاروں کے لئے سر چھپانے کی جگہ بھی فوراً کہاں بن سکتی تھی جبکہ ہمیں یہ حقیقت سامنے رکھنی چاہیے کہ مدینہ میں آکر بسنے والے مہاجرین بلکہ پہلے سے وہاں بسے ہوئے انصار بھی بڑے بڑے وسائل معاش کے مالک نہ تھے۔ اور نہ مملکت مدینہ کے پاس ٹیکسوں اور جائدادوں سے کروڑوں کی آمدنی حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ موجود تھا اس صورت میں مسجد کے پاس ایک چھوٹا سا چبوترہ جس پر کھجور کی پتیوں سے چھپر ڈال دیا گیا تھا وقتی طور پر ضرورت کی تکمیل کے لئے بنایا گیا تھا اسی چبوترے کو زمانہ کی عام بولی میں صفۃ المسجد کہتے تھے۔

دو یا تین صحابہ اکرام کے سوا کوئی بہت بڑی تعداد اصحاب صفہ کی ہمیشہ نہیں رہتی تھی۔ کبھی دو تین شخص ہی ہوتے تھے اور کبھی دس بیس یہ بھی خیال صحیح نہیں ہے کہ یہ لوگ ہر وقت تسبیح و تہلیل میں لگے رہتے تھے اور کچھ نہ کرتے تھے صفہ کوئی مٹھ یا گھو تپتا کا آشرم نہ تھا جہاں لوگ ہر وقت یا کم از کم روزانہ مقررہ وقت پر گیان دھیان، مراقبہ اور مکاشفہ میں مشغول ہوتے تھے یا یہ لوگ ایسے تھے کہ دنیاوی علائقات سے ہمیشہ کے لئے دستبردار ہو کر بدھ مت کے مونڈوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ حضرت بلالؓ، حضرت عبداللہ بن اُم عبدہؓ حضرت ابوہریرہؓ حضرت عبداللہؓ بن ام مکتومؓ وغیرہ تو مشہور صحابی صفہ میں سے ہیں۔ ان کی سوانح عمریوں سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ جہاں جہادوں میں حصہ لیتے تھے وہاں مالِ غنیمت میں سے حصہ بھی پاتے تھے انہوں نے شادیاں بھی کیں صاحبِ اولاد ہوئے ان سے نسلیں چلیں اور آج تک ان کی نسلیں موجود ہیں۔ کیا حضرت ابوہریرہؓ کی صاحبزادی حضرت سعید بن المسیبؓ کے نکاح میں نہ تھیں

کیا حضرت انسؓ بن مالک نے ۹۳ھ میں تقریباً ایک سو پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں چھوڑ کر وفات نہیں پائی۔

صحابہ و صحابیات کے معروف ضخیم تذکرے مثلاً الاستیعاب لابن عبد البرؒ المتوفی ۴۶۳ھ۔ اسد الغابہ لابن جزریؒ المتوفی ۶۳۰ھ اور الاصابہ لابن حجر عسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ کو پوری طرح چھان ڈالیے ایسے پانچ اصحاب کا تذکرہ بھی نہیں ملے گا جنہوں نے چھ سات سال صاحب صفہ کی حیثیت سے زندگی بسر کی ہو اور تین صحابہ حضرت ابوہریرہؓ، حضرت انسؓ اور حضرت بلالؓ کے علاوہ کسی چوتھے صحابی کا ذکر نہیں ملے گا جنہوں نے مقیم صفہ ہونے کی چھوٹی یا بڑی مدت میں خود اپنے لئے معاش، محنت مزدوری، زراعت یا ملازمت سے حاصل نہ کی ہو اور ایک بھی ایسے صاحبِ الصفہ کا ذکر نہیں ملے گا جنہوں نے بھوگیوں، ملنگوں، راہبوں اور جوگیوں کی طرح تارک الدنیا بن کر گیان دھیان میں زندگی بسر کی ہو وقتی طور پر صفہ دو ہفتہ کے لئے فقر و فاقہ کے ساتھ خیرات و مبرات پر بسر کرنے والے بھی دو چار ہی ہیں گے جن میں مذکورہ بالا تینوں بزرگ داخل ہیں۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ بعض اصحاب صفہ سرکاری نوکری پر بھی تھے کوئی صدقہ کے اونٹوں کی نگرانی پر کوئی زکواۃ کی وصولی پر اور کوئی تعلیم قرآن مجید پر مامور تھا خوش حال صحابہ ان کی کبھی کبھی امداد بھی فرماتے تھے لیکن امداد ہی پر ان کا گزارا نہ تھا بلکہ وہ اپنی محنت اور وقت کے عوض تنخواہیں اور اجرتیں پاتے تھے بعض وہ لوگ بھی جو دوسرے صحابہ کے زراعتی و تجارتی کاموں میں شریک ہو کر مزدوریاں کرتے تھے اور فارغ وقت میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔

متعدد بزرگ وہ بھی تھے جنہوں نے دو چار مہینے صفہ پر رہنے کے بعد اتنی مزدوری کمالی کہ نکاح کرکے اپنا گھر بسا لیا۔ پھر بھی محنت مزدوری سے جو وقت بچ جاتا اسے صفہ پر پابندی کے ساتھ بیٹھ کر علمِ دین حاصل کرنے میں صرف کرتے رہے۔

غرض یہ کہ صفہ ایک جگہ تھی جس پر مختلف اوقات میں اور مختلف مدتوں کے لیئے حسب ذیل مقاصد سے مدینہ منورہ آنے والے لوگ مقیم ہوتے رہے۔

(الف) وہ لوگ جو صرف اللہ کے لیئے ملی خدمات انجام دینا چاہتے تھے یعنی دعوت اسلامی کے مخلص رضا کار تھے لیکن یہ لوگ مستقلاً صفہ پر نہیں رہتے تھے اور نہ بڑی مدت وہاں مقیم رہتے بلکہ اکثر وہ تعمیلِ ارشادِ نبویؐ کے لیئے دوسرے مقامات پر سفر میں ہوتے تھے۔

(ب) وہ لوگ جو تعلیم حاصل کرنے کے لیئے تھوڑے دنوں کے لیئے مدینہ منورہ آتے تھے لیکن چونکہ وہاں ان کے لئے ہوسٹل یا مہمان خانہ نہیں تھا اس لئے وہ اپنے قیام کی مدت صفہ پر گزارتے تھے۔ ان لوگوں کے متعلق قرآن مجید میں خصوصی حکم دیا

> "اور اگر کوئی مشرکین میں سے تمہاری پناہ میں آجائے تو اسے پناہ دے دو۔ تاکہ اللہ کا کلام سنے، پھر اسے اس کی امن کی جگہ پہنچا دو۔ یہ اس لئے ہے کہ یہ لوگ بے علم ہیں"۔ (توبہ)
>
> ایمان والوں کے لیئے یہ مناسب نہیں کہ سب لوگ نکل جائیں، کیوں نہ ہر گروہ سے کچھ لوگ (ٹھہر جائیں۔) تاکہ دین میں سمجھ بوجھ حاصل کریں۔ اور جب واپس اپنی قوم میں جائیں تو ان کو اللہ کا خوف دلائیں شاید وہ لوگ کفر سے پرہیز کرنے لگیں۔ (سورۃ التوبہ آیت ۱۲۲)

(ج) وہ لوگ جو بہت غریب تھے اور مواخاۃ کے بعد آئے تھے ان کا نہ کوئی رشتہ دار مدینہ منورہ میں تھا اور نہ دوست یہ لوگ کوئی ٹھکانہ مل جانے اور آبادگاری کی کوئی صورت پیدا ہونے تک صفہ پر رہا کرتے تھے۔

(د) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے والے غیر مسلم مہمان۔

(ہ) وہ لوگ جو وقتاً فوقتاً وفود کی صورت میں یا تنہا مدینہ منورہ آیا کرتے تھے تاکہ ہدایات نبوی سے بہرہ یاب ہوں۔

صفہ کب بنا؟ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ مسجد نبوی مدینہ منورہ سے ملحق ایک مسقف چبوترہ تھا اس کا محل وقوع یہ ہے مسجد نبوی کے صحن سے باہر سے مخالف سمت یعنی شمال میں مسجد کے دروازے سے باہر ایک چبوترہ تھا کہیں ...کی پیمائش کا ذکر تو روایات میں نظر سے نہیں گزرا لیکن اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تقریباً بیس فٹ طویل اور تقریباً ۱۵ فٹ عریض چبوترہ تھا ...چبوترہ کب بنایا گیا تھا اس کا ذکر کہیں نہیں ملتا لیکن چونکہ ... ۲ھ میں غزوۂ بدر سے پہلے اور ۱۱ھ وفات رسولؐ کے بعد صفہ اور ...صفہ کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اس لئے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ صفہ تقریباً سات یا آٹھ سال تک قائم رہا۔ اس اثنا میں مندرجہ بالا ...دوں قسم کے لوگ مختلف اوقات میں مختلف مدتوں کے لئے مقیم رہے۔

اگر صفہ کوئی مستقل خانقاہ یا زاویہ ہوتا تو عہد صدیقی و عہد فاروقی میں بھی قائم رہتا۔ ختم نہ ہو جاتا ہمیں تاریخی روایتوں میں ...وفات رسول کے بعد صفہ و اہل صفہ کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اور نہ عہد فاروقی میں جو وظائف مجاہدین اور امہات المومنین کے لئے مقرر کئے ...ے اس سلسلے میں اہل صفہ کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔

صفہ کب بنا تھا؟ اس کے لئے صفہ کا محل وقوع خود ایک دلیل ہے صفہ مسجد نبوی کے باہر کی جانب شمال میں تھا اور ...یقیناً وہ تحویل قبلہ یعنی ۱۵ رشعبان ۲ھ کے بعد ہی بنا ہو گا کیونکہ اس وقت تک مسجد نبویؐ کا قبلہ جانب شمال میں تھا۔ جب کعبہ ...طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا تو جنوبی رخ پہ قبلہ کی دیوار بنائی گئی اور شمالی رخ خالی ہو گیا پھر حدود مسجد سے باہر شمالی ...رخ پر چبوترہ بنا ہو گا۔ بہرحال اس کے بعد بھی کوئی ذکر اس کا غزوۂ بدر کبریٰ سے پہلے نہیں ملتا ہے۔ غزوۂ بدر کبریٰ سے پہلے ۲ھ ...میں ہوا تھا۔

اصحاب الصفہ ۔ مختلف اوقات میں کتنے لوگ صفہ میں قیام پذیر ہوئے ان کی مکمل یا غیر مکمل کوئی فہرست مہیا کرنا ممکن ...نہیں ہے۔ سات یا آٹھ سال کی مدت میں جب کہ صفۃ المسجد واردان مدینہ کے لئے وقتی قیام گاہ رہا سینکڑوں ہی اشخاص کو اس چبوترے ...پر قیام پذیر ہونے کا موقع ملا۔ کہاں اس کا کوئی رجسٹر یا اس سلسلے میں کوئی یادداشت تیار کی جاتی جو فہرست مہیا کی جائے۔ سینکڑوں سال کے ...بعد سیرت نگار حضرات نے ان کی تعداد بھی مختلف بتائی ہے کوئی کہتا ہے ان کی تعداد چار سو تک پہنچی ہے کوئی کہتا ہے ستر اسی تک ...لیکن یہ سب قیاس کی باتیں ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ و صحابیاتؓ کے تذکرے میں سب سے بڑی کتاب جو اس ...وقت ہمارے ہاتھوں میں ہے وہ امام ابن حجر عسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ کی کتاب الاصابہ ہے اس میں یقینی و غیر یقینی صحابہؓ و صحابیات ...کے جملہ اسماء بارہ ہزار سے کم ہیں۔ اور ان میں سے بھی بہتوں کا حال معلوم نہیں ہے۔ حالانکہ یہ سب کو معلوم ہے کہ حجۃ الوداع میں ...آپ کے ساتھ حج کرنے والوں کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار یا اس کے قریب قریب تھی اس طرح شرکاء حجۃ الوداع میں سے شاید ...دس فی صد کے نام بھی ہم تک نہیں پہنچے ہیں تو یہ کہاں ممکن ہے کہ سارے اصحاب صفہ کی فہرست مہیا ہو سکے۔

الحاکم نے المستدرک جلد نمبر ۳ صفحہ نمبر ۱۸ میں حسب ذیل اسماء گرامی بحیثیت اصحاب صفہ میں لکھے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ وہ چند ...اسماء گرامی ہیں جو امام الحاکم کو مل سکے ہیں۔ یہ کوئی فہرست نہیں ہے۔ بہرحال وہ اسماء گرامی یہ ہیں۔

حضرت ابوعبیدہ عامر بن الجراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت بلال بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت مقداد بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ
حضرت صہیب بن سنان رضی اللہ، حضرت کنانہ بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت صفوان بن بیضاو رضی اللہ تعالیٰ عنہ
حضرت ابوسالم (مولا ابوحذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ) حضرت مسعود بن ربیع رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت عمیر بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ،
حضرت ابوالبابہ رضی اللہ تعالیٰ حضرت خبیب بن سیاف رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت ابوذر جندب غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ
حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت ابوہریرہ عبدالرحمن بن صخر الدوسی رض
حضرت عبداللہ بن زید جہنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت معاذ بن الحارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت ثاقب بن ودلیعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ،
حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت خباب بن ارت رضی اللہ تعالیٰ عنہ،
حضرت زید بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت ابوکبشہؓ (مولیٰ رسولؐ) رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت ابوعبس بن جبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ،
حضرت مسطح بن اثاثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حضرت عکاشہ بن محصن رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت عویم بن ساعدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ،
حضرت کعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت عبداللہ بن انیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عتبہ بن مسعود ہذلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ
حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت حجاج بن عمر الاسلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حضرت ابوالدرداء عویمر بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ
حضرت ثوبان (مولیٰ رسولؐ) حضرت سائب بن الخلاء رضی اللہ تعالیٰ عنہ (کل تعداد فہرست ہذا ۳۵)

اس سے بڑی کوئی فہرست میری نظر سے نہیں گذری۔ ابونعیم نے حلیۃ الاولیاء جلد نمبر ا ص نمبر ۳۳۹ اور السمہودی نے الوفا ج ا ص ۳۲۹ میں اصحاب الصفہ کے کچھ احوال لکھے ہیں لیکن نہ ابونعیم قابل وثوق راوی ہے اور نہ المسہودی پر اعتماد ہے۔ ان لوگوں نے بھی اس سے بڑی کوئی فہرست پیش نہیں کی ہے

بہر حال اس فہرست پر نظر ڈالنے سے یہ دو باتیں تو واضح ہو جاتی ہیں کہ.

(۱) مقامی بزرگوں میں سے کوئی مدنی صحابی ان میں نہیں ہے۔

(۲) ان بزرگوں میں اکثر وہ ہیں جن کی اولاد تھی یہ لوگ کسی طرح تارک دنیا خانقاہی فقرا نہ تھے، یہ مزدوریاں بھی کرتے تھے اور جہاد میں بھی شریک ہوتے تھے۔ اور مال غنیمت بھی حاصل کرتے تھے۔ مثلاً

حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حضرت زید بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے احوال تو تذکروں میں کسی نہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ یہ لوگ صاحب اولاد صاحب جائیداد اور صاحب مال تھے انہیں تارک الدنیا خانقاہی کیسے کہا جاسکتا ہے۔

اللہ ہی جانتا ہے کہ لوگوں نے یہ کیوں اور کس بنیاد پر مشہور کر دیا ہے کہ اصحاب الصفہ بھونگوں اور جوگیوں کی طرح تارک الدنیا لوگ تھے یا یہ لوگ ہمیشہ خیرات و مبرات پر زندگی بسر کرتے رہے بلکہ اس فہرست میں تو ایسے لوگ بھی ہیں جو خود صاحب نصاب تھے اور پابندی کے ساتھ زکوٰۃ ادا کرتے تھے۔ اور ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے بڑی بڑی سرکاری ملازمتیں حاصل کیں۔ گورنر رہے۔ افسر مال رہے۔ فوجوں کے کمانڈر رہے۔ نعوذ باللہ یہ لوگ خیرات خور قلندر تو نظر نہیں آتے۔

دسمبر ۱۹۸۱ء

ایسی زندگی تو اسلام نے نہیں سکھائی اور نہ ایسے لوگ صحابہ کرامؓ میں ہوتے تھے قرآن مجید نے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھ جو لوگ تھے، ان کی کیفیت یہ بتائی ہے۔

"محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں کافروں پر سخت ہیں آپس میں رحم دل ہیں۔ تم انہیں دیکھو گے وہ رکوع اور سجدہ بھی کرتے ہیں۔ اور اللہ کی دی ہوئی روزی اور مال و دولت بھی تلاش کرتے ہیں اور اللہ کی رضا بھی چاہتے ہیں ان کے چہروں پر سجدوں کے نشان بھی ہیں۔"

یہ کہاں ممکن تھا کہ لوگ مجہول بے حرکت، خیرات خور اور رہبان ہوتے اور پھر بھی اللہ تعالیٰ ان کی یہ صفات بیان فرماتا وہ لوگ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بلا ارادہ اور دوامی طور پر ترک کرتے اور پھر بھی اللہ تعالیٰ ان کی تعریف فرماتا۔ تعالی اللہ عن ذالک علوا کبیرا
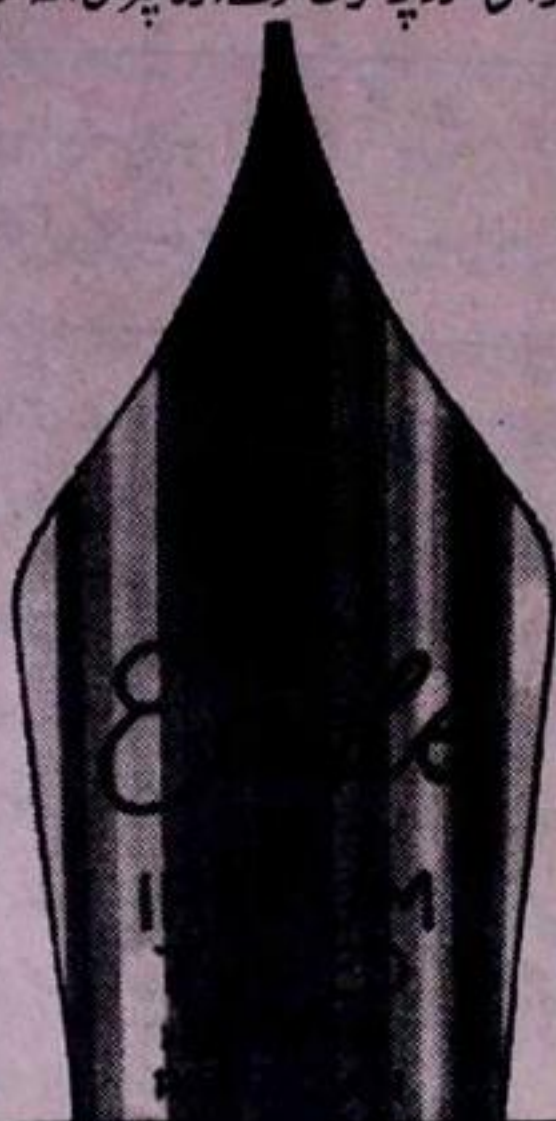
(الشباب لاہور۔ نومبر ۱۹۸۲ء)

مرزا غالب سنہ ۱۷۹۶ء ـ سنہ ۱۸۶۹ء
اور
امیر مینائیؔ سنہ ۱۸۲۸ء ـ سنہ ۱۹۰۰ء

از جناب قاضی احمد میاں صاحب اخترؔ جوناگڑھی مرحوم
صدر شعبۂ اسلامی تاریخ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد

قاضی احمد میاں اختر مرحوم کا نام اردو فارسی کے اہل علم و ارباب نظر کے لئے اجنبی نہیں۔ جوناگڑھ سے تعلق تھا لیکن خوش ذوقی، تبحر علمی اور سلامتی طبع کے اعتبار سے برصغیر ہند و پاک کے جملہ مراکز علم و ادب کی بڑی سے بڑی معتبر اور برگزیدہ ہستی کے ساتھ ان کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ماہر القادری سے بہت مانوس تھے اور اکثر فاران کے دفتر میں جب وہ کیمبل اسٹریٹ پر تھا قدم رنجہ فرماتے تھے۔ وہیں راقم الحروف سے تعارف ہوا اور رسم و راہ کی ابتدا ہوئی۔ جب تک وہ حیات رہے بڑی شفقت اور مودت سے پیش آتے تھے اور علمی معاملات میں خاص کر تواضع سے کام لیتے تھے۔

یہ مضمون جو یہاں نقل کیا جا رہا ہے۔ کوئی اردو ماہنامہ تھا، نوائے ادب، اس میں اکتوبر سنہ ۱۹۵۶ء میں ان کے نام سے شائع ہوا تھا وہ انہوں نے اپنے قلم سے نظام لکھ کر میرے چھوٹے بھائی کو بھیجا جن سے ان کی ملاقات اکثر ہوا کرتی تھی۔

غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی نے راقم الحروف کو اسال مدعو کیا ہے بین الاقوامی مذاکرے میں مقالہ پڑھنے کو اس کی تیاری میں غالب کے متعلق جو اپنا پرانا اثاثہ کھنگالا تو اس میں یہ مضمون بھی نکل آیا۔ اس تحریر میں قاضی صاحب مرحوم نے جو بحث چھیڑی ہے۔ مالک رام کی مشہور کتاب "ذکر غالب" میں بھی اس کا تذکرہ ہے۔ (ص ۱۷۷)

راقم الحروف خود اس پر مطمئن نہیں ہے کہ اودھ اخبار میں جو قطعہ بتائید غالب محمد امیر لکھنوی کے نام سے شائع ہوا تھا وہ امیر مینائی رحمۃ اللہ علیہ تھے اس بارے میں تحقیق کرنے کی ضرورت ہے اس لئے یہ مضمون شامل اشاعت کیا جا رہا ہے۔

ـــــــــ اسمٰعیل احمد مینائی

مرزا اسد اللہ خان غالب دہلوی اور منشی امیر احمد مینائی لکھنوی اردو کے نامور شاعر گزرے ہیں اور دونوں کا شمار اردو کے اساتذہ میں ہوتا ہے۔ غالب نہ صرف فارسی اور اردو کے ایک مسلم الثبوت اور بلند رتبہ شاعر تھے بلکہ زبان دانی اور لغت کی

تحقیق میں بھی منفرد اور یگانۂ روزگار تھے۔ لغوی اور لسانی تحقیق میں ان کے کارنامے تعریف و توصیف سے مستغنی ہیں۔ امیر مینائی فن شعر اور لغت کے علاوہ عربی، فارسی کے عالم اور رسمی علوم و فنون میں مہارت رکھتے تھے۔ اردو شاعری میں وہ استادِ فن مانے گئے ہیں، اس کے علاوہ فارسی میں بھی انہوں نے طبع آزمائی کی ہے اور لغوی و لسانی مباحث میں ان کو جو دسترس تھی وہ ان کی تصانیف سے ظاہر ہے۔ خصوصاً امیر اللغات ان کی لغوی تحقیقات کا بہترین نمونہ ہے اگرچہ وہ اس کی تکمیل نہ کر سکے۔ ان دونوں بزرگوں میں جو دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے، اُن سے بہت کم لوگ واقف ہیں مرزا صاحب کے بعض خطوط سے ان تعلقات کا پتہ چلتا ہے نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غالب امیر کی وجاہت اور فن شعر گوئی میں ان کی قابلیت کے معترف تھے اس طرح امیر غالب کو سخن دانی، فارسی شعر و ادب اور لغت میں استاد مانتے تھے۔

غالباً ان دونوں کے تعلقات کا آغاز ۱۸۵۹ء سے ہوتا ہے جبکہ ان کا تعلق دربار رامپور سے تھا اور قیام رامپور کے زمانے میں ان دونوں کی ملاقات ہوتی رہتی تھی کسی تذکرہ نویس نے اس کا ذکر نہیں کیا اور نہ خود امیر نے اپنے تذکرہ "انتخاب یادگار" میں اس پر کوئی روشنی ڈالی ہے۔ امیر ۱۸۵۷ء کے بعد رامپور گئے اس سے پہلے ۱۸۵۵ء میں نواب یوسف علی خان ناظم مرزا غالب کے شاگرد ہو چکے تھے اور خط کتابت کے ذریعہ مرزا غالب ان کے کلام پر اصلاح دیتے تھے۔ خود مرزا صاحب ۱۸۶۰ء میں پہلی بار رامپور تشریف لے گئے۔ اس سے پہلے امیر سے اُن کی ملاقات نہ ہوئی ہوگی۔ لیکن دونوں ایک دوسرے سے آشنا ہو چکے تھے مرزا کے تمام مکاتیب میں کوئی مکتوب امیر کے نام نہیں پایا جاتا البتہ مرزا نے اپنے ایک خط میں، جو انہوں نے ۱۲ جون ۱۸۵۹ء کو اپنے ایک شاگرد منشی شیو نرائن کے نام لکھا تھا، امیر کا ذکر کیا ہے۔ اور اس میں ان کو اپنا دوست بتایا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں۔

"..... اب کے تمہارے معیار الشعرا میں میں نے یہ عبارت دیکھی تھی کہ امیر شاعر اپنی غزلیں بھیجتے ہیں، ہم کو جب تک اُن کا نام و نشان معلوم نہ ہوگا ہم اُن کے اشعار نہ چھاپیں گے۔ سو میں تم کو لکھتا ہوں کہ یہ میرے دوست ہیں اور امیر احمد اُن کا نام ہے اور امیر تخلص کرتے ہیں لکھنؤ کے ذی عزت باشندوں میں ہیں اور وہاں کے بادشاہوں کے روشناس اور مصاحب رہے ہیں اور اب وہ رامپور میں نواب صاحب کے پاس ہیں اُن کی غزلیں تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ میرا نام لکھ کر ان غزلوں کو چھاپ دو یعنی غزلیں غالب نے ہمارے پاس بھیجیں اور اس کے لکھنے سے ان کا نام اور ان کا حال معلوم ہوا۔ نام اور حال جو میں اوپر میں لکھ آیا اس کو اب کے معیار الشعرا میں چھاپ کر دو ورقہ یا چہار ورقہ رامپور اُن کے پاس بھیج دو اور سرنامہ پر یہ لکھ دو کہ رامپور بردرِ دولت حضور رسیدہ بخدمت مولوی امیر احمد امیر تخلص برسد۔ مجھ کو اس کی اطلاع دو اور اس امر کی بھی اطلاع دو کہ رامپور کو تمہارا اخبار جاتا ہے یا نہیں۔" مرسلہ یکشنبہ ۱۲ جون ۱۸۵۹ء[1]

اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کے رامپور جانے سے قبل ہی امیر سے ان کی خط و کتابت نواب صاحب کے کلام کی اصلاح کے سلسلے میں رہی ہوگی اور اسی ضمن میں امیر نے رسالۂ معیار الشعراء میں اپنے کلام کی اشاعت کے بارے میں مرزا صاحب کو

---

[1] اردوئے معلی صفحہ ۷۳ طبع ۱۸۶۹ء دہلی۔

لکھا ہوگا اور غزلیں بھیجیں ہوں گی جس کی بناء پر غالب نے اپنے شاگرد کو یہ ہدایت کی ہے۔ لیکن یہ امر تعجب خیز ہے کہ ان دونوں کے مکاتیب میں جو چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔ ایک دوسرے کے نام کوئی مراسلت نہیں پائی جاتی۔ "دوست غالب" یہاں رسمی طور پر استعمال ہوا ہے کیوں کہ ایک دربار سے دونوں متوسّل تھے اور اسی بناء پر ان دونوں میں گونہ تعلق قائم ہوگیا تھا ورنہ غالب امیر سے عمر میں دوچند تھے ۱۸۵۹ء میں امیر کی عمر صرف ۳۱ برس کی تھی جب کہ غالب ۶۳ برس کی پختہ عمر کو پہنچ چکے تھے اس لئے امیر کو انھوں نے رسماً اور اخلاقاً اپنا دوست بنایا ہے اس خط میں غالب نے امیر کی ذاتی وجاہت کا ذکر کرتے ہوئے ان کے کلام کے متعلق کوئی رائے ظاہر نہیں کی اور نہ کوئی تعریفی کلمہ استعمال کیا ہے۔ لیکن یہی کیا کم ہے۔ کہ مرزا نے ان کی غزلوں کو اس قابل سمجھا کہ ان کے چھاپنے کی سفارش کی اور اپنے توسط سے اپنے نام کے ساتھ ان کی اشاعت گوارا فرمائی اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غالب نے امیر کا کلام پسند کیا اور اپنے ایک ہم عصر نوجوان شاعر کی ہمت افزائی کی۔

اس واقعہ کے کوئی تین برس بعد امیر کا ایک قطعہ غالب کی حمایت میں شائع ہوا۔ ۱۸۶۳ء میں جب غالب نے برہان قاطع کے رد میں قاطع برہان لکھی اور اس کی تردید میں غالب کے مخالفین نے بھی کئی رسالے اور نظمیں تصنیف کر کے چھپوائیں تو غالب کے شاگردوں اور طرفداروں نے ان کا نثر کی بہ نثر کی جواب دیا اور یہ بحث اس وقت کے اخباروں میں ایک مدت تک چلتی رہی چنانچہ آغا احمد علی کے بعض شاگردوں فدا اور سخن نے ایک رسالہ "ہنگامۂ دل آشوب" کے نام سے لکھا جو ۱۸۶۶ء ۱۲۸۳ھ میں آرہ سے منشی سنت پرشاد کے مطبع میں چھپ کر شائع ہوا[1]۔ اس رسالے میں انہوں نے میر آغا علی صاحب شمس لکھنوی کے ایک مضمون کا ذکر کیا ہے جو غالب کے رد میں اودھ اخبار میں چھپا تھا اس مضمون کا جواب امیر نے لکھا جو اسی اخبار میں شائع ہوا۔ اور ایک قطعہ اُردو میں غالب کی حمایت میں لکھا تھا جو اس رسالے میں موجود ہے چنانچہ امیر کا یہ قطعہ رسالۂ مذکورہ سے نقل کیا جاتا ہے[2]

قطعہ من نتائج طبع دبیر بے نظیر منشی محمد امیر صاحب تخلص بہ امیرؔ۔
رئیس لکھنؤ سلمہ اللہ تعالیٰ وارتقاہ علیٰ مدارج الاعلیٰ کہ از اودھ اخبار نقل نمودہ شد۔

بلا تعلّی مضموں لکھے ہیں چند اشعار — یہاں مبالغۂ شاعری نہیں درکار۔
عجب وقائع حیرت فزائے عالم ہے — سنیں پسند کریں مالک اودھ اخبار۔
ہوا ہے مستعدِ جنگ نظمِ بنگالی — ہوئی ہے غالب و مغلوب میں عجب پیکار۔
جواب ان کا لکھا پارسی قیامت کی — کہاں یہ سنگ رخام و کہاں درِ شہوار۔
یہ کھانے والے ہیں دن رات سکٹی مچھلی کے — عفونت ان کی زباں سے نہیں گئی زنہار

---

[1] یہ رسالہ نایاب تھا اس لئے منشی عطا حسین صاحب نے اس کو ایک مختصر دیباچے کے ساتھ رسالہ اردو (انجمن ترقی اُردو) بابت ۱۹۳۶ء میں شائع کرادیا۔ اس طرح یہ رسالہ محفوظ ہوگیا ہے۔

[2] رسالہ اُردو جنوری ۱۹۳۶ء صفحہ ۸۱-۸۰ — [3] منشی نول کشور

فراغ ان سے ہوئی اردوئے معلیٰ کی ۔ — چلم کو کہتے ہیں کو لکی خدا کی مار

سیاہ قلب کا مضمون سپر ہے سلہٹ کی — پناہ دے نہ اسے تیغ حیدر کرار

سپاہی زادہ کا اس نے جواب خوب لکھا — کہ میرا دادا تھا نادر کی فوج سالار

کسی کے جد کو بنائے جو کوئی اپنا جد — کبھی دروغ کو ہوتا نہیں فروغ یار

تھا اپنے جد کا بتائیں خطاب سرداری — میاں گنجفہ تھے کون نادری اسوار

بغیر نام و نشاں کس طرح یقین آوے — خلاف محض یہ جد جدید کا اظہار

یہ ان کے اب جد فاسد کی بگڑی ہے ابجد — بتائیں وہ کوئی نام اس مقام پہ زردار

اسی طرح سے کلام ان کا سب ہے مصنوعی — دروغ نظم سے کیوں کر نہ ہو جہاں بیزار

رقم کیا ہے جو ہر جا کی جا پہ اب جا جا — یہ جا جا کون مرض کی دوا ہے اے بیمار

صحیح فارسی میں ہم نے مانا ہے جا جا — فصاحت اس کی تکلم میں ہے بہت دشوار

زباں بریدہ بکنجے نشستہ ام صم و بکم — خموش رہنا ہے اُن کے لیے بہ از گفتار

خدا گواہ کہ اب عافیت اسی میں ہے — انہیں یہ چاہیئے اس بات کے ہوں شکر گذار

سنو بیان اسد اللہ خان غالب کا ۔ — زمانہ ان کے حسب اور نسب سے واقف کار

خطاب یافتہ ہیں وہ رئیس دہلی کے — زمین سے تا بفلک حسن خانداں اظہار

وہ اپنے عصر کے خاقانی و نظیری ہیں — نظیر ان کا جہاں میں کہیں نہیں زنہار

سخن کی داد ملے زندہ ہو جو فردوسی — کلام ان کا وہ نام خدا ہے باغ و بہار

وہ نظم حضرت غالب جہاں میں غالب ہے — انہیں کے قول پر آفاق کا ہے دار و مدار

اساتذہ میں یہاں ناسخ جہاں منسوخ — انہیں سے طالب اصلاح شاعرانِ دیار

زمانہ ہم کو بھی کہتا ہے منصف الدولہ — فہیم شہر ہیں البتہ شاعری دشوار

لکھا ہے ہم نے بھی اک مختصر جہاں آشوب — کیئے ہیں اس میں قلمبند ہفت صد اشعار

جو سرگزشت کہیں کی نئی سنی لکھی — لکھا امیر نے یہ واقعہ بھی آخر کار

اس قطعہ کے عنوان میں امیر احمد کی بجائے "محمد امیر" لکھا ہے۔ جو غالباً دبیر یے نظیر کے قافیہ کی رعایت سے درج ہوا ہے۔ کیونکہ امیر تخلص کا کوئی دوسرا شاعر لکھنؤ میں مشہور نہیں ہوا۔ آخری شعر سے ایک خاص بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ امیر نے "جہاں آشوب" کے نام سے ایک نظم بھی لکھی تھی جو سات سو اشعار پر مشتمل تھی لیکن امیر کی مطبوعہ تصانیف میں کہیں اس کا نام نہیں ملتا نہ ان کے کسی سوانح نگار نے اس کا ذکر کیا ہے ممکن ہے کہ اس نظم کی اشاعت ہی نہ ہوئی ہو اور وہ ان کے مسودات میں رہ گئی ہو۔

(مطبوعہ نوائے ادب اکتوبر ۱۹۵۲ء)

شاوا بھئی شاوا
NEW BURQ
For Cleanest Whitest Wash
برق ہی ہمارا

عبدالرشید عراقی (سوہدرہ)

حافظ ابن عبد البر قرطبی

۳۶۸ھ تا ۴۶۳ھ

نام و نسب۔ یوسف نام، ابوعمرو کنیت اور ابن عبد البر عرفیت ہے شجرۂ نسب یہ ہے۔ یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبد البر بن عاصم [۱]

ولادت۔ جمعہ کے روز ماہ ربیع الاول کی ۲۵ تاریخ کو جس وقت امام خطبہ دے رہا تھا۔ پیدا ہوئے [۲]

خاندان و وطن۔ آپ کا مولد و مسکن قرطبہ ہے جو اندلس کا مشہور اور ممتاز شہر ہے۔ آپ کے والد بزرگوار امام عبداللہ بن محمد (۳۸۰ھ) قرطبہ کے ممتاز علماء اور اکابر فقہاء میں سے تھے اور شعر و ادب سے خاص شغف رکھتے تھے [۳] ابن عبد البر کی نشو نما اسی صاحبِ کمال کی آغوش میں ہوئی۔ وطن کی نسبت سے قرطبی کہلاتے ہیں۔

اساتذہ۔ حافظ ابن عبد البر نے جن اساتذہ سے استفادہ کیا ہے ان کی فہرست طویل ہے۔ تاہم چند باکمال اساتذہ کے نام یہ ہیں خلف بن القاسم، عبد الوارث بن سفیان، ابوسعید، ابو نصر عبداللہ بن محمد بن عبد المومن [۴]

اور روایت حدیث کے سلسلے میں جن ممتاز علمائے کرام نے آپ کو تحریری اجازت دی، ان میں حافظ عبد الغنی منذری صاحب ترغیب و ترہیب مصر سے اور ابوالقاسم عبداللہ بن السقطی مکہ معظمہ سے ہیں [۵]

تلامذہ۔ اساتذہ کی طرح آپ کے تلامذہ کی فہرست بھی طویل ہے۔ چند مشہور تلامذہ یہ ہیں۔ ابو عبداللہ حمید، ابوداؤد سلیمان بن ابوالقاسم مصری، محمد بن فتوح انصاری [۶]

حفظ و ضبط اور ثقاہت۔ حافظ ابن عبد البر نے ساری زندگی اندلس میں گذاری اور اندلس کے، اساتذہ سے جو اس زمانے میں یکتا تھے ان سے تحصیلِ علم کی۔ آپ حفظ و ضبط ثقاہت و اتقان میں سردار مانے جاتے تھے [۷] اور علمائے کرام نے آپ کی ثقاہت پر اتفاق کیا ہے۔

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۶۔ [۲] بستان المحدثین ص ۱۲۰۔ [۳] ابن خلکان ج ۳ ص ۳۱۷۔ [۴] بستان المحدثین ص ۱۲۰

[۵] بستان المحدثین ص ۱۲۰۔ [۶] تذکرۃ المحدثین ج ۲ ص ۲۶۱۔ [۷] بستان المحدثین۔ ص ۱۲۰۔

حدیث میں درجہ و مرتبہ۔ تمام علمائے فن نے حدیث میں ان کے کمال و امتیاز کا اعتراف کیا ہے۔ گو ان کو متعدد علوم سے مناسبت تھی لیکن زیادہ اور اصلی اشتغال و انہماک اسی فن سے تھا۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (م ۱۲۳۹ھ) لکھتے ہیں۔

"حافظ ابن عبدالبر کا پایہ فن حدیث میں خطیب اور بیہقی اور ابنِ حزم جیسے اربابِ کمال اور اساطین فن سے کمتر نہیں تھا"[۱]

اور ابن خلکان کہتے ہیں۔

"کہ وہ حدیث و اثر کے حافظ اور ان کے متعلقہ علوم میں امام عصر تھے"[۲]

حدیث میں ان کی عظمت و بزرگی و بلند پائیگی کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حافظ ابن صلاح اور امام نووی رح نے ائمہ صحاح کے بعد سات اہم اور برگزیدہ محدثین کی فہرست میں ان کا نام بھی لکھا ہے اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ۔

"حافظ ابن عبدالبر رح مالکی مسلک کے سب سے بڑے صاحبِ کمال شارح حدیث تھے"[۳]

رجال اور جرح و تعدیل میں امتیاز۔ جس طرح حافظ ابن عبدالبر رح حدیث میں ماہر تھے اسی طرح اسماء الرجال اور جرح و تعدیل کے بھی امام تھے۔ علمائے کرام اور محدثین عظام نے ان کا اسماء الرجال سے شغف کا بھی ذکر کیا ہے۔ امام محمد بن عبدالباقی زرقانی (م ۱۰۹۹ھ) لکھتے ہیں کہ وہ حدیث اور رجال کے عالم تھے۔[۴] اور حافظ ذہبی رح لکھتے ہیں کہ

حافظ ابن عبدالبر رح حدیث اور جرح و تعدیل میں مہارت رکھتے تھے[۵]

تفقہ و اجتہاد۔ حافظ ابن عبدالبر رح جس طرح حدیث، اسماء الرجال اور جرح و تعدیل میں ید طولیٰ رکھتے تھے فقہ میں بھی ان کو خاص امتیاز حاصل تھا محدثین کرام اور علمائے عظام نے ان کے علم حدیث کی طرح تفقہ میں بھی ان کے تقدم اور فقہی بصیرت کا ذکر کیا ہے[۶]

دیگر علوم۔ جیسا کہ آپ اوپر پڑھ آئے ہیں کہ ابن عبدالبر حدیث، اسماء الرجال، جرح و تعدیل اور فقہ میں ممتاز تھے اسی طرح تفسیر، قرأت، تاریخ، انساب، سیر و اخبار، ادب، لغت، معانی و بیان، اصولِ فقہ میں ان کا تبحر مسلم ہے۔[۷]

شعر و سخن۔ شعر و سخن کی طرف بھی میلان تھا۔ چند اشعار کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ میں نے اس چیز کو یاد کیا جو مجھ پر ہمیشہ بکا کرتی ہے۔ تو میں نے علم دین اور حدیث کے سوا کسی اور چیز کو نہ پایا۔

۲۔ یعنی اللہ کی کتاب اور ان حدیثوں کے علوم جو صحت نقل کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو کر ہم تک پہنچے ہیں

۳۔ اور علم ان لوگوں کا جو اس کے پرکھنے والے ہیں اور ہماری سمجھ اس علم میں جس میں

---

[۱] بستان المحدثین ص ۱۲۰۔ [۲] تذکرۃ المحدثین ج ۲ ص ۲۶۲۔ [۳] بستان المحدثین ص ۱۲۰۔ [۴] تذکرۃ المحدثین ج ۲ ص ۲۶۳
[۵] تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۵، ابن خلکان ج ۳ ص ۱۸۱۔ [۶] تذکرۃ المحدثین ج ۲ ص ۳۶۲۔ [۷] تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۶

انھوں نے اپنی رائے اور نظر سے اختلاف کیا۔

۴ نصیحت والی اور فائدہ مند گفتگو مان لو۔ جبکہ اُسے عقل مندوں سے سنو

۵ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کو اپنے لئے لازم کر لو۔ کیونکہ آپ کی اتباع رشد کے اعمال میں سب سے افضل ہے۔ لہ

اعترافِ کمال۔ حافظ ابن عبد البرؒ کی عظمت شان، تبحرِ علمی، بلند پائیگی اور علمی کمالات کا تمام معاصرین، فضلاء اکمرفن ور ارباب سیر نے اعتراف کیا ہے۔ امام ذہبی لکھتے ہیں کہ

"ابن عبد البر احد الاعلام تھے۔ حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ۔ حافظ ابن عبد البرؒ بلاد مغرب کے کبار اور منتخب علماء میں تھے ان کا علمی پایہ خطیب بیہقی اور ابن حزم سے کمتر نہیں تھا۔ ٣ه

حافظ ابن عبد البرؒ کا مسلک۔ بلاد مغرب کے اکابر و فضلاء کی طرح ابن عبد البرؒ امام دار الہجرت کے مکتب فقہ و اجتہاد سے وابستہ تھے۔ سید عبد الحیؒ کتانی لکھتے ہیں۔

"کہ ابن عبد البر کی تصنیفات کے تتبع واستقراء سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اندھی تقلید سے دور اور امام مالکؒ کے مذہب واصول سے مراجعت کرکے اپنے اعتماد پر کوئی قول اختیار کرتے تھے۔ ٣ه

زہد و ورع۔ علم و فضل کی طرح زہد و ورع میں بھی ممتاز تھے۔ مورخین نے ان کے صدق و دیانت، حسن عقیدہ عفت و پاکدامنی اور اتباعِ سنت کا ذکر کیا ہے۔

حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ جو صدق و دیانت، حسن عقیدہ اور اتباع سنت ان کے حصہ میں آیا وہ کسی اور کے حصہ میں کم آیا ہے۔ ٣ه

ابتلاء و آزمائش۔ حافظ ابن عبد البرؒ کو بھی آزمائش و ابتلاء سے دوچار ہونا پڑا۔ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ۔

وجلی عن وطنه فی الفتنة نحال الغرب الاندلس ٥ه۔ فتنہ کے وقت وہ اپنے وطن سے مراجعت کرکے مغربی اندلس چلے گئے لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کو کس بنا پر ابتلا کا سامنا کرنا پڑا۔

وفات۔ اسی غریب الوطنی میں اندلس کے شہر شاطبہ میں ربیع الثانی کی آخری کو ۴۶۳ھ میں ۹۵ سال کی عمر میں آپ کا انتقال ہوا۔ ٦ه

تصنیفات۔ حافظ ابن عبد البرؒ بلند پایہ اور ممتاز مصنف تھے تصنیف و تالیف کا ان کو فطری اور عمدہ ذوق تھا۔ تصنیف و تالیف کے سلسلے میں مورخین نے آپ کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

امام ابن حزمؒ (م ۴۵۶ھ) لکھتے ہیں کہ۔ "حافظ ابن عبد البر کی کتابیں مختلف حیثیتوں سے اہم اور بے مثال ہیں۔ ٧ه

لہ بستان المحدثین ص ۱۲۱۔ ٢ه ایضاً ص ۱۲۱۔ ٣ه تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۶، و بستان المحدثین ص ۱۲۰۔ ٤ه بستان المحدثین ص ۱۲۰۔ ٥ه ابن خلکان ج ۳ ص ۱۸ ۴م۔ ٦ه بستان المحدثین ص ۱۲۱۔ ٧ه نفح الطیب ج ۲ ص ۱۳۱، تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۵

مؤرخ ابن خلکان (م ۶۸۱ھ) فرماتے ہیں کہ۔

تصنیف و تالیف میں توفیق الٰہی اور تائید ایزدی ان کے شامل حال تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی کتابوں سے بڑا فائدہ پہنچایا۔[1]

حافظ ابن کثیرؒ (م ۷۷۴ھ) رقمطراز ہیں کہ "ابن عبدالبرؒ عمدہ اور عظیم الشان کتابوں کے مصنف تھے"۔[2]

علامہ سید عبدالحیٔ کتانیؒ لکھتے ہیں کہ۔

"وہ عدیم النظیر مصنف تھے۔ ان کی تصنیفات کو بڑی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی"۔[3] ان کی جن تصنیفات کے نام معلوم ہو سکے ہیں اُن کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ البستان فی الاخوان

۲۔ البیان عن تلاوۃ القرآن یا البیان فی تاویلات القرآن[4]

۳ کتاب اخبار آئمہ الامصار　　(۷ جز میں۔)

۴ اختصار تاریخ احمد بن سعید۔　۵ اختصار التحریر　۶ اختصار التمیز علم

۷ کتاب اصحاب مالک بن انس و اختلاف روایاتہم عنہ　　(۲۴ جز میں)

۸ کتاب الاستظہار فی حدیث عمار۔　۹ کتاب الشواہد فی اثبات خبر الواحد　۱۰ کتاب الفرائض

۱۱ کتاب المدخل فی القرآت یا کتاب التجوید والمدخل الی علم القرآت بالتجرید　　(۲ جز میں)

۱۲۔ کتاب جمہرۃ الانساب۔ یہ کتاب عربی قبائل و انساب کے بیان میں ہے[5]۔

۱۳۔ الاحتیال بمانی شعر ابی العتاھیۃ من لامثال۔[6]　علامہ سید سلیمان ندوی (م ۱۳۷۳ھ) نے کتب ادب و دواوین کے تحت اس کا ذکر کیا ہے۔[7] کتب خانہ شیخ الاسلام۔ مدینہ میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے

۱۴۔ خیریت الشیوخ

۱۵ الاجوبۃ المرعیۃ علی المسائل المستغربۃ من صحیح البخاری　اس کتاب میں صحیح بخاری کے مشکلات حل کیے گئے ہیں اور اس کے ساتھ علامہ ابن حزم (م ۴۵۶ھ) کے جوابات بھی ہیں۔[8]

۱۶ کتاب العقل والعقلاء ما جاء فی اوصافہم۔ موضوع نام سے ظاہر ہے۔ اس میں عقل اور عقلاء کے بارے میں کے ملفوظات ایک جز میں درج ہیں[9]۔

۱۷ کتاب الکنیٰ۔ اس کتاب میں ان رواۃ کا ذکر ہے جو ناموں کی بجائے کنیتوں سے مشہور ہیں۔ یہ کتاب ۷ جز میں ہے

۱۸ کتاب الاکتفاء فی قراۃ نافع وابی عمرو۔ اس میں قراء سبعہ کے ان دونوں آئمہ کے اختلاف کی توجیہ اور ان کے دلائل بیان کیے گئے ہیں۔

---

[1] ابن خلکان ج ۳ ص ۸۱۲، [2] البدایہ والنہایہ ج ص ۱۰۴ [3] تذکرۃ المحدثین ج ۲ ص ۳۶۹۔ [4] کشف الظنون ج ۱۔ [5] ابن خلکان ج ۳ ص ۸۱۲ وبستان المحدثین ص ۱۱۲ [6] مقالات سلیمان ج ۲ ص ۳۶۳ [7] سیرت البخاری ص ۲۰۷ [9] بستان المحدثین ج ۱۲۱

۱۹۔ کتاب الدرر فی اختصار المغازی والسیر۔ اس کتاب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور غزوات کے واقعات تحریر کیے گئے ہیں۔ [۱] یہ کتاب ابن اسحاق اور ابن عقبہ کی کتابوں کا مختصر ہے یہ کتاب شائع ہو چکی ہے۔ [۲]

۲۰۔ کتاب بہجۃ المجالس وانس المجالس۔ اس میں ادب محاضرات کی بلند پایہ کتابوں سے نادر واقعات، دلچسپ حکایات منتخب اشعار اور حکیمانہ اقوال جمع کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب ۱۲۷ ابواب پر مشتمل ہے۔ ابن خلکان نے اپنی تاریخ میں کچھ ظریفانہ واقعات نقل کیے ہیں۔ [۳]

۲۱۔ کتاب الکافی۔ اس کا دوسرا نام کافی فی فروع المالکیہ ہے۔ [۴] یہ فقہ مدینہ اور مذہب مالکی کے فروع وجزئیات میں ایک مبسوط کتاب ہے۔ اور ۱۶ اجزوں پر مشتمل ہے [۵] اس کتاب میں اس بات پر بحث ہے کہ مفتی کون ہو سکتا ہے۔ اور مفتی کی کیا شرائط ہیں۔ اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ سیدنا عثمانؓ مدینہ منورہ میں موجود ہے [۶] علامہ سید سلیمان ندوی (م ۱۳۷۳ھ) نے کتب خانہ سیدنا عثمانؓ کے نادر کتب میں اس کا شمار کیا ہے۔ [۷]

۲۲۔ القصد والامم فی التعریف باصول انساب العرب والعجم ومن اول تکلم بالعربیہ من الامم۔
کتاب کے نام سے اس کے موضوع کا پتہ چلتا ہے۔ یعنی بُعد وطن مُرورِ ایام اور اقتدار زمانہ کی وجہ سے عربی وعجمی قبائل واقوام کی حسب نسب گڈمڈ اور خلط ملط ہو جانے کا ذکر ہے۔ ابتدا میں اس پر بحث ہے کہ سب سے پہلے کس شخص نے عربی میں بات چیت کی [۸] یہ کتاب ۱۳۵۰ھ میں قاہرہ (مصر) سے شائع ہو چکی ہے۔ [۹]

۲۳۔ الانصاف فیما بین علماء الاسلام فی بسم اللہ الرحمن الرحیم من الخلاف۔ اس رسالہ کا تعارف مولانا ضیاءالدین اصلاحی یوں کراتے ہیں
"اس میں بسم اللہ کے متعلق صحابہ وتابعین ائمہ سلف اور فقہا کے مذاہب کے مسالک واختلافات نقل کیے گئے ہیں کہ سورۂ فاتحہ کی آیت ہے یا نہیں اور نماز میں سورہ فاتحہ کے ساتھ اس کو بھی پڑھنا چاہیے یا نہیں۔ اور اگر پڑھنا چاہیے تو زور سے یا آہستہ نیز وہ تمام قرآنی سورتوں کی آیت یا صرف سورۂ نمل کی؟ مصنف نے ان امور کے متعلق تین مستقل مذاہب تحریر کیے ہیں کہیں کہیں ان مذاہب کے جزوی اختلافات کا ذکر بھی آگیا ہے۔ ہر ہر مذہب کے دلائل اور اس کی مؤید احادیث بھی جمع کی گئی ہیں اس سے مصنف کی بے جانبداری کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ رسالہ ۱۳۴۳ھ میں قاہرہ (مصر) سے شائع ہو چکا ہے [۱۰]

۲۴۔ الانتقاء فی فضائل الثلاثۃ الفقہاء مالک والشافعی وابی حنیفہ۔
یہ فقہ اسلامی کے ائمہ ثلاثہ کے فضائل ومناقب اور اوصافِ کمالات کا مجموعہ ہے۔ اور تین جزوں پر مشتمل ہے۔ پہلے جز میں امام مالکؒ (م ۱۷۹ھ) دوسرے میں امام شافعیؒ (م ۲۰۴ھ) اور تیسرے میں امام ابوحنیفہ (م ۱۵۰ھ) کا تذکرہ ہے۔ مصنف نے ان اساطین فقہ کے تذکرہ میں ضمناً ان کے نامور تلامذہ اور ممتاز اصحاب کا بھی مختصر تذکرہ شامل کرایا ہے۔ یہ کتاب

---

[۱] بستان المحدثین ص ۱۲۱۔ [۲] تذکرۃ المحدثین ج ۱۲۱۔ [۳] ابن خلکان ج ۳ ص ۱۸۴، وبستان المحدثین ص ۱۲۱۔
[۴] کشف الظنون [۵] تذکرۃ المحدثین ج ۲ ص ۲۷۱ [۶] مقالات سلیمان ج ۲ ص ۳۷۷ [۷] ایضاً ص ۳۷۷۔ [۸] مقدمہ القصد والامم
[۹] تذکرۃ المحدثین ج ۲ ص ۲۷۱۔ [۱۰] تذکرۃ المحدثین ج ۲ ص ۲۷۲۔

مکتبۂ قدسی قاہرہ (مصر) سے ۱۳۵۰ھ میں شائع ہو چکی ہے۔ شروع میں مصنف کتاب (حافظ ابن عبد البرؒ) کے مختصر حالات بھی درج ہیں[1]

۲۵ جامع بیان العلم وفضلہ ـ یہ علم، فضیلت علم، اور اہل علم کی عظمت اور ان کے فرائض کے متعلق ایک جامع کتاب ہے اور عربی ادب میں بڑے پائے کی کتاب مانی جاتی ہے۔ علم اور فضیلت علم میں اس سے بہتر اور جامع کتاب اس سے پہلے اور بعد میں نہیں دیکھی گئی اس میں طلب علم کی اہمیت، اس کے ضروری آداب، طلباء و شیوخ اور علمائے کرام کے اوصاف اور دین میں علم و نظر و فکر و استدلال قیاس و اجتہاد، فہم و بصیرت اور دلیل و برہان کی ضرورت اور تقلید و اتباع کا واضح فرق بیان کیا گیا ہے، اور بحث و مباحثہ و قیاس و رائے اور تقلید کی مختلف اقسام پر گفتگو کر کے یہ دکھایا گیا ہے کہ کونسی صورتیں پسندیدہ ہیں اور کونسی ناپسندیدہ۔ اور اس سلسلے میں مصنف نے روایات و آثار اور سلف صالحین کے اقوال کا عمدہ ذخیرہ جمع کر دیا ہے۔

کتاب کی تالیف محدثین کرام کے دلنشین طریقے پر ہوئی ہے۔ ابواب قائم کیے گئے ہیں اور ہر باب میں روایات کچھ اس طرح جمع کر دی گئی ہیں کہ موضوع خشک ہونے پر بھی کتاب دلچسپ بن گئی ہے مگر اسانید کے بیان اور روایات کے تکرار سے کتاب اتنی طویل ہو گئی کہ دو جلدوں میں چھپی ہے یہ طوالت موجودہ مذاق پر گراں تھی اس لئے بعض مصری علماء نے اس کا اختصار شائع کرایا۔

۱۹۲۷ء میں مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی مرحوم نے احمد بن عمر محمد صافی بیروتی ازہری کے اختصار کا اردو ترجمہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے ایماء پر العلم والعلماء کے نام سے کیا مگر یہ ترجمہ مترجم کی صحافتی مصروفیتوں کی وجہ سے شائع نہ ہو سکا۔ آخر ۱۹۵۳ء میں ندوۃ المصنفین دہلی نے اس ترجمہ کو شائع کیا۔ اس کتاب کے شروع میں مترجم مرحوم مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی، ۳۰ صفحات میں ایک علمی مقدمہ لکھا ہے جس میں اسلام سے پہلے اور بعد کی علمی حالت، اسلام میں علم کی اہمیت اور مسلمانوں کے علم و فن میں اشتغال و انہماک کا ذکر ہے۔ یہ کتاب ۲۹۶ صفحات پر شائع ہوئی ہے صفحہ ۳ تا ۳۲ مقدمہ مترجم ہے۔ صفحہ ۳۳ تا ۲۵۹ تک ۴۶ عنوانات کے تحت موضوع کتاب، علم، فضیلتِ علم اور اہل علم کی عظمت اور ان کے فرائض پر بحث ہے صفحہ ۲۶۰ سے ۲۷۵ امام شافعیؒ کا سفرنامہ ہے۔ اور صفحہ ۲۷۶ تا ۲۹۶ اسماء الرجال کے عنوان سے ان مشاہیر اسلام کا تذکرہ ہے جن کے اقوال خاص اہتمام سے اس کتاب میں نقل ہوئے ہیں اور ہر نام کے ساتھ سن وفات درج کیا گیا ہے۔

شروح موطا امام مالک ـ حافظ ابن عبد البرؒ نامور اور ممتاز محدث تھے خصوصاً احادیث کی شرح و توجیہ میں وہ بڑے ماہر تھے مالکیہ میں اس پایہ کا کوئی شارح حدیث نہیں گزرا انہوں نے موطا امام مالک کی پانچ بڑی ضخیم شرحیں لکھی ہیں۔ ذیل میں ان کا مختصر تعارف درج ہے۔

۲۶ تمہید لما فی الموطا من المعانی والاسانید۔ یہ موطا کی ضخیم اور عظیم الشان شرح ہے اس کو حدیث کی عمدہ اور بہترین شرحوں میں شمار کیا جاتا ہے، اسی کی بدولت حافظ ابن عبد البرؒ کو ممتاز محدث اور مالکیہ کا سب سے بلند پایہ شارح حدیث قرار دیا گیا ہے مورخ ابن خلکان (م ۶۸۱ھ) لکھتے ہیں کہ یہ شرح ۷۰ جیبروں پر مشتمل ہے۔ اور اس کی ۲۲ جلدیں بنتی ہیں۔ اس شرح کو ممتاز علمائے کرام نے خراج تحسین پیش کیا ہے۔

---

[1] ایضاً ص ۲۷۲

امام ابن حزمؒ (م ۴۵۶ھ) فرماتے ہیں کہ

" فقہ حدیث میں ایسی عمدہ کتاب میری نظر سے نہیں گزری"[1]

مورخ ابن خلکان (م ۶۸۱ھ) لکھتے ہیں۔ کہ

ابن عبد البرؒ سے پہلے کسی نے ایسی عظیم الشان کتاب نہیں لکھی تھی۔"[2]

حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی (م ۱۲۳۹ھ) رقمطراز ہیں

" فقہ حدیث میں حافظ ابن عبد البرؒ کی کتاب التمہید نادر روزگار اور زبردست و روشن ضمیر، مجتہدوں کے لئے سرمایۂ بصیرت ہے اُن کی تصانیف میں سے یہی ایک کتاب مذہب مالکی میں کافی ہے"[3]

علامہ سید سلیمان ندویؒ (م ۱۳۷۳ھ) لکھتے ہیں کہ

" موطا کے معانی کی تشریح اور اس کے اسانید کی تحقیق اور اس ضمن میں فقہ و حدیث کی بے شمار معلومات ہیں۔ اس کی ترتیب امام مالک کے رواۃ اور شیوخ کے ناموں پر کی گئی ہے"[4]

مصنف کا خود بیان ہے۔

ہم نے تمہید میں سنن و روایات کے معانی و وجوہ اور ان کی بابت علماء کے آراء اور مذاہب تفصیل سے لکھے ہیں اس لئے یہ شرح بہت طویل ہو گئی ہے۔ علاوہ ازیں اس میں شواہد و ادلہ کی کثرت ہے شروع میں امام مالک کے فضائل و کمالات نقل و روایت حدیث میں ان کی احتیاط اور چھان بین اور حدیث کے اصول و ضوابط بیان کئے گئے ہیں۔ موطا کے مراسیل کا وصل بھی ثقہ راویوں کے طرق سے بیان کر دیا گیا ہے تاکہ مراسیل کی صحت پوری طرح ظاہر ہو جائے"[5]

حکیم الامت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م ۱۱۷۶ھ لکھتے ہیں کہ

" اس کی ترتیب و تصحیح میں ابن عبد البرؒ نے موطا کے ۱۲ مستند اور مشہور نسخوں سے مدد لی تھی"[6]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے کتنی محنت اور جانفشانی اور کس قدر اہتمام سے یہ شرح لکھی تھی

کتاب الاستذکار۔ اس کا پورا نام۔ الاستذکار بمذاہب علماء الامصار فیما تضمنہ الموطا من معانی الرای والآثار ہے۔

حافظ ابن عبد البرؒ نے اپنی مشہور کتاب التمہید کا اختصار کیا ہے[7]

حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی لکھتے ہیں!

---

[1] تذکرۃ المحدثین ج ۲ ص ۲۷۵۔ [2] ایضاً ص ۲۷۶۔ [3] بستان المحدثین ص ۱۲۰۔ [4] حیاتِ امام مالک ص ۹۹۔ [5] تجرید ص ۹، ۱۰ بحوالہ تذکرۃ المحدثین ج ۲ ص ۲۷۶۔ [6] مصفی شرح موطا ص ۷۔ [7] حیاتِ امام مالک ص ۹۹۔

یہ موطا کی بہترین شروح میں سے ہے۔ اور موطا کی تنسیق ابواب میں بڑی فنی مہارت سے کام لیا گیا ہے اور یہ بہت عمدہ اور مقبول کتاب ہے۔[1]

کتب خانہ سیدنا عثمانؓ مدینہ منورہ میں اس کے قلمی نسخے موجود ہیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے اس کو کتب خانے کی نادر کتب میں شمار کیا جاتا ہے۔[2]

حافظ ابن عبدالبرؒ کے علاوہ دوسرے ممتاز محدثین کرام نے التمہید کا اختصار کیا ہے۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے حیاتِ امام مالک میں ان سب کی فہرست دی ہے۔ چند مشہور شروح یہ ہیں۔

المنتقی[1]۔ الایماء[2]، الاستیفاء[3]۔ ابوالیسر سلیمان الباجی (م ۴۷۴ھ)

(۴) القبیس۔ قاضی ابوبکر بن العربی المغربی (م ۵۴۶ھ)

(۵) المقتبس۔ ابومحمد عبداللہ بن محمد لطلیموسی (م ۵۲۱ھ)

(۶) کشف الغطاء عن الموطا مالک۔ علامہ جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ)

(۷) تنویر الحوالک علی موطا مالک علامہ جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ)[3]

۲۸ استذکار لحدیث الموطا۔ اس کے متعلق علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں!

"یہ موطا کی احادیث سند و متصل کے انتخاب و ترتیب پر مشتمل ہے۔[4]

۲۹ التقصی لحدیث الموطا۔ اس کے متعلق علامہ ندویؒ لکھتے ہیں

یہ موطا کی منقطع، مرسل، منفصل، اور بلاغات کے وصل و رفع اسناد پر مشتمل ہے[5]

۳۰ تجرید۔ یہ کتاب التمہید کا دیباچہ یا مختصر ہے۔ اس کے متعلق حافظ ابن عبدالبرؒ لکھتے ہیں۔

"تمہید کی طوالت کی وجہ سے ہم نے موطا کی احادیث و سنن کو اس میں علیحدہ جمع کر دیا ہے۔ اور مسند، مرسل متصل، اور منقطع کو ممیز کر دیا ہے۔ کیونکہ یہ سب امام مالک اور ان کے اتباع کے نزدیک حجت و واجب العمل ہیں۔ پس اس کتاب کو التمہید کا ایک ایسا آسان مدخل (مقدمہ) خیال کرنا چاہیے۔ جس میں امام مالک کے رواۃ کے وصل و ارسال پر مختصراً تنبیہ کی گئی ہے۔[6]

اس کی ترتیب حروف معجم کے مطابق ہے اور اس میں امام مالک کے شیوخ کے نام و نسب، کنیت، سن وفات، روایت میں ان کا درجہ ضبط و ثقاہت، ان سے امام مالک کی مرویات کی تعداد، حدیثوں کے رفع و اتصال اور وقف و انقطاع اور اسناد و ارسال پر بحث کی گئی ہے۔ اور حدیثوں کا متن بھی دیا گیا ہے۔ اور آخر میں بلاغات و مراسیل کا علیحدہ باب ہے۔

یہ کتاب ۱۳۵۰ھ) میں مکتبہ قدسی قاہرہ (مصر) سے شائع ہو چکی ہے۔

---

[1] حیاتِ امام مالک ص ۹۹ [2] بستان المحدثین ص ۱۲۰۔ [3] مقالات سلیمان ج ۲ ص ۳۷۵۔ [4] حیات امام مالک ص ۱۰۰ [5] ایضاً [6]
[8] ایضاً ص ۱۰۵۔ [9] تجرید ص ۱۰۔ [11] بحوالہ تذکرۃ المحدثین ج ۲ ص ۳۷۵۔

۳۱۔ الانباہ علی قبائل الرواۃ۔ یہ دراصل آپ کی معروف کتاب الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب کا دیباچہ ہے۔ اس میں ان اہم قبائل کا تذکرہ ہے جن کو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قربت و اتصال اور روایت کرنے کا شرف حاصل ہے۔

مصنف کا خود بیان ہے کہ اس میں انہوں نے مندرجہ ذیل اصحاب کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔

(۱) ابو بکر محمد بن اسحاق۔ (۲) ابو المنذر ہشام بن محمد سائب کلبی۔ (۳) ابو عبیدہ معمر بن مثنیٰ

(۴) محمد بن عبدہ بن سلیمان۔ (۵) محمد بن حبیب (۶) ابو عبداللہ احمد بن محمد عبید مدری

(۷) زبیر بن بکار (۸) مصعب بن عبداللہ زبیری۔ (۹) علی بن کیسان کوفی

(۱۰) علی بن عبدالعزیز جرجانی۔ (۱۱) عبدالمالک بن حبیب اندلسی۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب بڑی محنت اور مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ اس میں مذکورہ بالا حضرات کے اقوال کے علاوہ احادیث و آثار اور اہلِ اخبار و سیر کے بیانات بھی شامل ہیں۔ اور عرب کے مختلف قبائل کے انساب اور علم انساب کی اہمیت کا تذکرہ ہے۔

یہ کتاب القصد والامم کے ساتھ ۱۳۵۰ھ میں قاہرہ (مصر) سے شائع ہو چکی ہے۔ [۱] علامہ جلال الدین سیوطیؒ (م ۹۱۱ھ) نے اس کا ذیل لکھا تھا۔ [۲]

۳۲۔ الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب۔ علامہ ابن عبدالبرؒ کی مشہور و معروف کتاب ہے اور مصنف کی شہرت و مقبولیت کا ذریعہ یہی ایک کتاب ہے۔ یہ کتاب صحابہ کرام کے حالاتِ و مناقب میں ہے۔ اور اس میں ۳۸۸۵ صحابہ کرام کے حالاتِ زندگی بیان کیئے گئے ہیں۔

صحابہ کرام کے حالات میں اس سے پہلے کئی کتابیں لکھی گئی ہیں۔

علامہ ابنِ اثیر جزری (م ۶۳۰ھ) لکھتے ہیں۔

"صحابہ کے حالات میں بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں مگر سب میں جامع ابن منذر، ابو نعیم اور ابن عبدالبر قرطبی کی کتابیں۔ اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ ان کی تصنیفات عمدہ اور سعی بلیغ کا نتیجہ ہیں اس لیے میں ان کو مواد مقویات کو یکجا کر کے ان میں بعض اضافے کرنے کا ارادہ کیا ہے۔" [۳]

علامہ ابن اثیرؒ کی کتاب کا نام "اسد الغابہ" ہے۔ جو صحابہ کرام کے حالات پر مشتمل ہے۔ اور اس کے متعلق حافظ ذہبی (م ۷۴۸ھ) لکھتے ہیں۔

"اسد الغابہ ان تمام صحابہ کے ناموں پر مشتمل ہے جو معرفت صحابہ میں لکھی جانے والی چاروں کتابوں میں مذکور ہیں۔ یہ ابن مندہ اور ابو عمر بن عبدالبر کی کتابوں کا ذیل ہونے کے باوجود بعض اہم اور مفید اضافوں پر مشتمل ہے" [۴]

حافظ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) لکھتے ہیں:

ابو عبداللہ بن مندہ، ابو نعیم اور قاضی ابو عمر بن عبدالبر کی کتابیں زیادہ مشہور و مقبول اور متاخرین کی کتابوں کا ماخذ ہیں [۵]

---

[۱] تذکرۃ المحدثین ج ۲ ص ۲۰۲ [۲] کشف الظنون ص ۵۳ ج ۱ [۳] مقدمہ اسد الغابہ ص ۳ [۴] تجرید اسماء الصحابہ ص ۲، ۳ [۵] مقدمہ اصابہ

اور خود حافظ ابن حجرؒ نے ایک عظیم الشان اور معرکۃ آلارا کتاب الاصابہ فی تمیز الصحابہ ہے جو اسماء الرجال میں بڑی جامع اور مکمل ہے۔ اور حافظ ابن حجرؒ نے حافظ ابن عبدالبر کی الاستیعاب سے کافی استفادہ کیا ہے۔

صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں۔!

جمع فیہ مافی الاستیعاب و ذیلہ[1]۔ جو کچھ استیعاب میں ہے اصابہ اس کی جامع بھی ہے اور اس پر ذیل بھی

اس تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ معرفت صحابہ میں لکھی جانے والی اہم کتابوں میں استیعاب کا بھی ایک خاص مقام ہے۔

استیعاب کے متعلق علمائے کرام نے بہت اچھی آرا دی ہیں

علامہ ابن حزم (م ۴۵۶ھ) لکھتے ہیں کہ۔

"معرفت صحابہ میں بے شمار کتابیں لکھی گئیں لیکن متقدمین میں کسی کتاب ابن عبدالبر کی کتاب کے ہم پایہ نہیں ہے"[2]

مورخ ابن خلکان (م ۶۸۱ھ لکھتے ہیں کہ

"اسماء الرجال میں استیعاب ایک مفید اور بلند پایہ کتاب ہے"[3]

ابن مندہ اور ابو نعیم کی کتابیں تو معدوم ہو گئیں مگر حافظ ابن عبدالبرؒ کی استیعاب موجود ہے۔ اور اس کے بعد جو کتابیں لکھی گئیں وہ بھی محفوظ ہیں۔ مثلاً اسد الغابہ، ابن اثیرؒ جزری (م ۶۳۰ھ) اور اصابہ فی تمیز الصحابہ، ابن حجر عسقلانی۔ (م ۸۵۲ھ) اور ان میں استیعاب کو زمانی تقدم حاصل ہے۔

مقصد تصنیف صحابہ کرامؓ کے حالات شروع کرنے سے پہلے بطور تبرک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مختصر اور جامع تذکرہ لکھا ہے اور علامہ ابن عبدالبرؒ استیعاب کی وجہ تصنیف یہ لکھی ہے۔

"کتاب اللہ کی مراد کو واضح کرنے کا اصل ذریعہ اور اس کے بعد سب سے اہم اور مقدس سنن نبوی کا علم ہے اور سنت کے حفظ و ضبط میں سب سے زیادہ مفید و معاون چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حواری و صحابہ کی معرفت ہے۔ کیونکہ انہی لوگوں کے نقل و بیان سے سنتیں ہم تک پہنچی ہیں۔ پس یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور امت کے درمیان واسطہ ہیں۔ ان کی تعدیل اور تزکیہ کا خود خدا اور رسول نے ذکر کیا ہے"[4]

یہ گرانمایہ کتاب دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن سے پہلی دفعہ ۱۳۱۸-۱۹ھ میں دو جلدوں میں شائع ہوئی دونوں جلدوں کی تعداد ۸۰۸ ہے۔ جس میں ۹۶ صفحات فہرست کے ہیں۔ مولانا حسن بن احمد نے تصحیح کی اور مختصر حواشی لکھے ہیں۔

دوسری مرتبہ ۱۳۲۸ھ میں حافظ ابن حجر کی اصابہ فی تمیز الصحابہ کے حاشیے پر مصر سے چار جلدوں میں شائع ہوئی۔

---

[1] کشف الظنون، ج ۱ [2] تذکرۃ المحدثین ج ۲ ص ۲۰۸ - [3] وفیات الاعیان ج ۳ [4] مقدمہ استیعاب ج ۱ ص ۹۶۱

[5] تذکرۃ المحدثین ج ۲ ص ۴۸۳

حکیم محمد حسین خان شفا رام پور (یوپی)

حالی اور رامپور

حکیم محمد حسین خان شفا کا یہ مضمون رام پور کے اخبار "روزنامہ قومی جنگ" (۸ ستمبر ۱۹۸۱ء) میں شائع ہوا تھا خوشنود حسن خان رام پوری جو علمی مزاج کے ایک پاکستانی نوجوان ہیں۔ اُن کے ذریعہ سے یہ مجھ تک پہنچا اور میرے لیے ایک قیمت غیر مترقبہ ثابت ہوا کہ حالی کا رام پور سے کسی قسم کا تعلق ہونا۔ اس سے پہلے قطعاً میرے علم میں نہیں تھا۔ نہ والد مرحوم (محمد احمد مینائی) نے جو حضرت امیر مینائی کی وفات کے بعد دربار رام پور کی جملہ علمی ادبی اور تصنیفی تالیفی سرگرمیوں سے واقف اور وابستہ رہے۔ انہوں نے کبھی مجھ سے اس کا یا ایسا کوئی ذکر کیا۔

یہ مضمون اس لحاظ سے ہندو پاک کے ان ارباب قلم کو دعوت تحقیق مزید دیتا ہے جو تاریخ ادب اردو اور اس کے مشاہیر کی سرگرمیوں اور خدمات کے بارے پرانے ریکارڈ تلاش کرنے کے اور ان کو از سر نو ترتیب دینے کے جویا ہیں تاکہ زبانِ اردو کے آغاز، اٹھان، تعمیر و ترقی کی کہانی مشاہیر اُردو کی زبانی تیار کی جا سکے مدیر فاران۔

خواجہ الطاف حسین حالی کا شمار دنیائے علم و ادب کے ان چند بڑے اشخاص میں ہوتا ہے جن کا ادب و احترام کیا جاتا ہے ان کے بارے میں حضرت صفی لکھنوی نے سچ کہا ہے۔

سعدی و عطار اس صدی کا طینت میں اثر نہ تھا بدی کا
دل آئینہ عشق سرمدی کا پتلا خُلقِ محمدی کا۔
تھا حسنِ عمل سے جس کو رشتہ قالب میں بشر کے اک فرشتہ

یہ فرشتہ صفت انسان ہندوستان کے تاریخ ساز شہر پانی پت میں ۱۸۳۷ء / ۱۲۵۳ھ کو پیدا ہوا ان کا نسلی سلسلہ انصاریانِ عرب کی ایک شاخ سے ملتا ہے جن کے نام سے پانی پت میں محلہ انصار آج بھی مشہور ہے۔ حالی کا خاندان ان کے بچپن میں عبرت زدہ مفلوک الحال تھا والدہ کا دماغی توازن خراب ہوگیا تھا والد کا ۹ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا[1]

---

[1] (دبلہ خود نوشت "حالی" از نقش حالی جلد اوّل مرتبہ نور الحسن ہاشمی۔ جبکہ حالی کی عمر نو برس کی تھی)

بھائی بہن نے رسم برادری کے مطابق ۱۷ سال کی عمر میں شادی کر دی۔

اِن حالات میں غریب حالی کی باضابطہ تعلیم نہیں ہوسکی کچھ ذاتی شوق سے پڑھا لکھا اور مزید تعلیم کے واسطے بیوی اور گھر والوں سے چھپ کر دہلی چلے گئے جہاں انہوں نے اہل علم کی صحبت سے خوب استفادہ کیا

حالی دہلی میں غالب سے اپنی ملاقات کے بارے میں لکھتے ہیں

۱۸۵۵ء میں مرزا اسداللہ خاں غالب کی خدمت میں اکثر جاتا تھا اور اُن کے اپنے دیوان کے اشعار جو سمجھ میں نہ آتے تھے ان کے معنی ان سے پوچھا کرتا تھا اور چند فارسی قصیدے انہوں نے اپنے دیوان میں سے مجھے پڑھائے بھی تھے ان کی عادت تھی کہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکر شعر کرنے سے منع کیا کرتے تھے مگر میں نے جو ایک آدھ غزل اردو یا فارسی کی لکھ کر ان کو دکھائی تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ اگرچہ میں کسی کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمہاری نسبت میرا خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہوگے تو اپنی طبیعت پر ظلم کروگے۔ غالباً اسی عرصہ میں حالی کی شناسائی رام پور کے شاہی خاندان سے ہوگئی جو دہلی میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس خاندان کے بعض افراد غالب کے شاگرد اور کچھ دوست تھے حسن اتفاق سے اسی جلاوطن خاندان کے ایک فرد یوسف علی خان بن نواب محمد سعید خان بن نواب غلام محمد خاں ۹ اپریل ۱۸۵۵ء میں والئ رام پور ہوئے۔ نواب یوسف علی خان کا بچپن و جوانی دہلی میں گزری تھی یہیں سے (مکاتیب غالب مرتبہ مولانا عرشی مطبوعہ ۱۹۴۵ء صفحہ ۱۷۱) آپ نے تعلیم و تربیت حاصل کی تھی۔ دہلی کے اہل علم و روسا آپ کے دوست تھے۔ نواب صاحب کو حالی بھی اچھی طرح جانتے تھے اسی وجہ سے انہوں نے نواب صاحب کی شان میں ایک قصیدہ اور ایک درخواست اُن کے ایک محسن پوری دوست کے توسط سے نذر کی۔

نواب صاحب کی طرف سے اس درخواست پر کیا کارروائی ہوئی اس کے بارے میں فی الحال کچھ نہیں کہا جاسکتا اغلب گمان یہ ہے کہ اس وقت نواب صاحب غدر ۱۸۵۷ء سے ریاست کو محفوظ رکھنے کی تدبیر میں مصروف تھے اور سخت کشمکش کا شکار تھے اس وجہ سے حالی کی درخواست پر کوئی توجہ نہیں دی گئی ہوگی جس طرح دوسرے اہل علم کی درخواستوں پر اس وقت کوئی غور نہیں کیا گیا تھا (۱ غالب اور آزاد، نقش آزاد شریک غالب از شیخ اکرم۔ غالب اور رام پور) حالی کی ایک اور درخواست اور قصیدہ سے جو ریاست رام پور کے پولیٹکل ریکارڈ آفس میں محفوظ تھا۔ اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ نواب یوسف علی خاں نے حالی کی حالت زار پر التفات نہیں کیا

۱۸۵۶ء میں حالی ضلع حصار میں کلکٹر کے دفتر میں ایک معمولی تنخواہ کی آسامی پر ملازم ہوگئے۔ لیکن غدر ۱۸۵۷ء میں وہ ملازمت بھی چھوٹ گئی اور بال بچے اور حالی سخت معاشی مشکلات کا شکار ہوگئے۔ ۱۸۶۳ء میں حالی کے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے تعلقات ہوگئے اور حالی نواب صاحب کے ملازم ہوگئے۔

حالی نے نواب صاحب کی علمی صحبت سے خوب استفادہ کیا۔

اپریل ۱۸۶۵ء میں نواب یوسف علی خان کا انتقال ہوگیا اور ان کے لڑکے کلب علی خان نواب رام پور ہوئے۔ نواب صاحب اور حالی میں بہت سی قدریں مشترک تھیں۔ دونوں مذہبی آدمی تھے، تقریباً ہم عمر تھے۔ دونوں کا بچپن دہلی میں گزرا تھا،

حالی کی نواب کلب علی خان سے متعلق نظم میں نثر میں صغر سنی کی خوشگوار یادوں کی طرف اشارہ ملتے ہیں ان کے نواب ہوتے ہی حالی کو دربار رام پور سے تعلق پیدا کرنے کا پھر خیال پیدا ہوا اور حالی نے بہت محنت سے ایک عربی قصیدہ نواب کلب علی خان کی شان میں اور ایک فارسی درخواست میں اپنی روداد تحریر کر کے غالب کے توسط سے نواب صاحب کو ارسال کی یہ ۴۳ شعر کا عربی قصیدہ ہے۔ ایک شعر میں کلب علی خان کو ابن یوسف کے نام سے یاد کیا ہے وہ کہتے ہیں۔

فال ابن یوسف نولہٗ بالخلق دون سوالہ

طویل فارسی کی درخواست ہے۔ جس میں حالی نے اپنی مالی مشکلات اور دربار رام پور سے متعلق پر لطف پیرائے میں روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں

"میرے اور آپ کے خاندان کے دیرینہ تعلقات ہیں میں اس سے قبل بھی آپ کے والد بزرگوار کی شان میں ایک قصیدہ ارسال کر چکا ہوں اس وقت بالکل تہی دست اور سخت مالی مشکلات کا شکار ہوں۔

پیش از مسند آرائی بندگان حضور قصیدہ متضمن مدح حضرت فردوس مکان۔ بوساطت بعض از اعیان حسن پور گزارش کردہ۔ ... از عرضی دعا گو ظفر الیدین الطاف حسین مقیم دہلی متصل حوض قاضی مکان حکیم احسن اللہ خاں یہ درخواست اور قصیدہ غالباً ۱۸۶۵ء میں حالی نے اپنے استاد مرزا غالب کے حوالے کیا۔ آپ اپنی سفارش اور میرے تعارف کے ساتھ نواب صاحب تک پہنچا دیں یہ بات بھی خیال میں رکھنے کی ہے کہ حالی اور غالب کی شناسائی ۱۸۵۳ء سے شروع ہوئی ہے۔ اور اس وقت تک تقریباً ۱۲ سال گزر چکے تھے۔ اس کے باوجود غالب نواب صاحب کی بجائے میر منشی افسر اعلیٰ محکمہ خفیہ ریاست رام پور کو لکھتے ہیں۔ منشی صاحب، سعادت و اقبال نشان منشی سیل چند صاحب طال عمرہ تین صاحبوں نے اطراف و جوانب سے تین قصیدے میرے پاس بھیجے ہیں حیران ہوں کہ کیا کروں۔ اگر حضور میں نہ گزرانوں اور ان کو لکھوں کہ میں نے گزران دیئے تو جھوٹ بولنا ہوتا ہے اور میں جھوٹ سے بیزار ہوں۔ گزرانتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے ادب رخصت نہیں دیتا ناچار تینوں قصیدے تمہارے پاس بھیجتا ہوں یہی ان صاحبوں کو لکھوں گا کہ میں نے میر منشی کے حوالے کر دیئے۔ حالی تخلص مولوی الطاف حسین سن پت کے رئیس۔ (لے مکاتیب غالب صفحہ ۱۱۰، ۱۱۱) نواب مصطفیٰ خان کے رفیق۔ قصیدہ عربی ..... الخ

(۱) غالب کے اس سفارشی خط نے کئی سوال پیدا کر دیئے ہیں کیا دس بارہ سال کے شاگرد کا صحیح وطن بھی غالب کو معلوم نہ تھا جو وہ پانی پت کے بجائے سن پت تحریر کرتے ہیں۔ ممکن ہے یہ لغزش قلم ہو؟۔

(۲) حالی مفلوک الحال تھے مالی مدد کے خواستگار تھے مگر غالب رئیس لکھ رہے ہیں؟

(۳) حالی غالب کی شاگردی پہ ناز کرتے تھے۔ غالب اس کا حوالہ نہیں دیتے۔ شیفتہ کا رفیق لکھتے ہیں۔ یہ حالی کا سفارشی خط حالی کی منشاء و مقصد کے بالکل منافی تھا۔؟

اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ حالی غالب کی عظمت کے جتنے معترف تھے غالب نے حالی کی صلاحیت اور خلوص نیت کو اتنی اہمیت نہیں دی اور نہ دیگر شاگردوں کی طرح ان کو اپنی نظم و نثر میں قابل التفات خیال کیا۔ مکاتیب غالب میں ایک بھی خط حالی کے نام دریافت نہیں ہو سکا ہے۔ غالب نے صرف شیفتہ کے نام ایک فارسی قطعہ میں ضمناً حالی کا نام لیا ہے۔

سرکاری ریکارڈ سے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ قصیدہ نواب صاحب کی نظر سے گزرا یا نہیں۔ اس پر کیا کارروائی ہوئی۔

اپریل ۱۸۶۹ء میں نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کا انتقال ہو گیا اسی دوران حالی اور سرسید میں تعلقات پیدا ہو گئے اور حالی کو دیسی ریاست کی بجائے گورنمنٹ بک ڈپو لاہور میں علمی جگہ پر ملازمت مل گئی۔ جو حالی کے واسطے بہت مفید ثابت ہوئی اور اس ملازمت نے ان کی زندگی کا رخ موڑ دیا۔ یہاں حالی نے اقوام مغرب کی برتری کے علل و اسباب اور ادب و زندگی میں ارتباط کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اور پھر قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور نثر و نظم میں ایسے شہکار پیش کیے جس نے قوم کو جھنجھوڑ دیا۔

لاہور کی ملازمت سے قبل حالی نے قدیم طرز کی تصانیف عربی رسالۂ مولود شریف، تریاق مسموم جیسی کتابیں لکھی تھیں اس کے بعد قوم کو ایک نئی راہ دکھائی۔ وہ کہتے ہیں۔

حالی اب آؤ پیرویٔ مغربی کریں　　بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے

اس عہد میں ہندوستانی ادب اور شاعری میں ماورائی تصورات موہوم محبوب کی تلاش اور جگ بیتی کا بیان تھا۔ حالی نے اس کو آپ بیتی بنا دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ

کچھ قوم کی ہم سے سوگواری سن لو　　کچھ چشم جہاں میں اپنی خواری سن لو

افسانۂ قیس و کوہکن یاد نہیں　　چاہو تو کتھا ہم سے ہماری سن لو

حالی کی سرسید تحریک سے وابستگی اور رجعت پسندوں سے محاذ آرائی نے ان کو ترقی پسند نواب کلب علی خان سے بہت قریب کر دیا پہلے حالی دربار رام پور میں رسائی کی صرف سوچا کرتے تھے۔ لیکن اب حالی دربار رام پور میں غالب سے بلند پایہ مقام پر فائز ہو گئے نواب کلب علی خان سرسید کے دوست اور ان کی تحریک کے زبردست حامی تھے۔ ان کے بارے میں گارساں دتاسی فرانسیسی متوفی ۱۸۷۸ء اپنے خطبات میں لکھتا ہے[۱] (خطبات دتاسی صفحہ ۷۰۹، ۸۶۵، ۸۸۰ مطبوعہ انجمن ترقی اردو ۱۹۳۵ء اودھ اخبار جولائی ۱۸۶۹ء)

ہندوستان کے روشن خیال نوابوں میں نواب　　کلب علی خان نہایت تعلیم یافتہ علوم و فنون سے دل چسپی لینے والے شخص ہیں۔ انہوں نے متعدد اسکول قائم کرائے ہیں جن میں ہندوستانی کی تحصیل پر خاص زور دیا جاتا ہے۔ نواب صاحب تعلیم نسواں کے بھی حامی ہیں۔ ان کی ریاست میں۔ لڑکیوں کی تعلیم کے متعدد مدارس ہیں۔ نواب صاحب اخبارات و رسائل سے بھی دلچسپی لیتے ہیں۔ آپ نے اخبار "دبدبۂ سکندری"[۱] جاری کرایا ہے آپ چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں مشین کے رواج کو فروغ ہو۔ ہندوستانی اخبارات نواب صاحب کی روشن خیالی کے معترف ہیں میرٹھ کے اخبار میں انکی مدح میں ۸۰ اشعار کا قصیدہ نقش کیا گیا ہے۔ (۱؎ پہلا شمارہ ۵ اکتوبر ۱۸۶۶ء کو شائع ہوا)

نواب کلب علی خان حالی کے علم و فن کے ساتھ ساتھ ان کے زہد و تقویٰ اور نیکی و بزرگی کے بھی معترف تھے اس کے برعکس آپ کو غالب کی سیرت و کردار سے کوئی دلچسپی نہ تھی غالباً اسی وجہ سے جب نواب صاحب ۱۸۶۵ء میں بیمار ہو گئے تو انہوں نے اپنے دیگر دوست احباب کے ساتھ حالی سے بھی دعائے صحت کی درخواست کی اور داغ کے واسطے سے دہلی کے مزارت پر کافی نذر و نیاز صدقہ و خیرات میں دولت صرف کی۔ (۱؎ انشاء داغ مرتبہ احسن مارہروی مطبوعہ ۱۹۴۱ء صفحہ ۲۰)

نواب صاحب کے اس درخواست کے جواب میں حالی تحریر کرتے ہیں[۱]۔

بعد از تقدیم و ظائف خیر اندیشی و دعائے صحت و سویت مزاج اقدس اعلیٰ۔۔ بحرمت صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام دعا را۔۔

دوالقضا فرمودہ است۔ اللہ معکم اینما کنتم۔ (مکاتیب حالی صفحہ ۱۱۵ ۱۱۸۔)

اس کے برخلاف غالب نواب صاحب کو شکایتاً تحریر کرتے ہیں کہ۔

"کل برخوردار نواب مرزا داغ کی تحریر سے معلوم ہوا کہ حضرت کا مزاج اقدس ناساز ہو گیا" (دیوان حالی صفحہ مکاتیب حالی بحیثیت شاعر۔

حالی نے ۱۸۷۳ء (۱۲۹۰ھ) کو نواب کلب علی خان کی شان میں ایک طویل اردو قصیدہ تحریر کیا جس کی بابت اپنے دیوان میں لکھتے ہیں "میں نے یہ قصیدہ نواب ممدوح کی شان میں اس وقت لکھا تھا جب وہ مدرسۃ العلوم کا پیٹرن ہونا منظور کر چکے تھے۔ اور بارہ سو روپیہ کی جاگیر مدرسہ کو دینا منظور کر چکے تھے۔ اس قصیدے کے ۱۲۹ اشعار ہیں کچھ حصہ ضائع ہو گیا۔۔۔ یہ قصیدہ دیوان حالی کے ساتھ اردو قصیدہ نگاری میں کافی اہمیت رکھتا ہے۔

نواب صاحب اور حالی میں خط و کتابت کے ساتھ ساتھ تحفہ و تحائف کا لین دین بھی تھا۔ نواب صاحب نے ۱۸۸۳ء میں حالی کو نواب مرزا داغ کے ہاتھ اپنی کچھ تصانیف ہدیہ کے طور پر بھیجیں جس کے جواب میں حالی تحریر کرتے ہیں۔

عالم پناہا۔ سہ روز است کہ بعد یک ماہ سفر پورب کہ در اوائل رمضان فجادہ بجسب ضرورت اتفاق افتادہ بود بدہلی رسید وہ دو نسخہ اکسیر اعظم یکے درۃ التاج و دیگر دشنبوئے خاقانی بتوسط مکرمی مرزا داغ برعزد دم۔"

اس عہد میں حالی کے تعلقات دربار رام پور سے قریب ہوتے گئے (ضمیمہ اردو کلیات حالی صفحہ ۱۰۹) سرکاری ریکارڈ ریاست رام انہوں نے ۱۸۸۸ء میں نواب کلب علی خان کی شان میں ۸۰ اشعار کا ایک ایک طویل فارسی قصیدہ لکھا جس کے بارے میں خو رقم طراز ہیں۔ (ضمیمہ اردو کلیات حالی صفحہ ۲۳، ۲۴)

اس قصیدے کی تمہید اس وقت لکھی گئی تھی جبکہ شاعرانہ خیالات میں پہلے ہی پہل انقلاب پیدا ہوا تھا اور مبالغہ سے نفر ہونے لگی تھی اُنہی دنوں میں پہلا دربار قیصری منعقد ہونے والا تھا جو ۱۸۷۷ء میں بمقام دہلی وقوع میں آیا کہ اس تمہید کے بعد کسی ایسے قصیدے کی بنیاد ڈالی جائے جس میں بقدر امکان مبالغہ سے احتراز کیا جائے چونکہ حضور نواب صاحب ممدوح سے فی الجملہ تعارف تھا اور انہوں نے سرسید کی امداد میں سب سے پہلے سبقت کی تھی۔ اور دربار دہلی میں ان کے شریک ہونے کی قوی امید تھی۔ اس لئے انہیں کو اس قصیدے کا ممدوح قرار دیا گیا اگرچہ وہ علالت کی وجہ سے شریک دربار نہ ہو سکے اور قصیدہ ان کی خدمت میں بوجہ دل خو پیش نہ ہو سکا۔

اس قصیدے کا ایک شعر ہے۔

درود حضرت نواب در دہلی بداں ماند | کہ آب رفتہ سوئے آبدان باز آید از دریا

اس پر حالی کا یہ نوٹ ہے۔

یہ اشارہ ہے اس زمانے کی طرف جبکہ نواب ممدوح کے والد ماجد نواب یوسف علی خان مرحوم دہلی میں بہ حالت طالب مقیم تھے۔ اور نواب ممدوح صغر سن میں ان کے ساتھ یہیں رہتے تھے یہ حالی کی حب الوطنی تھی کہ دربارہ دہلی میں بجائے انگ حکمران کے جس سے انعام و اکرام ملنے کی زیادہ امید تھی ایک ہندوستانی رئیس کو اپنے قصیدہ کا ممدوح بنایا اور ہندوستانی

...ں ایک نئی روایت قائم کی

تقریباً بیس سال تک حالی اور نواب کلب علی خاں میں مراسلت اور یگانگت باقی رہی ۲۳ مارچ ۱۸۸۷ء (۱۳۰۴ھ) کو نواب ...یب علی خاں کا انتقال ہوگیا لیکن اس دوران حالی کے جو مراسم ریاست رام پور اور اہلِ رام پور سے قائم ہوگئے تھے وہ برقرار رہے۔ ...ور فروری ۱۸۸۹ء میں نواب حامد علی خاں تخت نشین ہوئے تو انھوں نے دیگر اہلِ علم اور خیر خواہانِ ریاست رام پور کے ساتھ حالی کو رام پور ...نے کی دعوت دی جس کے سلسلے میں حالی نے ۲۰ فارسی اشعار کا ایک قطعۂ تہنیت پیش کیا اور اور کچھ عرصہ بعد خود رام پور تشریف لائے ...س قطعہ کے اس شعر پر۔ مہرباں بر خود گمانش کردہ ام تا چہ تعبیر آرد ایں فرخندہ خواب ۔ حالی کا یہ نوٹ ہے۔

مسند نشینی کے چند سال بعد نواب ممدوح نے خاکسار کو رام پور میں یاد فرمایا تھا اس وقت اوّل یہ قطعہ بھیجا تھا اس کے ...بعد راقم خود گیا۔

حالی کے کچھ قریبی عزیز دار رام پور میں ملازم تھے کچھ دوست احباب بھی تھے اور کچھ شاگرد و عقیدت مند بھی تھے دربار رام پور ...ں حالی کو ایک معزز مقام حاصل تھا اسی وجہ سے خطوط حالی میں کثرت سے رام پور کا ذکر ہے اور حالی اہلِ رام پور کی ہر خوشی میں خوش اور ...ر دکھ میں رنجیدہ نظر آتے۔

وہ ۱۵ اگست ۱۸۹۸ء کو خواجہ تصدق حسین صاحب کو لکھتے ہیں

رام پور کی امداد کا حال تمہاری تحریر سے نیز پیسہ اخبار سے مفصّل معلوم ہوا میں نہیں جانتا کہ یہ سید احمد کی روح کا تصرف ...ہے یا مسلمانوں کے دن پھرنے والے ہیں کہ ایک مسلمان رئیسِ با اختیار کو کالج کے ساتھ اس قدر ہمدردی پیدا ہوتی ہے خدا تعالیٰ حکیم اجمل خاں[۱] ...ر نوب محمد اسحاق خاں کو جزا دے یہ سب ان کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

...در رام پور)

۱۸۹۹ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ۔ رام پور جو پارسل روانہ کئے تھے وہ وہاں پرسوں پہنچ گئے .... رام پور سے خطوط ...تے ہیں ان میں وبائی ہوا کی شکایت ہے۔ خدا اپنے بندوں پر رحم کرے۔ رام پور کے علاقہ میں ہوائی تار تک نہیں جاتا اس لئے ...سٹ آفس نے تار بھیجنے سے انکار کر دیا۔ عجب تشویش میں جان گرفتار ہے۔ کل سے کام کاج سب بند ہیں۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں کہ عبد العلی کا خط رام پور سے آیا ہے وہ لکھا ہے اب میں پٹواگی سے بدل کر رام پور شہر میں آگیا ہوں ...میری تلّی بڑھ گئی ہے۔ اس سبب سے تندرست نہیں رہتا۔

۱۹۰۰ء میں حالی نے شکریہ والیٔ رام پور کے عنوان سے ایک اہم ترکیب بند لکھا وہ ان کی بیماری کی وجہ سے نامکمل رہا۔

اس ترکیب بند میں ۵۲ اشعار ہیں اور اس میں حالی نے رام پور و اہلِ رام پور کی خوبیاں تعلیم کی اہمیت اور جاہلانہ رسموں کے خاتمہ ...ڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ یہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ ستمبر ۱۹۰۰ء میں حالی نے خود پڑھا۔ حالی کی ...پور آمد و رفت کا سلسلہ نواب کلب علی خاں کے وقت سے جاری تھا۔ ۲۵ دسمبر ۱۸۹۶ء کو حالی لکھنؤ سے دورے پر رام پور تشریف ...ئے اس وقت ان کی طبیعت خراب تھی پھر بھی کچھ وقت کتب خانہ میں صرف کیا اور معائنہ بک پر اپنے تاثرات قلم بند کئے۔ ...ی کی رام پور میں آمد سے پہلے ۲۳ دسمبر ۱۸۹۶ء کو کتب خانہ میں چوری ہو گئی تھی اور کچھ اہم نادرات غائب ہو گئے تھے۔

...لہ مکتوبات حالی صفحہ ۱۵۲ جلد دوم) [۲] راقم کا مضمون حکیم اجمل خاں

حالی اس واقعہ سے بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے خاص طور پر اس واقعہ کا ذکر کیا اور کچھ تجاویز پیش کیں تاکہ اس قسم کے واقعات دوبارہ نہ ہو سکیں حالی کو چونکہ رام پور کے علمی و سرکاری حلقہ میں باعزت مقام حاصل تھا اسی بنا پر ان کی تجاویز کو عملی جامہ پہنایا گیا (اور نتیجہ کے طور پر ان تجاویز نے اس کتب خانہ کی عوامی حیثیت کو نقصان پہنچایا اور علامہ شبلی وغیرہ کا اپریل ۱۸۹۱ء کا دستور کتب خانہ معطل کر دیا گیا اور انتظامیہ نے حقوق واپس لے کر کتب خانہ کو کتابوں کا ایک خفیہ گودام بنا دیا۔ حالی لکھتے ہیں۔

میں نے آج اس کتب خانہ کو دیکھا اگرچہ بسبب ملالت کے جس قدر جی چاہتا تھا اس قدر میں کتب خانہ میں نہیں ٹھہرا مگر مولوی مہدی حسن خاں صاحب جو مہتمم کتب خانہ ہیں ان کی رہبری سے تھوڑی سی دیر میں مجھ کو کتب خانہ کی ترتیب و تقسیم و انتظام اور ہر قسم کی کتابوں کی تعداد اور دیگر ضروری مراتب سے کسی قدر واقفیت حاصل ہو گئی۔ اس زمانے میں مسلمانوں کا علمی اور دینی کتابوں کے ذخیرے خاص کر ہندوستان میں گردش روزگار سے برباد ہو گئے ہیں۔ یہ کتب خانہ "صانہا اللہ من جمیع الآفات" فی الواقع ایک غنیمت کبریٰ اور مسلمانوں کے لئے باعث افتخار ہے نہایت افسوس ہے کہ پچھلے دنوں میں یہاں سے چند نفیس اور قیمتی کتابیں چوری ہو گئیں جن میں سے صرف تین کتابیں دستیاب ہوئیں۔ باقی کتابوں کا اب تک کچھ پتہ نہیں چلا جو قواعد کتب خانہ کی حفاظت اور نگرانی کے لئے مقرر کئے گئے ہیں وہ بہت عمدہ ہیں۔ مگر میرے نزدیک ان میں یہ قاعدہ اور اضافہ ہونا چاہئے کہ کسی شخص کو کتب خانے سے باہر کتاب لے جانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ جہاں تک مجھ کو معلوم ہے، حضرت خلد آشیاں کے عہد میں جن کے حسن توجہ سے یہ بے بہا دولت کا خزانہ جمع ہوا ہے۔ یہی قاعدہ تھا کہ کوئی کتاب لائبریری سے باہر نہیں جانے پاتی تھی۔ اور سنا گیا ہے کہ کتب خانہ برٹش میوزیم اور یورپ کے تمام کتب خانوں میں بھی یہی قاعدہ جاری ہے۔ کہ کوئی شخص لے کر باہر جانے کا مجاز نہیں۔

اس کے سوا یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ لائبریری میں الماریوں کے سوا جتنی آئینوں کی جوڑیاں چڑھی ہیں وہاں ایک ایک اور جوڑی بغیر آئینوں کے چڑھا دی جائے تاکہ جیسا ناگوار واقعہ پچھلے دنوں میں گزرا ہے، ویسا پھر ظہور میں نہ آئے، میں کتب خانے کے حق میں اس کو ایک بڑی فال نیک سمجھتا ہوں کہ اس کا انتظام اور اس کی نگرانی جناب حکیم محمد اجمل خاں صاحب دہلوی سے متعلق کی گئی ہے

)

حکیم صاحب جو علم و فضل کے ساتھ ساتھ نہایت علم دوست اور کتاب کے قدر شناس اور صاحب عقل سلیم ہیں امید ہے کہ ان کے حسن توجہ سے کتب خانہ کی حالت روز بروز ترقی کرے گی۔ مولوی مہدی علی خاں صاحب جو تمام لائبریری کی ناطق فہرست ہیں اور جن کی کارگزاری کے سب لوگ مداح و ثنا خواں ہیں سرکار دولت مدار سے ان کی زیادہ قدر افزائی فرمائی جائے گی۔

انتظامیہ کمیٹی میں تجاویز حالی پر غور کیا گیا اور رزولیوشن پاس کیا گیا۔

(۱) مہدی علی خاں انچو یلدار کتب خانہ کی تنخواہ میں اضافہ کیا گیا

(۲) کتابوں کو گھر پر لے جانے کا سلسلہ بند کر دیا گیا۔

(۳) عوام کا داخلہ کتب خانہ میں ممنوع قرار دیا گیا۔

حالی سے ایک سال بعد ۱۶ اکتوبر ۱۸۹۶ء کو اکبر الہ بادی رام پور میں کتب خانہ دیکھنے تشریف لائے وہ معائنہ بک میں لکھتے ہیں

(۱) افسوس کے ساتھ یہ بات دریافت ہوئی ہے کہ پبلک کو عام اجازت یہاں آنے اور کتابوں کے دیکھنے کی نہیں ہے۔

(لہ معائنہ بک رضا لائبریری رام پور دستور العمل کتب خانہ مطبوعہ پریس ۱۸۹۱ء) (۲) ... [illegible]

۲۔ یہ بھی افسوس ہے کہ اس کتب خانہ کی وسعت اور عظمت اور اس کے نادرات کا حال پبلک پر مشتہر نہیں کیا جاتا۔

۳۔ اس کتب خانے میں ہر قسم کی کتابیں بہت کثرت سے موجود ہیں۔ البتہ نو تصنیف شدہ انگریزی وغیرہ کتابوں کا اضافہ بلاشبہہ توجہ کے لائق ہے۔

لیکن ایسے لوگوں کے آنے جانے کی زیادہ ضرورت ہے۔ جو ان کتابوں سے فائدہ اٹھا سکیں۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ایسی جماعت کو موجود کرے جو ان کتابوں سے استفادہ کرے ورنہ نور آفتاب سے بے بصر کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ فرمارہے تھے۔ خدا ان کو جزائے خیر دے۔

میں نے صرف ایک نوجوان نجم الغنی خان کو دیکھا کہ وہ نہایت مصروفیت سے کسی تاریخی واقعہ کی تحقیق کے لئے کتابوں کو ملاحظہ کر رہے تھے۔

اکبر کی دعا قدرت نے قبول کی اور یہ نوجوان عالم نجم الغنی خان اکتوبر ۱۹۲۳ء میں ناظم کتب خانہ مقرر ہوئے انہوں نے اس کتب خانے کے تن مردہ میں جان ڈال دی عوام کو عام استفادہ کی اجازت دی۔ اخبارات و رسائل مذاق عام کے کثرت سے منگا دیئے خواص کو کتابیں گھر پہ لے جانے کی اجازت دے دی اوقات کتب خانہ میں اضافہ کیا۔

والی ریاست کے علاوہ حالی کے تعلقات رام پور کے علمی حلقوں میں کافی وسیع تھے وہ اپنے ایک خط میں مولانا محمد علی جوہر رام پوری کو لکھتے ہیں

پانی پت: مئی ۱۹۱۳ء

عزیزی عزیز الودود دام بقائکم

"سلام علیکم" و علی من لدیکم۔ تار اس وقت پہنچا۔ جواب چونکہ طولانی تھا اس لیئے تار کے ذریعہ نہیں بھیجا ہمدرد کے باقاعدہ جاری ہونے کی خبر سے اس لیئے بے انتہا مسرت ہوئی کہ میری زندگی میں دلی کو یہ عزت حاصل ہونے والی ہے کہ اردو کا عمدہ ترین پرچہ یاس و امید کی سخت کشمکش کے بعد وہاں سے جاری ہونے والا ہے۔

غالباً آپ کو یاد ہوگا کہ جب پہلی ہی بار ہمدرد کے نکلنے کا چرچا ہوا تو میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کے خیال سے ہمدرد میں درج کرنے کے لیئے مولانا نذیر احمد مرحوم کی سوانح عمری مرتبہ سید افتخار عالم پر ریویو لکھ کر دفتر کامریڈ میں مولانا عبدالحلیم شرر کی خدمت میں بھیج دی تھی۔۔۔۔ اگرچہ یہ ریویو کچھ چیز نہیں ہے مگر ایک قریب المرگ آدمی کے منہ سے جو الفاظ برے یا بھلے نکل جاتے ہیں انہیں کو غنیمت سمجھا جاتا ہے۔ میں فی الواقع یہ مضمون لکھنے کے قابل نہیں رہا۔

رات گزری ہو چکا دور نشاط — طے ہوئی بس اب کوئی دم میں بساط
کوچ کی حالی کرو تیاریاں — ہے قوٰی میں دمبدم اب انحطاط

دونوں رباعیاں تو مجھے یاد ہیں وہ اس خط میں لکھ دیتا ہوں اگر مناسب ہوں تو ان کو بھی اول پرچہ میں کسی موقع پر چھپوا دیجیئے گا۔ رباعی ملا

تمغوں کی ہوس نہ یاں خطابوں کی طلب — اک ملک کی خدمت کا ہے تمنا یارب
ہمدرد کو اسم با مسمیٰ کیجیو — اس نام کی لاج تیرے ہی ہاتھ ہے اب

ملاحظہ ہو معائنہ بک رضا لائبریری مرتبہ علامہ نجم الغنی خان مرتبہ راقم مطبوعہ ناظم پریس رام پور ۱۹۷۰ء

اقوام میں زندگی کی ہے روح جہاں
چونک اٹھتے ہیں ایک ہاں میں پیر و جواں
کرتی نہیں وحی مردہ قوموں میں وہ کام
جو کام اک کارٹون کرتا ہے وہاں

حالی کے بڑھاپے کا آخری بڑا حادثہ مسجد کان پور کے سلسلہ کا قتل عام تھا جس میں انگریزوں نے نہتے ہندوستانیوں پر اپنے اسلحہ کا مظاہرہ کیا۔

اس المیئے نے حالی کو بے حد دل گرفتہ کر دیا۔ اور انہوں نے چند رباعیاں لکھ کر اہل وطن کو آخری پیغام دیا۔ ان میں حالی نے ہندو مسلم اتحاد" اور محبت میں ایک دوسرے کے شریک ہونے کی تلقین کی ہے۔

یہ رباعیاں ۸ اکتوبر ۱۹۱۳ء کے ہمدرد میں شائع ہوئیں اس کے بعد حالی کی زبان سے کوئی شعر نہیں سنا گیا۔ وہ کہتے ہیں

صد شکر وطن سے کوچ نفرت نے کیا
گھر اہل وطن کے دل میں الفت نے کیا
تقریروں سے ہوسکا نہ تحریروں سے
جو کار نمایاں کہ مصیبت نے کیا۔

تائید میں حق کی جو بلا آتی ہے۔
ساتھ اپنے بہت سی برکتیں لاتی ہے
بچھڑے ہوئے دوستوں کو ملواتی ہے
روٹھے ہوئے بھائیوں کو منواتی ہے۔
سکوتِ مجسم تجب کی جا ہے۔
خموشی تو ضرب المثل موت کی ہے۔

اس کے بعد حالی سخت علیل ہو گئے اور زبان بند ہو گئی۔ خواجہ عبدالحمید دہلوی ان کی عیادت کو گئے تو حالی کو دیکھ کر رو دیئے اور انہوں نے فی البدیہہ یہ قطعہ کہا۔

یہ احوال حالی کا خواجہ سے کہدو
ہے زندہ مگر اس کو چپ لگ گئی ہے
یہ حالی نہیں اس کا بت ہو تو ہو
مگر کس بلا کی یہ کاریگری ہے۔

آخر کار انسانوں کی بستی سے اس فرشتہ نے ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو ۷۷ سال کی عمر میں کوچ کیا۔ حالی کی وہ پہلی درخواست تھی جو انہوں نے نواب یوسف علی خاں والی رام پور سے کی تھی اور وہ ان کا آخری پیغام تھا۔ جو مولانا محمد علی جوہر رام پور کے توسط سے قوم کو دیا اور اخبار ہمدرد میں ان رباعیوں کی شکل میں شائع ہوا۔ یہ بات پورے اعتماد سے کہی جا سکتی ہے کہ حالی نے نظم و نثر عربی فارسی اور اردو میں جس خوش عقیدگی کا اظہار اہل رام پور اور والئی رام پور سے کیا ہے کسی نے نہیں کیا۔

(بشکریہ "قومی جنگ" رام پور)

خرقہ پوش

خواجہ الطاف حسین حالی

اگر راست گوئی کی جرأت نہیں | تو جھوٹی ہیں واعظ کی لسّانیاں
منادی نہیں حق کی کچھ دل لگی | بہت یہاں ہیں درکار قربانیاں
لگے بڑھنے جیسے کہ ہوش و خرد | لگیں ساتھ بڑھنے پریشانیاں
بڑھاپے کی دانائی لے کر کوئی | بدل دے وہ بچپن کی نادانیاں
ہو ناپید جو ملک میں اتفاق | ہیں آبادیاں واں کی ویرانیاں
بھریں خرقہ پوش اب کوئی اور روپ | یہ شکلیں تو ہیں جانی پہچانیاں
کھلونے پہ مرتے ہیں سر پھوڑ پھوڑ | یہ داناؤں کی یاں ہیں نادانیاں
بنی نوع کے دوست کرتے ہیں آہ | بنی نوع پر آتش افشانیاں
کلیجے کے ٹکڑوں سے ہوتی ہیں یاں | سدا چیل کوؤں کی مہمانیاں
جہاں سوزیوں کا ہے گویا کہ نام | جہاں داریاں اور جہاں بانیاں
ڈبوتی ہیں آخر کو منجدھار میں | یہ فرعونیاں اور ہامانیاں۔

محبت کا دنیا کے حالی مآل
پشیمانیاں ہیں پشیمانیاں

(بشکریہ "قومی جنگ" رام)

روحِ انتخاب

بعض لوگ ان تمام اخلاقی و اجتماعی اصولوں کو تسلیم کرتے ہیں جن کی بنیاد پر زنا کو گناہ قرار دیا گیا ہے مگر ان کا اصرار یہ ہے اس کے خلاف تعزیری اور انسدادی تدابیر اختیار کرنے کے بجائے صرف اصلاحی تدابیروں پر اکتفا کرنا چاہیئے۔ وہ کہتے ہیں کہ تعلیم و تربیت کے ذریعہ سے لوگوں میں اتنا باطنی احساس ان کے ضمیر میں اتنی طاقت اور ان کے اخلاقی وجدان میں اتنا زور پیدا کر دو کہ وہ اس گناہ سے رک جائیں ورنہ اصلاحِ نفس کے بجائے تعزیری اور انسدادی تدابیر اختیار کرنے کے معنی تو یہ ہوں گے کہ تم آدمیوں کے ساتھ بچوں کا سا سلوک کرتے ہو بلکہ آدمیت کی توہین کرتے ہو۔ ہم بھی اُن کے ارشاد کو اس حد تک تسلیم کرتے ہیں کہ اصلاحِ آدمیت کا اعلیٰ اور اشرف طریقہ وہی ہے جو وہ بیان فرماتے ہیں۔ تہذیب کی غایت فی الحقیقت یہی ہے کہ افراد کے باطن میں ایسی قوت پیدا ہو جائے جس سے وہ خود بخود سوسائٹی کے قوانین کا احترام کرنے لگیں اور خود ان کا اپنا ضمیر ان کو اخلاقی ضوابط کی خلاف ورزی سے روک دے اسی غرض کے لئے افراد کی تعلیم و تربیت پر سارا زور صرف کیا جاتا ہے مگر کیا فی الواقع تہذیب اپنی اس غایت کو پہنچ چکی ہے کیا حقیقت میں تعلیم اور اخلاقی تربیت کے ذرائع سے افرادِ انسانی کو اتنا مہذب بنایا جا چکا ہے کہ ان کے باطن پر کامل اعتماد کیا جا سکتا ہو۔ اور اجتماعی نظام کی حفاظت کے لئے خارج میں کسی انسدادی اور تعزیری تدبیر کی ضرورت باقی نہ رہی ہو زمانۂ قدیم کا ذکر چھوڑیئے کہ آپ کی زبان میں وہ تاریک دور تھا یہ بیسویں صدی کا یہ قرنِ منوّر" آپ کے سامنے موجود ہے۔ اس زمانے میں یورپ اور امریکہ کے مہذب ترین ممالک کو دیکھ لیجیئے جن کا ہر باشندہ تعلیم یافتہ ہے۔ جن کو اپنے شہریوں کی اعلیٰ تربیت پر ناز ہے کیا وہاں تعلیم اور اصلاحِ نفس نے جرائم اور قانون شکنی کو روک دیا ہے۔ کیا وہاں چوریاں نہیں ہوتیں۔ ؟ ڈاکے نہیں پڑتے، قتل نہیں ہوتے جعل و فریب ظلم اور فساد کے واقعات پیش نہیں آتے کیا وہاں پولیس، عدالت، جیل، تمدنی احتساب کسی چیز کی بھی ضرورت باقی نہیں رہی۔ کیا وہاں افراد کے اندر اخلاقی ذمہ داری کا اتنا احساس پیدا ہو گیا ہے کہ اب ان کے ساتھ بچوں کا سلوک نہیں کیا جاتا؟ اگر یہ واقعہ نہیں ہے اگر اس روشن زمانہ میں بھی سوسائٹی کے نظم و آئین کو محض افراد کے اخلاقی وجدان پر نہیں چھوڑا جا سکا ہے اگر اب بھی ہر جگہ آدمیت کی یہ توہین ہو رہی ہے کہ جرائم کے سدِّ باب کیلئے تعزیری اور انسدادی دونوں قسم کی تدبیریں استعمال کی جاتی ہیں تو آخر کیا وجہ ہے کہ صرف صنفی تعلقات ہی کے معاملہ میں آپ کو یہ ناگوار ہے۔ ان بچوں سے بڑوں کا سا سلوک کیے جانے پر آپ کو اصرار اور اتنا اصرار ہے ؟ ذرا ٹٹول کر دیکھئے کہیں دل میں کوئی چور تو چھپا ہوا نہیں ہے کہا جاتا ہے کہ جن چیزوں کو تم شہوانی محرکات قرار دے کر تمدن کے دائرے سے خارج کرنا چاہتے ہو وہ سب آرٹ اور ذوقِ جمال کی جان ہیں۔ انہیں نکال دینے تو انسانی زندگی میں لطافت کا سرچشمہ ہی سوکھ کر رہ جائے گا لہٰذا تمہیں تمدن کی حفاظت اور معاشرت کی اصلاح جو کچھ بھی کرنی ہے اس طرح کرو کہ فنونِ لطیفہ اور جمالیت کو ٹھیس نہ لگنے پائے ہم بھی ان حضرات کے ساتھ اس حد تک متفق ہیں کہ آرٹ اور ذوقِ جمال فی الواقع قیمتی چیز ہیں جن کی حفاظت بلکہ ترقی ضرور ہونی چاہیئے۔ مگر سوسائٹی کی زندگی اور اجتماعی فلاح ان سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے اس کو کسی آرٹ اور کسی ذوق پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ آرٹ اور جمالیت کو اگر پھلنا پھولنا ہے تو اپنے لئے نشو و نما کا وہ راستہ ڈھونڈیں جس میں اجتماعی زندگی اور فلاح کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکیں۔ جو آرٹ اور ذوقِ جمال، جمالِ زندگی کی بجائے فساد کی طرف لے جانے والا ہو۔ اسے جماعت کے دائرے میں ہرگز پھلنے پھولنے کا موقع نہیں دیا جا سکتا

(بیادِ مودودیؒ، ایشیا لاہور)

NYESONS
حسی سنز

سلیم احمد

جھلکیاں

سلیم احمد صاحب ملک کے معروف و مستند لکھنے والے ہیں، پڑھے لکھے آدمی ہیں مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ طبعاً سنجیدہ شائستہ اور مخلص انسان ہیں ان کی تحریر میں فکر کی گہرائی، قلم کی گیرائی، اور شعور کی سچائی جھلکتی ہے لہجہ کبھی کبھی کھرا اور اظہار گاہے گاہے تلخ ہو جاتا ہے۔ میں نے ہمیشہ اس کو ان کی افتادِ طبع پر محمول کیا ہے جو منافقت اور تصنع سے گریزاں اور اصابتِ رائے کی تمکنت سے بُرّاں

پہلے وہ "جسارت" میں لکھتے تھے اب وہ "حریت" کے لئے مستقل طور پر "جھلکیاں" کے عنوان سے لکھتے ہیں ان کا ۲۵ نومبر ۱۹۸۱ء والا کالم اپنی کمیت و کیفیت کے لحاظ اس قابل ہے کہ ہر شخص جو سوشلزم کے نام نہاد ملمع سے متاثر ہوا ہے اس کو پڑھے اور سوچے کہ فیض و سبط حسن والا گروہ اس ملک کو کس قعر مذلت و عذاب میں ڈھکیلنا چاہتا ہے ——————— مدیر فاران

ایک زمانہ میں آرتھر کوئسلر نے مضامین کا ایک مجموعہ شائع کیا تھا اور اس کا نام رکھا تھا "ایک خدا کی موت"۔ اس مجموعے میں جس خدا کی موت کا ذکر تھا اس کے پجاریوں میں ابھی ہمارے یہاں بہت سے لوگ موجود ہیں۔ مثلاً فیض احمد فیض اور سید سبط حسن وغیرہ۔ سوشلزم کے ان پجاریوں کو ابھی تک نہیں پتہ چلا کہ جس خدا کی وہ پرستش کرتے تھے وہ ایک جھوٹا خدا تھا اور یہ کہ یہ جھوٹا خدا ابھی مر چکا ہے بلکہ مار ڈالا گیا ہے اور اسے مارنے والے کوئی غیر نہیں تھے اس کے اپنے ہی پجاری تھے۔ سوشلزم کو سرمایہ داروں نے نہیں مارا بلکہ خود سوشلسٹوں نے اور اس کے قاتلوں میں سب سے بڑا نام اس کا ہے جو سب سے بڑا پجاری سمجھا جاتا ہے یعنی اسٹالن۔ اسٹالن نے سوشلزم کو مار کر ماسکو میں دفن کر دیا اور اس کی ایک ممی بنائی اب سوشلزم کے نام پر یہی ممی روس پر حکومت کر رہی ہے۔

آرتھر کوئسلر کے مجموعہ میں بہت بڑے ادیبوں کے مضامین شامل تھے یہ سب وہ لوگ تھے جو سوشلزم کے حامی بن چکے تھے اور انقلاب کے اوّلین مداحوں میں تھے انہیں یقین تھا کہ سوشلزم ستم رسیدہ انسانیت کی آخری اُمید ہے وہ سوشلزم کو دنیا کے مصائب کا علاج سمجھتے تھے اور انہیں توقع تھی کہ سوشلزم کی فتح دنیا کے سارے مسائل کو حل کر دے گی لیکن اسٹالن کے دور میں جب انہیں انقلاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا موقع ملا تو انہیں معلوم ہو گیا کہ انہوں نے جو کچھ سوچا

ر کچھ تھا وہ خام خیالی کے سوا اور کچھ نہ تھا وہ سوشلزم کو انسانیت کا منبر سمجھتے تھے اور وہ انسانیت کی صلیب ثابت ہوا

اسٹالن کو مرے ہوئے زمانہ ہو گیا مگر روسی سوشلزم کے کردار میں کوئی تبدیلی نہیں آئی سوشلزم کا سب سے بڑا نعرہ مظلوم انسانیت کی نجات تھا لیکن روسی سوشلزم مظلوم انسانیت کی بجائے خود ظلم کی علامت بن گیا یہاں تک کہ روسیوں کے چینی بھائی چینیوں تک کو پتہ چل گیا کہ روس میں سوشلزم کے نام پر سوشل سامراج حکومت کر رہا ہے۔ اور اس کی روح استبداد سے مختلف نہیں ہے جو ہر سامراج کی فطرت ہوتا ہے۔ ہمارے سوشلسٹ دوست امریکی سامراج کے خلاف نعرے لگاتے ہیں روسی سامراج کے کردار کو نہیں دیکھتے امریکی سامراج اور روسی سامراج میں فرق یہ ہے کہ کفن تو دونوں چراتے ہیں۔ روسی سامراج کان بھی کاٹ لیتا ہے۔

مجھے سوشلزم میں جو بات سب سے زیادہ پسند تھی وہ یہ تھی کہ اس نے تمام دنیا میں ایک نیا جوش ایک نیا ولولہ پیدا کر دیا دنیا کے لاکھوں نوجوان سوشلزم کے نام پر انسانیت کی تعمیر کے خواب دیکھنے لگے ایک ایسی انسانیت جو ہر قسم کے ظلم و استحصال سے پاک ہو گی جس کا اصول مساوات اور عدل ہو گا جو روشنی سے محبت کرے گی اور تاریکی سے نفرت۔ ترقی پسندوں سے اپنے سارے اختلافات کے باوجود میں اس بات کو پسند کرتا تھا کہ وہ خواب دیکھتے ہیں مجھے معلوم تھا کہ یہ ایک جھوٹا خواب ہے یہ کبھی پورا نہیں ہو گا۔ مگر خوابوں کی قدر و قیمت اُن کی تعبیروں میں نہیں دیکھی جاتی خود خوابوں کے حسن میں دیکھی جاتی ہے ترقی پسند کچھ بھی ہوں خواب دیکھتے تھے اور یقیناً یہ ایک بڑا خوبصورت خواب تھا مگر ان خوابوں کو دیکھنے والوں نے ان چالاک خواب فروشوں سے سمجھوتہ کر لیا جو اس کے نام پر اپنی دکانداری چلانا چاہتے تھے خواب دیکھنے والے خواب بیچنے والے بن گئے اور جب روس میں اُن کے خوابوں کی ننگی سولیوں پر ٹانگا جاتا تھا تو ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جو اپنے خوابوں کی موت پر چیخ اٹھتا۔

آج روس افغانستان میں جو کچھ کر رہا ہے کیا اس کا ان خوابوں سے کوئی تعلق ہے جن سے ترقی پسند ہمیشہ اپنی دکانیں سجاتے رہے ہیں؟ کیا یہ ان خوابوں کی موت نہیں ہے۔ کیا روس جو کچھ کر رہا ہے۔! وہ مظلوم انسانیت کی حمایت میں کر رہا ہے؟ ترقی پسند اگر صحیح معنوں میں زندہ ہوتے اگر انہیں سچ مچ اپنے خوابوں سے محبت ہوتی، اگر وہ سوشلزم کے اصولوں پر سمجھوتہ کئے بغیر قائم رہتے تو روس کے خلاف سب سے پہلی آواز ترقی پسندوں ہی کی ہونی چاہیئے تھی کیونکہ سوشلزم کا دشمن تو اب امریکہ نہیں خود روس ہے۔

(بشکریہ حریت)

نظم

تمنا ابدالی۔

تظمین بر نظم علامہ اقبال

دکھاؤں کیسے کسی کو میں اپنا سوز دروں
عجیب کشمکش جبر و اختیار میں ہوں
ابھارتی ہے مجھے میری فکر گونا گوں۔
وہ ایک راز جو مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں
خدا مجھے نفسِ جبرئیل دے تو کہوں

نظارہ جس نے دیا ہے وہی نظر دے گا
صلہ ہنر کا کوئی صاحبِ ہنر دے گا۔
جو خود اثر کا ہے محتاج کیا اثر دے گا
ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا۔
وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں

سکون کیا ہے عنایاتِ حسنِ محبوبی
سرور کیا ہے شرابِ جمال کی خوبی۔
نگاہ کیا ہے اشاراتِ شانِ محجوبی۔
حیات کیا ہے خیال و نظر کی مجذوبی
خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گوناگوں

کہاں چھپے ہیں وہ آنکھوں کو روشنی دے کر
خیال و فکر کو اک شمع آگہی دے کر
جہانِ ہوش کو پیغام زندگی دے کر
عجب مزہ ہے مجھے لذتِ خودی دے کر
وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے آپ میں نہ رہوں

کہاں کہاں لئے پھرتی ہے مجھ کو مستیٔ شوق
مذاق مجھ سے نہ کر اب درازدستیٔ شوق
کہ میری ذات ہے محو وفا پرستیٔ شوق
ضمیر پاک و نگاہِ بلند و مستیٔ شوق
نہ مال و دولتِ قاروں نہ فکر افلاطوں

عجب سرور ملا حسن کی ادا سے مجھے
ملا ہے نور دلِ راز آشنا سے مجھے۔
قریب کر دیا جس نے مرے خدا سے مجھے
سبق ملا ہے یہ معراج مصطفےٰ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

یہ آرزو بھی تمنائے خام ہے شاید۔
کہ اور جلوہ بھی بالائے بام ہے شاید۔
بڑھوں کچھ اور تو میرا مقام ہے شاید
یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید۔
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون۔

سید صباح الدین عبدالرحمان

چودہ صدیاں اور مسلمانوں و عیسائیوں کی تاریخ کا ایک جائزہ

اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کے چودہ سو سال گزر چکے ہیں۔ اس مدت میں عیسائی مبلغین مورخین اور مستشرقین یہ دکھانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کی تاریخ، سفاکیوں، ہولناکیوں، خونریزیوں سے ایسی بھری ہوئی ہے کہ یہ قصائی کی دکان نظر آتی ہے۔

ہیں اُن کی گفتگو کے انداز مجرمانہ

عیسائی مسلمانوں کے خلاف یہ جارحانہ رنگ اختیار کر کے اپنی داغدار تاریخ کی مدافعت کرتے ہیں کیونکہ درحقیقت ان ہی کی تاریخ شروع سے مذبح خانہ بنی رہی۔ یورپ کے فرمانروا چارلس اعظم کی فتوحات کی بڑی دھوم ہے اس نے سیکسن، ایوارڈ وسطی یورپ کے جرمن قبیلوں اور شمالی اٹلی کو اپنے زیرِ نگین کر کے ایک بڑی سلطنت بنائی تھی جب سیکسن اس کے خلاف اٹھے تو اس نے ایک روز ساڑھے چار ہزار سیکسن کو تہ تیغ کیا۔ شمالی سیکسنی اور نارڈل نن جن کو تباہ و برباد کرا دیا۔ وہاں کی عورتوں اور بچوں کو گھسیٹ کر ان کے گھروں سے نکلوا دیا۔ اور ان کو جلاوطن کیا۔ اس کی تفصیل کیمبرج مڈیول ہسٹری جلد دوم میں پڑھی جا سکتی ہے۔ ولیم اول نے ۱۰۶۶ء میں انگلستان کو فتح کیا تو اس کے حکم سے مفتوحہ علاقے میں گھر، کھلیان اور کھیت وغیرہ سب کچھ جلا دیئے گئے۔ ایک لاکھ سے زیادہ مردوں، بچوں، اور عورتوں کو قتل کر دیا گیا۔ لن گارڈ نے تاریخ انگلستان جلد دوم میں لکھا ہے کہ یارک اور درہم کے علاقے اس طرح سے تباہ کر دیئے گئے تھے کہ نو سال تک وہاں کی زمین کھیتی کے لائق نہیں رہی۔ ایڈم نے اپنی پولیٹیکل ہسٹری آف انگلینڈ جلد دوم میں لکھا ہے کہ اس زمانہ میں فاتحین مفتوحین کے ساتھ کسی قسم کی رو رعایت نہیں کرتے تھے۔

سینٹ برتھالومیو ایک مشہور کیتھولک رشی گذرا ہے۔ اس کا میلہ ہر سال ۲۴ اگست کو ہوا کرتا ہے ۱۵۷۲ء میں عین اس میلے کی رات کو فرانس کے بادشاہ چارلس نہم کے حکم سے ملک کے پروٹسٹنٹ قتل کر ڈالے گئے ان کی تعداد صرف پیرس میں پانچ سو معززین اور دس ہزار عوام کی تھی یہ قتل عام تاریخ کا بہت بڑا واقعہ ہے۔

سترویں صدی میں جرمن میں پروٹسٹنٹ اور کیتھولک فرقوں کی جنگ شروع ہوئی۔ جو یورپ کی تیس سالہ جنگ کے نام سے مشہور ہے

یورپ کی بہت سی حکومتیں اس میں الجھ کر رہ گئی تھیں۔ مورخین کا بیان ہے کہ اس لڑائی میں بوہیمیا کے ۳۵ ہزار گاؤں میں سے صرف چھ ہزار باقی رہ گئے تھے۔ بوریا، فرینکونیا اور سوابیا میں غارت گری ایسی کی گئی کہ یہ سارے علاقے تو اداراتی سے تباہ ہو کر ویران ہو گئے۔ جرمنی میں ایک کروڑ ساٹھ لاکھ کی آبادی تھی۔ اس جنگ کے بعد صرف ساٹھ لاکھ رہ گئی۔ اسپینیوں نے میکسیکو اور پیرو پہنچ کر جو مظالم کیے ان کی ہولناک تفصیل پریس کورٹ میں پڑھی جا سکتی ہے۔ ان کے ہاتھوں میں بائبل ہوتی ہے۔ ان کی معیت میں پادری ہوتے ہیں۔ اور وہ مذہب کے نام پر تمام ہولناکیاں بروئے کار لائے جوان کا ذہن سوچ سکتا تھا۔ ڈچ ری پبلک کے مصنف موٹلے نے لکھا ہے کہ ۱۶۵۹ء میں پوپ کے حکم سے نیدرلینڈ کے تیس لاکھ باشندے سولی پر چڑھا دیے گئے۔

۱۹۱۴ء کی پہلی جنگ عظیم میں کیا کچھ نہیں ہوا۔ مشہور مورخ ایچ جی ویلس نے لکھا ہے کہ اس سوا چار سال کی جنگ میں ایک کروڑ آدمی تو میدانِ جنگ میں مارے گئے۔ اور دو ڈھائی کروڑ کی جانیں اس زمانہ کے مصائب میں تلف ہوئیں کروڑوں طرح طرح کی مصیبتوں میں گھرے اور اچھی غذاؤں سے محروم رہے۔ دوسری جنگ عظیم میں اتنی ہی جانیں ضائع ہوئیں۔ اور اسی قسم کے مصائب کا سامنا رہا۔ عیسائیوں کے مظالم کی انتہا اس وقت دیکھنے میں آئی جب انہوں نے ہیروشیما پر ایٹم بم گرا کر اس کے لاکھوں مردوں، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو چشم زدن میں موت کے گھاٹ اس طرح اتار دیا کہ چنگیز اور ہلاکو کی ساری سفاکیاں بھلا دی گئیں۔

ویت نام میں امریکہ کے عیسائیوں نے تیس سال تک جنگ کی۔ لندن کے اخبار ٹائمس کا بیان ہے کہ اس مدت میں امریکی فضائیہ نے اٹھارہ لاکھ ننانوے ہزار چھ سو باسٹھ حملے کیے۔ اسی لاکھ ستائیس ہزار چوراسی ٹن بم گرائے وہاں کی نباتات کو تباہ کرنے کے لیے ایک کروڑ نوے لاکھ گیلن کا تباہ کن مادہ پھینکا۔ ۱۵ سو لاکھ ایکڑ پر زہریلی دوائیں چھڑکیں جن کا اثر ایک سو برس تک رہے گا۔ ایک کروڑ افراد بے گھر ہوئے۔ نو لاکھ بچے یتیم اور پندرہ لاکھ ساٹھ ہزار شہری مجروح ہوئے چھتیس لاکھ باسٹھ ہزار آدمی مارے گئے

عیسائیوں نے مسلمانوں کے ساتھ جو سفاکی دکھائی اس پر بھی ایک نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ وہ افریقہ ایشیا اور دنیا کے کسی خطہ میں جا کر اپنی سامراجیت کا پرچم لہرائیں تو اس کو ہر طرح حق بجانب ثابت کرتے ہیں۔ مگر یورپ میں مسلمانوں نے کسی خطہ میں اپنا قدم جمایا۔ انہوں نے کسی کو بھی گوارا نہیں کیا۔ سسلی میں مسلمانوں نے دو سو برس تک حکومت کی اور یہاں سے بقول ڈریپر یورپ کی عقلی اور دماغی ترقی کو بڑی تقویت پہنچائی مگر عیسائیوں کی نظروں میں ان کی حکومت بار بار کھٹکتی رہی۔ جب نارمن عیسائیوں نے ان پر حملہ کیا تو بلرم شہر میں پانچ مسجدیں تھیں ان کو منہدم کر کے گرجا میں تبدیل کر دیا۔ علماء، صوفیہ، اور حکماء کی جتنی قبریں تھیں سب نیست و نابود کر دی گئیں۔ چارلس دوم کے زمانے میں سسلی کے مسلمانوں کو زبردستی عیسائیوں کا بپتسمہ دے دیا گیا۔ نوسیرا اور لیسیرا کے مسلمانوں کی تعداد اسی ہزار تھی۔ ان کو زبردستی عیسائی بنا لیا گیا۔ ہر جگہ مسلمانوں سے خالی کرالی گئی۔ اس کی تفصیل ہسٹورین ہسٹری آف دی ورلڈ میں پڑھی جا سکتی ہے۔

بارہویں اور تیرہویں صدی میں یورپ کے عیسائیوں نے دو سو برس تک مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگ اس لیے کی کہ ان کو صفحۂ دہر سے نابود کر دیں۔ تاریخ یورپ کے مصنف ایچ جی گرانٹ نے لکھا ہے کہ صلیبیوں کے نزدیک دشمن کو قتل کرنا خدا کی عبادت کے مساوی تھا۔ بیت المقدس عیسائیوں نے فتح کیا تو ایڈورڈ گبن لکھتا ہے کہ صلیب کے علمبرداروں نے تین دن تک اتنا قتل عام کیا کہ ستر ہزار لاشوں کی وجہ سے وبا پھیل گئی۔ جب اس سے بھی ان کی تشفی نہیں ہوئی تو یہودیوں کو ان کی عبادت گاہوں

...قاران
...میں جلایا گیا۔ اُن کے فوجی سرداروں نے اس خونریزی کی خوشی میں اپنے پوپ کو لکھا کہ اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ ہم نے اپنے دشمنوں کے ساتھ کیا سلوک کیا تو اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ جب ہمارے سپاہی حضرت سلیمانؑ کے معبد میں داخل ہوئے تو اُن کے گھوڑوں کے گھٹنوں ... مسلمانوں کا خون تھا۔

اسپین میں مسلمان آٹھ سو برس تک رہے۔ اور بقول موسیو لیبان اس ملک کو انہوں نے یورپ کا سرتاج بنا دیا تھا، مگر یہاں ... عیسائیوں نے اِن کو جس طرح دربدر کیا اس کی تاریخ موسیو لیبان نے اس طرح لکھی ہے کہ ۱۴۹۹ء سے وہاں کے مسلمانوں پر وہ مظالم شروع ہوئے جو ایک صدی کے اندر ان کے اخراج کلی پر منتہی ہوئے۔ پہلے تو وہ بالجبر عیسائی بنائے گئے پھر اس بہانہ سے کہ وہ عیسائی ... وہ اس مقدس عہدا مذہبی عدالت کے سپرد کیے گئے جس نے انہیں جہاں تک ممکن ہوا آگ میں جلایا پھر یہ ایک تجویز پیش کی گئی ... کل غیر عیسائی عرب عورتوں اور بچوں کے ساتھ قتل کر دیئے جائیں۔ یہ ممکن نہ ہو سکا تو یہ عام اشتہار دیا گیا کہ سارے عرب ایک ساتھ ملک سے نکل جائیں۔ راہب بلیڈا نے بڑی خوشی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ان عربوں میں سے آدھے راہ میں قتل کر دیئے گئے۔ ایک ہی مہاجرت میں ایک لاکھ چالیس ہزار عرب افریقہ کو جا رہے تھے ایک لاکھ مار ڈالے گئے۔ چند مہینے کے اندر اندلس سے دس لاکھ سے بھی زیادہ آدمی نکل گئے۔ سیدی بورا اور اکثر مورخین اندازہ کرتے ہیں کہ فرڈی ننڈ کی فتح سے لیکر مسلمانوں کے اخراج تک اندلس سے تیس لاکھ رعیت نکل گئی۔ ایسے قتل عام کے بعد سینٹ برتھالیمو کا واقعہ دھندلا کر رہ جاتا ہے۔ موسیو لیبان ہی کا بیان ہے کہ وحشی سے وحشی اور بے رحم سے بے رحم ملک گیروں نے کبھی اس قسم کے دردناک قتل عام کا دھبہ اپنے دامن پر نہیں لگایا۔

۱۸۲۱ء میں یونان علاقہ موریا میں تین لاکھ اور یونان کے شمالی حصہ میں ہزاروں مسلمانوں، مرد، بچے اور عورتیں بڑی بے رحمی سے ہلاک کئے گئے تفصیل مارما ڈیوک پکھتال کی کتاب "دی کلچرل سائڈ آف اسلام" میں پڑھی جا سکتی ہے۔

خود ہندوستان کے اندر عیسائی سامراجیوں کی ہولناکیاں کم دردانگیز نہیں ہیں۔ سات سمندر پار کے ایک ملک سے آ کر انگریزوں نے یہاں کے جائز باشندوں کو اپنی توپ و تفنگ سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کے میدان میں نوجوان سراج الدولہ کو شکست دے کر اس کو وراثت سے محروم کیا۔ ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کو اس قلعے کے اندر گھس کر تہ تیغ کر دیا۔ ۱۸۵۷ء میں جب ہندوستانیوں نے اپنے ملک کی آزادی کی خاطر سرفروشی سے کام لیا تو ان ہی انگریزوں نے اپنی توپ و تفنگ سے ستائیس ہزار مسلمانوں اور ہندوستانیوں کو لقمۂ اجل بنا دیا۔ دہلی کو مذبح خانہ بنا دیا گیا۔ نوے سال کے بوڑھے بہادر شاہ ظفر کو معزول کر کے ان کو جلاوطن کیا۔ ان کے شہزادوں میں سے مرزا خضر سلطان اور مرزا ابوبکر کو دہلی دروازہ کے پاس لا کر اور ان کے کپڑے اتار کر بڑی سفاکی سے گولی مار دی ان کی لاشوں کو سر بازار لٹکائے رکھا اس کے بعد بیس اور شہزادوں کو پھانسی دی گئی۔ کیا وہ ملکہ وکٹوریہ کی مادر وطن پر قبضہ کرنا چاہتے تھے کہ اس جرم کی سزا ان کو دی گئی۔

اس بیسویں صدی میں جب جمہوریت، آخوت، مساوات اور انسانی ہمدردی کا اعلیٰ درس دیا جانے لگا تو پہلی جنگ عظیم کے بعد ٹرکش ایمپائر کا تیا پانچہ کرنے کے لئے جب عیسائیوں کی فوج اناطولیہ میں ۱۵ رمئی ۱۹۱۹ء کو داخل ہوئی تو یورپ کا مشہور

مورخ ٹامن بی لکھتا ہے کہ یہ فوج اناطولیہ پر ایک بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہوئی۔ سمرنا کی گلیوں میں شہر کے لوگوں کا قتل عام شروع ہوگیا۔ محلّے کے محلّے اور گاؤں کے گاؤں لوٹ لیے گئے۔ زرخیز وادیوں میں آگ کے شعلے بھڑکنے لگے، خون کی ندیاں بہنے لگیں ملک کی تجارت کو تباہ کردیا گیا۔ مکان، پل اور سڑکیں مسمار کر دی گئیں۔ ملک کے باشندے تلوار کے گھاٹ اتار دیئے گئے جو بچ رہے، ان کو جلاوطن کر دیا گیا۔

مسلمان حکمرانوں کے زمانہ میں بھی لڑائیاں ہوتی رہیں اور ان میں خونریزیاں بھی ضرور ہوئیں مگر یورپ کے عیسائی فرمانرواؤں کی سفاکیاں اور خصوصاً دوسروں کے وطن میں جاکر وہاں کے لوگوں کو غلام بنانے کے سلسلے میں ان کی شرانگیزیوں اور فتنہ پردازیوں کی مفصل تاریخ لکھی جائے۔ تو پھر ان کے مقابلے میں مسلم حکمران صفحۂ دہر سے باطل کو مٹانے والے، نوع انساں کو غلامی سے چھڑانے والے اور مئے توحید کا جام پلانے والے ہی نظر آئیں گے وہ جہاں پہنچے اس کی خاک کو اپنی جبینوں سے بسایا۔ اس کے ذرّے ذرّے کو سینوں سے لگایا۔ سات سمندر پار رہ کر درخشندہ فلزات سے اپنے بینکوں کی عمارتوں کی تعمیر اور رعنائی اور رونق میں اضافہ نہیں کیا۔

پھر دونوں میں یہ بھی فرق رہا کہ مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ زیادتی کرنے والوں سے لڑائی لڑی جائے جو لوگ دین کے بارے میں لڑیں ان سے بھی لڑائی کی جائے۔ جو لوگ گھروں سے نکال باہر کریں ان سے اور ان کی مدد کرنے والوں سے بھی جنگ کی جائے۔ عیسائیوں کو یہ تعلیم دی گئی کہ جو تیرے دائیں گال پر تھپڑ مارے تو اس کے سامنے اپنا بایاں گال بھی پھیر دے۔ جو تجھ کو ایک میل بیگار لے جائے تو اس کے ساتھ دو میل جا۔ جو تیرا کوٹ مانگے تو اس کو اپنا کرتا بھی دے دے کیا عیسائی فرمانرواؤں نے اس پر عمل کیا؟ عمل کرنے کی بجائے وہ جہاں پہنچے اس کو مرگھٹ اور گورستان بنادیا مگر اپنی تاریخ نویسی کے طلسم سازی سے اپنے سارے جرائم دوسروں خصوصاً مسلمانوں پر رکھ کر سپیدہ بر آبو نے کی کوشش کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو ان عیارانہ تحریروں سے بے نیاز ہوکر یہ ثابت کر دکھانا ہے کہ ؎ مرے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی نہیں ہے مجھ سے بڑھ کر ساز فطرت میں نوا کوئی

سہ سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا

کتابت کی غلطی بلکہ غلطیاں تو ناقابلِ شمار ہی ہیں۔ مگر کچھ بزرگ اہلِ علم و قلم حضرات سے بھی کچھ ایسی باتیں ہو گئیں ہیں جن سے طبیعت میں کھٹک پیدا ہو رہی ہے۔ براہِ کرم ان پر غور فرما کر میری رہنمائی فرمائیں۔ مثلاً۔

فاران مئی سنہ ۱۹۸۱ ماہر القادری نمبر

ص نمبر ۲ سطر ۱۶ یک قلم کا املا بیکقلم ہوا[۱]

" ۱۰ " ۱۱ شعر کا مصرعہ ثانی۔ مفہوم بدل جاتا ہے۔ ہم کو۔

" ۱۶ " ۲ شعر۔ مصرعہ ثانی۔ سکوں کی نہ کر تلاش۔ ۔ کو لکھا ہے ؟

" " ۲۲ مصرعہ اولیٰ۔ خورد بینوں سے نہ دیکھو مرے دامن کو ابھی۔ داغوں کو کر دیا ہے ؟

" ۲۴ ۱۸ سامع کو صائع کر دیا۔ کاتب

" ۳۰ ۲ جو اس صنعت تضاد کے تحت دیے گئے ہیں محل نظر ہیں کیا۔

" ۳۴ ۲ نعیم صدیقی۔ "ماہر صاحب کی فرضی تصویر"۔ فرضی تصویر مناسب ہے[۲] یا اصلی تصویر؟ آگاہ فرمائیں

" ۳۹ تا ۴۴ سمجھ میں نہیں آتا کہ وارث صاحب نے اس مصرع کو۔ یا خدا دیوانہ گو با مصطفیٰ ہشیار۔ باش خود لکھا ہو جبکہ یہ مصرعہ یوں ہے با خدا دیوانہ باش و محمدؐ با ہوشیار ع[۳]

" ۷۰ سطر ۷ یہ جملہ کیا ہے۔ "اس لئے حضور اکرمؐ کے سلسلے میں دبے تکلفی بھی.... روا ہو گی جو عام معشوق کے بارے روا رکھی جاتی ہے"۔ روا ہو گی یا ناروا ہو گی۔ کیا ہو سکتا ہے[۴]

۲۰۸ "زبان و بیان پر عجز خامہ فرسائی بے حد جاندار اور یادگار ہوتی تھی" (نگارشات، رشحاتِ قلم) جیسے الفاظ کا محل تھا[۵] خامہ فرسائی میں تو ذم کا پہلو ہے۔

" ۵ طالبِ علمانہ تحقیق و رود کد تجسس یا تلاش لکھنا چاہیئے تھا۔ رود کد میں بھی ذم کا پہلو ہے[۶]

---

[۱] یہ سب کتابت کی غلطیاں ہیں [۲] صحیح ہے لیکن خیالی تصویر لکھنا زیادہ فصیح ہوتا۔ [۳] صحیح مصرعہ یہی ہے۔ [۴] فرق بڑا نازک اور لطیف ہے۔ یقیناً ناروا اقرب الی المفہوم ہے۔ [۵] ذم کا پہلو تو نہیں البتہ یہاں اس کا محل نہیں تھا نگارشات کا لفظ زیادہ برمحل ہوتا [۶] نہیں۔

۸ / ۰ محمد آباد لو لایا۔ بہت عوامی اور گھٹیا لفظ ہے۔ لے آیا میں کیا دقت اور قباحت تھی ؟[7]

۱۹۰۵۲ / ۰ "رمی اور برج کھیلنا چاہتے تھے"۔ ہم نے تو رمی دیکھا اور سنا ہے شاید انگریزی زبان کا لفظ ہو لیکن انیس شاہ جیلانی صاحب نے اسے بھی عربی الاصل بنا دیا تحقیق سے مطلع فرمائیں کرم ہوگا۔

۵۲ / ۱۲ وہ البیلی نار قریب آئی اور اٹھلا کر بولی۔ اٹھلا کر بولنا غلط ہے۔ اٹھلا کر چلنا زبان ہے۔
کیف صاحب مرحوم کا مصرعہ ہے کہ ع۔ اٹھلا کے نہیں کہتے۔ اٹھلا کے تو چلتے ہیں۔ یہ ایک تاریخی تنازعہ تھا جو آغا شاعر قزلباش اور کیف صاحب کے درمیان ۱۹۰۶ء میں جھالا واڑ میں ہوا تھا جس پر آغا شاعر جھالا واڑ چھوڑ گئے۔ آغا شاعر کا مصرعہ تھا۔ ع ان کا اٹھلا کے یہ کہنا مجھے نیند آئی ہے۔ کیف صاحب نے منظوم تنقید کی اور یہ مصرع دیا۔ اٹھلا کے نہیں کہتے اٹھلا کے تو چلتے ہیں[1]

انیس شاہ جیلانی ہمارے بھی کرم فرما ہیں۔ لیکن ان کا مضمون ہلکا رہا۔ اس لئے کہ انہوں نے کہیں تو پیرایۂ بیان نامناسب اختیار کیا ہے۔ اور کہیں سنی سنائی باتوں کو لکھ دیا۔ روایت و درایت کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔ جوش صاحب نے ماہر صاحب سے لئے شراب نوشی کی بات کس سے کہی ؟ کب کہی ؟ آپ نے بذات خود جوش صاحب سے سنی یا درمیان میں کوئی اور شخص تھا جو اس غلط بات کا راوی تھا۔ احتیاط اور تحقیق کے بھی تقاضے اور ضروریات پس پشت ڈال دیں۔ آپ کا نوٹ اچھا ہے مگر جوش صاحب کے لئے انتہائی سخت۔ فرض کیجئے اگر جوش صاحب منکر ہوں تو۔

ص ۵۶ سطر ۱ جگر صاحب کے پرستاروں کا صبح سے شام تک الخ۔ مجھے یاد ہے کہ اب سے تقریباً دس بارہ[11] سال قبل میں کسی آل انڈیا مشاعرہ میں جودھپور تھا۔ وہاں یوپی۔ ایم پی۔ راجستھان اور بمبئی کے اکثر شعرا میرے واقف تھے۔ دوست تھے یہ بھی جانتے تھے کہ ماہر صاحب کا میرا تعلق کتنا ہے۔ کسی ایک نے فرمائش کی کہ ماہر صاحب کو پھر بلاؤ۔ باتوں باتوں میں میں نے وہیں سے خط لکھ دیا کہ" ہندوستان میں بھی آپ کے پرستار موجود ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ ادھر پھر تشریف لائیں۔ ماہر صاحب کا جواب آیا اور بہت معصومانہ انداز میں انہوں نے اصلاح فرمائی کہ پرستار کا لفظ دینی اور دنیاوی دونوں نقطۂ نگاہ سے قابل اعتراض تھا۔ پرستار نہیں عقیدتمند لکھنے میں۔ جب بھی خیال آتا ہے پسینے پسینے ہو جاتا ہوں زندگی بھر اپنی اس غلطی پر نادم رہوں گا"[12]

آپ نے بھی ص ۱۰۲ حضرت جام نوائی کے قطعیات تاریخ کے بارے میں جو نوٹ دیا ہے اس میں یہ لکھا ہے کہ۔ حضرت جام نوائی بھی ماہر مرحوم کے پرستاروں اور سوگواروں میں ہیں۔ اب حکم ہو تو ختم کروں داستان کو میں۔

---

۷ عوامی بھی ہے اور غلط بھی مگر گھٹیا نہیں ہے۔ ۸ رمی درست ہے۔ اور یہ انگریزی کا لفظ ہے۔ (Rummy)

۱۱ بڑی لمبی بحث ہے پرانے اور لغت والے مفہوم کے اعتبار سے تو اٹھلا کے چلا ہی جاتا تھا۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ اب اچھے اچھے ادیبوں نے اٹھلا کے بولنا، کہنا بھی لکھنا شروع کر دیا ہے۔ اور اس کو ناز و ادا سے کہنے اور شرما کے کہنے کے مفہوم میں استعمال کرتے ہیں۔

۱۲۔ اس کا جواب پہلے ہی دے چکا ہوں۔ پرستار بمعنی قدر داں، ہمدرد، جوہر شناس اساتذہ نے بھی استعمال کیا ہے۔ ماہر مرحوم کو تسامح ہوا جو اس پر ایسا اعتراض کیا۔ ادا ہوتا

دیکھئے ص ۱۰۶ سے ایک دم ص ۱۰۷ پر آگیا۔ کیا کروں ایک ایک سطر پر ماہر صاحب یاد آرہے ہیں ان کے اور میرے درمیان پچیس سال تک یہی سلسلۂ مراسلت رہا ہوگا۔

ایک بات اور لکھ کر اس سلسلے کو ختم کرتا ہوں کہ آپ میری اس خامہ فرسائی اور تضیع اوقات کی حماقت سے درگزر فرمائیں آخری بات ص نمبر ۱۰۶ سطر نمبر ۱ پر رشتی امرتسری صاحب نے یہ لکھا ہے کہ " ماہر القادری علیہ الرحمۃ کی عمر بھر کی موشگافیوں کو ابدی موت سے بچالیں۔ موشگافیوں میں بھی ذم کا پہلو نمایاں ہے"۔ کاوشوں، نکتہ آفرینیوں وغیرہ قسم کا لفظ ہونا چاہیے تھا۔[1]

ابھی پورا پرچہ پڑھا بھی نہیں پایا ہوں کہیں کہیں سے جستہ جستہ اٹھالیا ہے۔ اب آپ جانیں اور آپ کا کام۔ اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اگر ماہر صاحب کی ادارت میں یہ باتیں ہوجاتیں یا فاران میں آجاتیں تو شاید ماہر صاحب کا ہارٹ فیل ہوجاتا۔ مجھے انتہائی دکھ ہے کہ میں آپ جیسے محترم بزرگ کو یہ لکھ رہا ہوں یہ جانتے ہوئے بھی کہ "خطائے بزرگاں گرفتن خطا است" مگر قبلہ میں کیا کروں اور کیسے یہ سب کچھ برداشت کرلوں۔ خدارا آپ ہی انصاف فرمائیں

بہرحال یہ آپ کی "عدالت العالیہ" میں بغرض انصاف بطور فریاد پیش کر رہا ہوں[1]

کتابیں برائے تبصرہ موصول ہوئیں

(۱) فقہائے ہند۔ جلد پنجم حصہ دوم۔ — مؤلف اسحاق بھٹی۔
ناشر۔ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور۔

(۲) افغانوں کی نسلی تحقیق۔ مصنف:- خان روشن خان
ناشر۔ روشن خان اینڈ کمپنی۔ جونا مارکیٹ کراچی۔

(۳) مارکسیت کا مغالطہ (FALLACY-OF-MARXIM) کا اردو ترجمہ۔ مترجم۔ محمد طفیل سالک۔
ناشر۔ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور۔

"قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی ﷺ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیے"
(ادارہ)

ہو ذم کا کوئی پہلو نہیں البتہ کاوشوں اور نکتہ آفرینیوں کے استعمال سے مطلب زیادہ فصیح طور

[1] آپ کا مذاقِ علمی بلند ہے اور استعداد گرانمایہ، لیکن عزیزمن قدرے وسعتِ نظر اور رواداری بھی درکار ہے۔ بچھر جدید کی علمی کاوشوں کا جائزہ لینے کے لئے اور ان پر ناقدانہ و نقادانہ نظر ڈالنے سے پہلے کچھ تھوڑی سی لچک پیدا کیجیے شاخ گل میں لچک نہ ہو تو قریب کی فضا بھی مہک سے محروم رہتی ہے۔

تسنیم مینائی

یادِ رفتگاں

تسنیم مینائی

اِک عمر سے تھی تکلیف جسے کل رات وہ قیدی چھوٹ گیا

۱ — فضلی

قاضی عبدالغفار مرحوم نے روزنامہ "پیام" حیدرآباد دکن میں جب اس مصرعے کو سانحۂ وفاتِ فانی کے اداریے کا عنوان بنایا تو یہ مصرعہ میرے دل میں کھُب گیا۔ فانی کا آخری زمانہ بالکل اس کا مرقع تھا۔ اس واقعے کو کم وبیش چالیس برس ہو گئے۔ کل جب فضلی کے انتقال کی خبر ملی تو بے اختیار یہ مصرعہ زبان پر جاری ہوگیا۔

؎ اک عمر سے تھی تکلیف جسے کل رات وہ قیدی چھوٹ گیا۔

تقریباً پچیس سال سے صحت وبیماری، تندرستی ومعذوری، بیکاری وباکاری، فعّالی ومجبوری کا ایک پیکر تھا۔ جو حوادث وعلائق کی چیرہ دستیوں سے نبرد آزما تھا اور ہار مان کے نہیں دیتا تھا مبالغہ بالکل نہیں ہے، کم سے کم بارہ پندرہ حملے تو دل کے ہوئے اور وہ اُن کو جھیل گئے۔ صرف بھائی شہاب الدین کرمانی مرحوم میرے علم کی حد تک، اس معاملے میں اُن سے آگے تھے ورنہ ڈاکٹروں کی رائے میں دوسرا زیادہ سے زیادہ تیسرا حملہ جان لیوا ہوتا ہے۔

ان کی علالت کا آغاز ۵۶-۱۹۵۵ء میں ہوا جب بقول انہیں کے شیریں سخنی کے بعد وہ شیریں بدنی کی منزل میں داخل ہوئے۔ یہی بیماری بڑھ کر "مرض درد دل" کا سبب ہوئی۔ اور دوسرے تیسرے حملے ہی میں وہ دلِ مردہ، کا شکار ہو گئے لیکن ؎ دل مردہ، دل نہیں ہے، اسے زندہ کر دوبارہ ۔ اُن کے معالجوں سے زیادہ ان کی حیرت انگیز، خدا اعتمادی وشگفتہ مزاجی نے ان کے دلِ مردہ کو چند لمحوں میں دلِ زندہ میں تبدیل کر دیا۔ اور وہ ہنستے بولتے جیسے گئے تھے ایسے ہی ہنستے مسکراتے واپس آگئے۔

فضل احمد کریم فضلی کو اس وقت تک یا بڑے سرکاری افسر اور منسٹر وغیرہ جانتے تھے۔ یا ان کے بچپن اور جوانی کے ہمدم وہمراز، اقارب واحباب اور یا پھر شعرائے اردو۔ شاعری کے رسیا تو وہ طالب علمی کے زمانے سے تھے خاندان بھی ان کا ادبی تھا اور ماحول بھی، حضرت اکبر کی گودوں میں کھیلے جگر واصغر کی صحبتوں میں پروان چڑھے تھے۔ وہ

سید فضل رب مرحوم، ڈپٹی کلکٹر کے بڑے صاحبزادے تھے، نومبر ۱۹۰۶ء میں بمقام الہ آباد پیدا ہوئے۔ ظفر احمد انصاری کے ہم وطن، ہم جماعت، ہمعصر اور ہم مذاق تھے۔ دونوں نے الہ آباد یونیورسٹی بدرجہ اول بی اے آنرز و بی اے کیا۔ ۱۹۲۹ء میں صوبائی سول سروس میں منتخب ہو کے اعظم گڈھ میں چند دن حاکم تعلقہ رہے۔ پھر ۱۹۳۰ء میں انڈین سول سروس کا امتحان دیا اور کامیاب ہو کے تربیت کے لئے لندن چلے گئے۔ جہاں آکسفورڈ سے انہوں نے فارسی ادب میں بی لٹ کی سند حاصل کی واپسی پر صوبہ بنگال میں تعینات کئے گئے جہاں اپنی خوش کرداری، خوش خلقی، نیک نامی و نیک سیرتی کی بنا پر جلد ہی عوام و خواص میں مقبول و محبوب ہو گئے۔ یہی وجہ تھی کہ مشرقی پاکستان کے سارے ممتاز افراد اور ان کے خانوادوں سے ان کے عزیزانہ و برادرانہ تعلقات تھے۔ مولوی فضل الحق، حسین شہید سہروردی، خواجہ ناظم الدین سب ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ پاکستان بنا تو وہ چاٹگام میں ڈپٹی کمشنر تھے پھر حکومت میں مختلف محکموں کے معتمد ہوئے تعلیم کے شعبے میں ان کی اصابت رائے اور حسن کار کا مغربی اور مشرقی پاکستان دونوں طرف بڑی فراخ دلی سے اعتراف کیا گیا۔ اپنی کارکردگی انسان دوستی اور حسن اخلاق کے باعث مرکزی حکومت نے ۵۳ء ہی میں اُن کو دارالخلافہ کراچی طلب کر لیا۔ کراچی واقعی اس وقت "عالم میں انتخاب تھا" یہاں ان کے حقیقی جوہر کھلے اور چند روز ہی میں ان کی قیام گاہ مرکز خاص و عام بن گئی۔ ان کی یہی مقبولیت لیکن ان کی مخالفت کا سبب ہوئی اور انہیں کی سروس (آئی سی ایس) کے بعض سازشی عناصر کے تعاون سے حکومت وقت کے بعض وزرا نے بالخصوص گورنر جنرل نے اُن کو ہر طرح مطعون و رسوا کرنے کی کوشش کی حتیٰ کہ میر مجلس عدالت عالیہ (جسٹس طیب جی) کی سرکردگی میں ایک تحقیقاتی کمیشن ان کے خلاف عائد کردہ الزامات کی جانچ پڑتال کے لئے مقرر کیا گیا، جس نے تفصیلی تحقیقات کے بعد ان کو جملہ الزامات سے بری الذمہ قرار دیا اور باعزت بریت کی سند دی۔ تحقیقاتی رپورٹ کا اعلان ہوا تو وہ الہ آباد گئے ہوئے تھے واپسی پر ان کے اعزہ و احباب، عقیدتمندوں اور قدر دانوں نے شہریوں کا ایک بڑا جلسہ منعقد کیا جس میں ان کو مبارک باد دی گئی، اور خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ فضلی مرحوم کی جراتِ ایمانی، فتح و غلبہ حق پر کامل اعتماد اور سخت سے سخت تکلیف و آزمائش اور بڑے سے بڑے خطرے کا بھی خندہ پیشانی سے سامنا کرنا ان غیر معمولی محاسن کا ان کے دوست دشمن سب کو اسی وقت سے صحیح اندازہ ہوا۔ اس دور کے اُن کے اشعار اور ان کی غزلیں اردو شاعری کی تاریخ میں نقش منزل اور راہ اور نشانِ راہ کا درجہ رکھتی ہیں۔

ہم تنبہ تھے ہی ہوا کیا گر تباہی بڑھ گئی — آپ کی تو شہرت عالم پناہی بڑھ گئی

ہر صرِ غم سرنگوں تو کیا مجھے کرتی جناب — ہاں مگر کچھ اور شانِ کجکلاہی بڑھ گئی

کچھ وار بھی ظالم کے ذرا پڑتے ہیں اوچھے — اور فضلی مرحوم میں کچھ دم بھی بہت ہے۔

انہیں محاسن سیرت و کردار، اسی مقبولیت و مسؤلیت علمی و ادبی کی پاداش میں ان کے مخالف گروہ نے ایوب خان کے برسر اقتدار آتے آتے بہت مستحکم ہو گیا تھا اُن کو اسکریننگ کے پردے میں ملازمت سے ریٹائر کرا دیا۔ ایوب خاں نے اس کے بعد تلافی مافات کے طور پر ان کو بڑی بڑی متبادل خدمات کی پیشکش کی لیکن وہ نہ پسیجے اور تمام سرمایہ جذ توانائی اصلاحی اعلیٰ معاشرتی فلمیں بنانے اور ان کے ذریعے عامۃ الناس میں شعور نیک و بد کو ترقی دینے کے لئے وقف کر دی۔

ادارہ "دبستان" ناظم آباد میں کئی برس تک اسی جدوجہد کا مرکز بنا رہا۔ لیکن لگن کے متوالوں کا جو حشر ہوتا ہے، وہی
احمد کریم فضلی ہدایت کار کا حشر ہوا۔ "چراغ جلتا رہا" کو عوامی مقبولیت حاصل ہوئی اور نہ "ایسا بھی ہوتا ہے" کی پذیرائی
۔ تمام سرمایہ ڈوب گیا اور دبستان قرق ہو کر بند ہو گیا۔ اور فضلی کا بال بال قرضوں کے جال میں جکڑ گیا اس سارے
ابتلا میں ان کے جملہ دوست احباب ان کے تمام متوسلین و معتقدین ہر طرح اور ہر حال میں ان کی کمک پر کمربستہ رہے
ہاری افسروں میں شعیب مرحوم (سابق وزیر خزانہ پاکستان) سید ہاشم رضا، عنایت اللہ خاں مرحوم، غلام احمد مدنی مرحوم
دین میں سہروردی، فضل القادر چودھری، شورش کاشمیری، سردار عبدالقیوم، کے ایم خورشید، ان سب نے اور ان
متعدد مخلصین نے ہر حال میں ان کا ساتھ دیا۔ لیکن گوشت پوست کا بنا ہوا انسان کہاں تک پے بہ پے صدمے سہہ سکتا ہے
وہ فرعونوں سے لڑتا تھا وہ ہامانوں سے لڑتا تھا۔ وہ شدادوں سے لڑتا تھا وہ طوفانوں سے
تو لگتی ہے زخم تو آتے ہی ہیں۔ صحت اور تندرستی برابر متاثر ہوتی گئی۔
ندگی کا معمول ہو گیا۔ چار پانچ دورے دل کے پڑے ایک آدھ بار دل دو ایک ثانیوں کو بند بھی ہو گیا یعنی یہاں جا کے لوٹ آئے
چار بڑے بڑے آپریشن ہوئے، معدہ بول کا مثانے کا پتے کا، معالج سرجن سب حیرت میں تھے کہ ایسا دائم المرض انسان
قوتِ ارادی اس قدر منضبط و مضبوط بیماریاں اتنی پیچیدہ اور اس قدر سنگین لیکن طبیعت کی شگفتگی اور خدا پر مکمل بھروسے کا
رنگ، تیمار دار عزیز دار، سب آپریشن کے خیال سے مضطرب و متفکر اور خود مریض اپریشن کی میز پر، سرجن راٹھور اور
ن حمید سے خوش گپیوں میں مشغول دو مہینے سے وارڈ میں پڑے ہیں۔ اور چار چار چھ چھ تکلیف دہ سے تکلیف دہ ٹیسٹ
یں، کبھی دل کے کبھی معدے و مثانے کے کئے جا رہے ہیں۔ اور مریض کی نہ نبض بے لنظم ہے نہ بلڈ پریشر اونچا ہوتا ہے
عالم میں ۱۹۷۶ء میں سینے میں پیس میکر لگا دیا گیا جس کی آغاز ۱۹۸۱ء پھر بیٹری تبدیل کی گئی سب یہ عمل خاصے اذیت رساں
تے ہیں۔ مگر فضل احمد کریم فضلی کا تعلق مع اللہ خدا جانے کس مرتبے اور کس درجے کا تھا۔ کہ اس کے بعد بھی
یسے ہی ہشاش بشاش، پرساں احوال آ گئے تو ان کو شعر سنا رہے ہیں۔ دوست احباب پہنچے ہیں تو ان سے لطیفہ گوئی
رہی ہے۔ غرض یوں ہی کامل سپردگی اور مکمل یقین آفرینی کے ساتھ "کا تقریباً ربع صدی سخت اذیت و آزمائش
دورِ علالت و معذوری تمام کمال اس طرح گزار دیا کہ بہنوئی، بہن، بیٹے، بیٹی، لنگوٹیا یار دوست، بے تکلف احباب و اقارب
کے پاس سے افسردہ تو کجا اور آسودہ ہو کے اٹھتے تھے بقولِ سکندر علی وجد

ہلکی سی اک نقاب تبسم پڑی رہی رخ سے میرے عیاں غم پنہاں نہ ہو سکا۔

خود فضلی کا ایک شعر بھی اسی زمین میں بے بدل ہے۔

وہ وقت آ پڑا ہے کہ اوروں سے کیا کہیں ہم سے بھی کوئی کار نمایاں نہ ہو سکا

آئی سی ایس، اور اتنا سیدھا سادا، تمکنت و تصنع سے اس قدر دور، دوست احباب ہی نہیں معمولی شناساؤں
ر ملاقاتیوں کا ایسا ہمدرد و مہرباں تغزل و تصوف کا بادشاہ علم و ادب کا تاجدار قدردان،۔ شاعر ادیب ناول نگار، غزل کا

مدیر

ان کا اپنا رنگ تھا مخصوص مزاج تھا۔ جس میں کوئی ان کا نہ سہیم تھا نہ شریک ؂

ہم گئے تھے عرض کرنے مدعا اور عرض مدعا ہی رہ گیا ؂[1]

حسرتوں پر شیخ کی کڑھتا ہے جی پارسا تھا پارسا ہی رہ گیا

کسی کا آستاں اونچا ہے اتنا یہ سر جھک کر بھی اونچا ہی رہے گا

کرم ہی سے ترے پھولوں سے دامن بھر گیا میرا

کرم ہی سے ترے کچھ اور گنجائش نکل آئی۔

جگر مرحوم نے آخر یونہی تو اس کے لیے اپنی مشہور زمانہ غزل ۔ اے شبنم آسماں چکیدہ کیا سب ہیں وہاں بھی غم رسیدہ میں یہ شعر شامل نہیں کر دیا تھا۔ فضلی سے ہے آبرو غزل کی۔ اشعار میں سب سے برگزیدہ۔

جوش نے پہلی یا دوسری ملاقات میں بڑے کھلے ڈھلے سے اپنی وہ رسوائے مسلم رباعی سنائی جس کا ایک شعر ہے

ابلیس و ابوجہل کی عظمت کی قسم سو بار غلامی سے بغاوت اچھی۔

وہیں ٹوکا کہ جوش صاحب میں نے اس کو یوں سنا تھا۔

فرعون کی ڈوبی ہوئی قسمت کی قسم شداد کی کھوئی ہوئی جنت کی قسم

میں بھی ہوں اسی زمرۂ عظام میں جوش ابلیس و ابوجہل کی عظمت کی قسم

خون جگر ہونے تک ان کی مہارت ناول نگاری کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ مشرقی پاکستان کے افراد و احوال۔ عوالم و عوامل کا ایسا عمیق باریک جزئیات گیر اور قریبی مشاہدہ بنکم چٹرجی اور نذر الاسلام کے موقلم سے بھی غالباً اتنی کامیابی اور تاثیر کے ساتھ صورت پذیر نہ ہوا ہوگا۔

۷۱ء کے بعد سے مشرقی پاکستان کے بارے میں سوشلزم کی فریب کاریوں اور چیرہ دستیوں پر عوامی لیگ کے مسلک کی حقیقت اور اس کے قائدین کی بے راہ روی کتنے بلند پایہ پمفلٹ فضلی مرحوم کے سحر کار اور حقیقت پسند قلم کا کارنامہ ہیں، جو پریس میں بھی آتے آگے بھی شائع ہوئے۔ صلے و معاوضہ کی یا اعتراف اقرار کی نہ ان کو ضرورت تھی نہ طلب۔ لیکن اخیر دور میں شوکت صدیقی نامی کسی کم سواد نے جب بھٹو کے دور کے ہفت روزہ پندرہ روزہ اور ماہنامہ شائع ہونے لگے جن میں سے ایک میں طعن و تشنیع، کوسنے کاٹنے، گالیاں دینے اور بہتان طرازی کرنے کا ایک شہکار ان سے منسوب کر کے شائع کرایا تو میں نے ان کو واقعی ملول و مضمحل دیکھا اور ایسا ہونا بے جا بھی نہ تھا جتنے گندے اور گھٹیا افسانے، لطیفے، من گھڑت پھبتیاں، اردو، ہندی، پنجابی فحش لٹریچر میں موجود ہیں تقریباً سبھی کو اس مجہول النسب اور مرفوع العقل و القلم کالم نگار اور یاوہ نویس نے کھینچ تان کر فضلی مرحوم سے منسوب کر دیا تھا۔ ہنس کے کہتے تھے مگر کہتے تھے کہ بھئی اس ظالم نے تو ایک ملا کے شاہکار شہاب، جیسے گندے نالے کی گندگی میں بھی اضافہ کر دکھایا ذرا تحقیق تو کیجیے کہ صدیقی کون شخص ہے۔ میں نے یہ شعر پڑھا اور اٹھ آیا۔

تحقیق جو کی ان کے نسب کی تو یہ پایا کچھ یونہی سی ننھیال ہے ددھیال نہ دار

وہ آخر چلے گئے جواں بیٹوں کو اکلوتی بیٹی کو غم گسار شریک حیات کو جان دینے والی بہنوں کو، آبا آبا کہہ کر ہمکتے لپکنے اور چہکنے والے پھول جیسے پوتے پوتیوں نواسے نواسیوں کو چھوڑ کر وہاں چلے گئے جہاں سب کو جانا ہے۔ اور جہاں سے کوئی واپس نہیں آیا اور کیسے نہ جاتے یہی انسان کا مقدر ہے، یہی اس کا انجام بلکہ لازمی مرحلۂ تکمیلی و تکوینی ہے۔ جانا تو سب کو ہے اور روز سینکڑوں ہزاروں جاتے ہیں۔ لیکن فضلی جاتے جاتے بھی اپنی یاد کو اپنی محبت کو اپنی علمی و ادبی شخصی و خاندانی زندگی کو بقائے دوام دے گئے۔

مفضلی فضلی مرے مفضلی مرے پیارے فضلی — کان بجتے ہیں مرے یا کہ پکارا تم نے۔ — تسنیم مینائی

۲ ——— سوامی کلجگانند کبیر پنتھی

اُن کا پیدائشی نام قدرت علی تھا، لکھنؤ کے ایک شیعہ گھر میں اُن کی پیدائش ہوئی۔ ہوشمند ہو کر انہوں نام بدل کر قدرت اللہ کر لیا چند روز خلافت تحریک میں کام کیا پھر مسلم لیگ کی تحریک سے وابستہ ہو گئے اور آخر میں ہندوستان کے ادی باسیوں کا حال زار دیکھ کر سوامی کلجگانند کبیر پنتھی کی حیثیت سے اچھوتوں کی خدمت کے لیئے خود کو وقف کر دیا۔ نیت ان کی یہ تھی کہ ان سب کو دعوت دے کر حلقہ بگوش اسلام کر لیا جائے۔ اور بجا طور پر انہوں نے اس غرض کے لیئے اپنا رہنا سہنا، کام کاج، بود و باش سب انہیں کے ساتھ اور انہیں کے درمیان منتقل کر لی اور اپنے اس مشن میں ایسے جذبۂ صادق سے دل چسپی لی کہ قائد اعظم علیہ الرحمۃ تک نے ان کے عظیم خدمات کا عملی اعتراف کیا۔

قیام پاکستان پر وہ مشرقی پاکستان منتقل ہو گئے۔ اور وہاں اسی ہنج پر بڑی واضح اور موثر تحریک برسوں بڑی کامیابی سے چلائی، بعض ناگزیر مشکلات کی بنا پر بزمانہ آئین سازی وہ کراچی چلے آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ راقم الحروف ان کے اُس دور کے مشاغل وانہماک و اخلاص کا عینی شاہد ہے۔ خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل سے لے کر سردار عبدالرب نشتر، امیر اعظم خاں خلیق الزماں مولانا ظفر احمد انصاری سب اُن کے نیازمندوں اور قدر دانوں میں تھے اور ان کے اخلاص ان کی بے نفسی اور ان کی عملی اسلامی زندگی کے بڑے معروف و معترف تھے۔ کلجگانند مرحوم رنچھوڑ لائن میں بھنگی پاڑے میں رہتے تھے۔ اور آخر دم تک وہیں رہے ان کا مسلک یہ تھا کہ جب تک غریبوں کی طرح غریبوں کے ساتھ نہ رہو گے نہ ان کے مسائل کو سمجھ سکو گے نہ ان کے مسائل کو حل کر سکو گے۔ اور نہ اُن کو اس پر مطمئن کر سکو گے کہ تم واقعی ان کے ہمدرد بہی خواہ اور خدمت گزار ہو۔

اُن کا ۶ دسمبر ۱۹۸۱ء کو بڑی کس مپرسی اور لاوارثی کی حالت میں ایدھی ٹرسٹ کے خیراتی اسپتال میں انتقال ہو گیا۔ سو برس سے اوپر عمر پائی جس میں سے تقریباً ستر برس کا زمانہ انہوں نے غریبوں کی خدمت کرنے میں گزار الیت نے لیکن حسب دستور ان کے جیتے جی نہ ان کو پہنچانا نہ ان کے کام کی قدر جانی۔ ان کی حسرت انگیز و اندوہناک موت کی خبر شائع ہوئی تو پھر حسب دستور انجمنوں نے، قائدین نے، اور دانشوروں نے تعزیت و اعتراف کے رسمی بیانات جاری کر دیئے۔ یہ بھی کسی نے خبر نہ لی کہ وہ بلند مرتبہ عورت جو راقم الحروف کی دانست میں ایک اعتبار سے آبروئے نسوانیت، ہے اور جس کا نام ہے "سرلا دیوی" اور جو مرار جی ڈیسائی سابق وزیر اعظم ہند کے بڑے بھائی کرنل ڈیسائی کی اکلوتی لڑکی، سابق وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو کی رفیقۂ کار رہی ہے، اس پر اپنے شوہر

سوامی کلیگانند کی وفات حسرتِ آیات سے کیا گزری ہے۔ اور وہ کس حال و احوال میں ہے۔

نومبر کے شروع میں سوامی جی مرحوم کے حالات کا کچھ اندازہ کر کے انعام اللہ خان صاحب سکریٹری موتمر عالم اسلامی نے دفترِ موتمر میں مرحوم کے ساتھ کراچی کے چند اہل فکر کو بھی مدعو کیا۔ راقم الحروف کو بھی اس نشست میں شرکت کرنے کا موقعہ ملا کہ اس سے دو چار دن پہلے سوامی جی مرحوم معہ اپنی زوجہ سرلا دیوی کے میرے غریب خانے پر تشریف لائے۔ ما حضر تناول کیا اور اپنی مشکلات کے کچھ ابواب کا مجھ سے تذکرہ بھی کیا

موتمر کی نشست میں سوامی جی سے تفصیلی گفتگو کرنے کے بعد شرکائے نشست نے ایک لائحہ عمل ترتیب دیا جس کے ناظم اعلیٰ سوامی جی مقرر کیے گئے۔ ابھی اس منصوبے کی ابتدائی منزلیں بھی طے نہیں ہوئی تھیں کہ سوامی جی کا بلاوا آگیا اور وہ سرلا دیوی کو اکیلا چھوڑ کر وہاں چلے گئے جہاں سے کوئی واپس نہیں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدماتِ جلیلہ کو قبول فرمائے اور اس کے صلے میں اور اپنے فضل و کرم سے ان کو اپنی نعمتوں سے نوازے ــــ اور اللہ تبارک و تعالیٰ مولانا عبدالقدوس ہاشمی کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے سوامی جی کو دفن کرنے کے بعد ہی سرلا دیوی کو اپنے افراد خاندان بیٹیوں، بہوؤں، نواسیوں پوتیوں کے ساتھ آ کے رہ جانے اور باقیماندہ ایام حیات، سکون و سلامتی سے ایک مسلمان علم و فضل سے آراستہ گھر میں بسر کرنے کی دعوت دی۔ وما توفیقی الا باللہ

مکرر۔ کل کے اخبار سے یہ معلوم کر کے صدمہ ہوا کہ سرلا دیوی نے ہندوانی اثرات کے تحت شوہر کی جدائی کے غم سے مجبور ہو کر خود کو ستی کر لیا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

۳ محمد علی صدیقی مرحوم

میرا بچپن رام پور میں گزرا ہے، جب میں بہت چھوٹا تھا تو اکثر سویرے اٹھ کر سب کی آنکھ بچا کر باہر نکل جاتا تھا پتنگیں اُڑانے کے شوق میں، صرف وہی وقت ملتا تھا اس شوق کو پورا کرنے کا۔ دس بجے سے اسکول چلے جاتے تھے اور سہ پہر کو اسکول کے بعد کا وقت ہاکی کرکٹ کے میدان میں گزرتا تھا۔ ایسے مواقع پر کئی بار ایسا ہوا کہ ایک عمر رسیدہ باریش بزرگ دیوان خانے کے وسیع و کشادہ صحن میں ٹہلتے ہوئے ملے جو ہاتھ میں تسبیح لئے کچھ پڑھتے رہتے تھے۔ میں ان کو پہچانتا نہیں تھا مہینہ مہینہ دو دو مہینے کے فاصلے سے جب بار بار ان کو دیکھا تو والد مرحوم سے پوچھا کہ یہ کون صاحب ہیں اور کہاں سے آتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ یہ تمہارے ابا کے رشتے کے بھتیجے ہیں مسعود علی صاحب جو بریلی میں بسلسلۂ ملازمت مقیم ہیں۔ دینی علمی ذوق رکھتے ہیں اور اس لئے جب موقعہ ملتا ہے بریلی سے رام پور چلے آتے ہیں۔ بعد کو ابا نے ان سے ملایا

بھی اور وہ مجھ پر شفقت فرمانے لگے۔ پھر اسکول سے کالج میں منتقل ہو جانے کے بعد ان سے اکثر ملاقاتیں رہیں۔ رام پور میں بھی لکھنؤ اور بریلی میں بھی۔ اس کے بعد میں مستقل طور پر حیدر آباد چلا گیا۔ ۱۹۴۹ء کے آغاز میں پاکستان پہنچا تو ان کی اولاد سے متعارف ہوا۔

بھائی محمد علی مرحوم اُن کے بڑے بیٹے تھے وزارت خزانہ میں ملازم تھے اور دہلی سے پاکستان بطور ملازم سرکار ہجرت کرکے آئے تھے ان کے چھوٹے بھائی احمد علی جو میرے مرحوم بہنوئی محمد بشیر مرحوم سابق نیوز ایڈیٹر ڈان کے بہنوئی ہیں پورٹ ٹرسٹ میں ملازم تھے اب ریٹائر ہو گئے ہیں۔ بھائی محمد علی مرحوم نے اپنی محنت و لیاقت کی بنا پر ترقی کی اور وزارت خزانہ میں مددگار معتمد اور سیکشن افسر ہوئے اور وہیں سے ۱۹۷۳ء میں وظیفۂ حسنِ خدمت پایا۔

طالب علمی کے زمانے سے علم و ادب کا ذوق تھا خاص کر شعر شاعری سے، جب تک مرکزی حکومت کے دفاتر کراچی میں رہے ان کے اس ذوق کی بدولت اکثر یکجائی ہو جایا کرتی تھی۔ پھر وہ پنڈی اسلام آباد منتقل ہو گئے۔ اول اول میرا وہاں جانا کم تھا اس لئے ان کی مشقِ سخن کے لیل و نہار سے میں بے خبر رہا تاآں کہ انہوں نے اپنی پہلی تصنیف "شاہنامۂ پاکستان" مجھ کو بھیجی جس کے مطالعے سے میری آنکھیں کھل گئیں۔ ان دو چار برس میں ان کے کلام میں روانی کے ساتھ پختہ فکری اور وسیع المشربی آگئی تھی جس کے اثر سے ان کی طویل نظم "شاہنامہ پاکستان" کو ایک نہایت بلند پایہ رزمیہ قرار دیا جا سکتا ہے یہ ۱۹۶۵ء کے بعد کی بات ہے۔ اگلے نو دس سال میں مجھ کو اسلام آباد جانے آنے کا بارہا اتفاق ہوا۔ اور مرحوم سے طویل دلچسپ ملاقاتیں رہیں، عام طور پر موضوعِ گفتگو شعر و شاعری رہتا تھا۔ انہوں نے شاہنامۂ پاکستان کے بعد والے کلام کے لئے اپنا قلمی نام "جمال القادری" رکھ لیا تھا۔ اس دور میں انہوں نے بعض بڑے معرکے کی چیزیں لکھیں۔ مرادفات و مترادفات پر ایک طویل مسدس یا مخمس مجھ کو انہوں نے سنایا تھا جو ان کی قدرتِ کلام کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد انہوں نے نعت گوئی کی جانب توجہ کی ان کی بعض نعتیں سن کر میں نے پچھلے سال ان سے خواہش کی کہ فاران کے لئے کوئی نعت مجھ کو دیں کئی مہینے ہوئے انہوں نے اپنی نجبت سے ایک نہایت بلند پایہ نعتیہ نظم مجھ کو بھیجی جو خدا جانے کہاں میرے کاغذات میں مل کر کھو گئی۔ انہوں نے کئی بار اس کی اشاعت کے لیئے یاد دہانی کی جس کو میں شرمندگی کے باعث ٹالتا رہا۔ وہ اسی اثنا میں سخت علیل ہو گئے اور آخر کو ہم سب کو چھوڑ کر خالقِ حقیقی سے جا ملے، عجیب اتفاق ہے کہ میں ان کی تجہیز و تکفین میں شرکت کرنے کے بعد جب گھر واپس آیا اور یادرفتگاں لکھنے کے لئے پرانے کاغذات الٹ پلٹ کرنے لگا تو وہ نعت ان کی مل گئی۔ جو انشاءاللہ اگلے مہینے کی اشاعت میں (برعایت ربیع الاوّل) شریک کی جائے گی۔

ان کے دونوں لڑکے، عزیزی شوکت و عشرت مجھ سے بہت مانوس ہیں۔ اُن کے ماموں زاد بھائی معید صدیقی کمشنر انکم ٹیکس ان کے خالہ زاد مولانا محمد میاں یہ سب لوگ بلند علمی و ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ توقع ہے کہ بھائی محمد علی مرحوم کی علمی میراث کو یہ سب لوگ ضائع نہ ہونے دیں گے اور کوئی نہ کوئی سبیل اس کی نکالیں گے کہ جو "باقیات" ہیں ان کو بھی جلد خوش اسلوبی سے شائع کرا دیا جائے۔ ویسے میری دانست میں ان کی اوّلین تصنیف "شاہنامۂ پاکستان خود ایک ایسی کتاب ہے کہ اس کے مولف و مصنف کو بھلا دینا یا فراموش کر دینا، پاکستانی ادب کے ناقد یا مورخ کے لئے ممکن نہیں اسی لئے اس کی بہت ضرورت ہے کہ ان کا باقیماندہ کلام بھی جلد علمی دنیا کے روبرو پیش کر دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ بھائی محمد علی صدیقی مرحوم کی مغفرت کرے۔ ان کے پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور ان کی دینی و ملی خدمت کو اجر و مقبولیت سے نوازے

۴۔ سیّد ظفریاب حسین جام نوائی بدایونی

آج کی ڈاک سے صبا متھراوی کا خط ملا کہ جام نوائی ۱۲ دسمبر ۱۹۸۱ء کو مختصر علالت کے بعد اسلام آباد میں راہی ملک بقا ہوئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ عجب مردِ کمال و قدسی صفات تھے جیسا چہرہ نورانی تھا ویسا ہی باطن روشن و پاکیزہ، مردم خیز خطّے کے متوطن تھے، ذہانت و فطانت طبّاعی و صنّاعی، بدیہہ گوئی، و مضمون آفرینی اُن پر ختم تھی۔ جملہ اصناف سخن میں کامل نہیں اکمل تھے۔ اور غزل تو ایسی کہتے تھے کہ بڑے بڑے اساتذہ ان کا لوہا مانتے تھے

ایک زمانے میں جگر مرادآبادی سے بڑی دوستی تھی، بلکہ جگر بدایوں جاتے تو انہیں کے مہمان ہوتے اور ہفتوں مہینوں ان کے ساتھ قیام کرتے۔ فاران کے جگر نمبر (اگست تا اکتوبر ۱۹۶۰ء) میں اس بات کا تذکرہ اشارتاً آیا ہے۔ اسی اشاعت میں جگر پر اُن کی تواریخ وفات اور نظمیں شامل کی گئی ہیں مئی ۱۹۸۱ء کے فاران میں وفاتِ ماہر القادری کے قطعاتِ تاریخی بھی انہیں کی فکرِ جمیل کا نتیجہ ہیں۔ تقریباً ۱۹۷۰ء تک کراچی میں اقامت تھی، پھر حج کو چلے گئے وہاں سے واپس ہوکے تو دونوں لڑکوں نے جو اسلام آباد میں بسلسلۂ ملازمت مقیم ہیں وہاں بلالیا۔ دوسرے تیسرے سال یہاں آتے تھے تو احباب کی عید ہو جاتی تھی وہاں اسلام آباد میں بھی سنجیدہ علمی ادبی حلقوں میں ان کا بڑا احترام کیا جاتا تھا اور مشاعروں، علمی محفلوں اور شعری نشستوں میں ان کا کلام بڑی توجہ اور دلچسپی سے سنا جاتا تھا اسی سال مارچ ۱۹۸۱ء میں اسلام آباد جانا ہوا تو ان کے صاحبزادے جناب ظفر نے لے جاکے ملایا اس وقت اپنے دوسرے فرزند آفتاب ظفر کے یہاں کسی تقریب کے سلسلے میں مقیم تھے خیال نہیں تھا کہ یہ آخری ملاقات ہے۔ لیکن پھر گو کئی مرتبہ اسلام آباد جانے کا موقعہ ملا لیکن اُن سے ملاقات کی سبیل نہ نکلی اور اب وہ وہاں چلے گئے جہاں اُن کو دیرینہ اور محبوب دوستوں۔ فانی، جگر، ماہر، حیرت کی معیت نصیب ہو گی۔ اولاد کی طرف سے احباب کے تعلق سے عقائد و اعمال کے لحاظ سے وہ بڑے خوش نصیب تھے۔ یقین ہے کہ جنت الفردوس میں اللہ تعالیٰ نے ان کو کشادہ اور خنک گھر عطا کیا ہوگا۔ حضرت صبا متھراوی نے کیا عمدہ تاریخ وفات نکالی ہے۔

یغفر اللہ۔ ... تسنیم مینائی۔

جا بسے جام نوائی خلد میں | ہو رہے ہیں شاد کام مغفرت
آرہی ہے عرش اعظم سے ندا | ہو رہا ہے انتظام مغفرت
شاعر شیریں زباں شیریں بیاں | پی رہا ہے دیکھ جام مغفرت
عالم نکتہ شناس و نکتہ داں | لے رہا ہے لطفِ شامِ مغفرت

انتقالِ جام کی تاریخ بھی۔
اے صبا ہے "طرح جام مغفرت"
۱۹۸۱ء

تسنیم مینائی

ع ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است

اقامت دکن کا دور حاصل حیات تھا ایک سبب تو اس کا یہ ہے کہ وہ عنفوانِ شباب کا زمانہ تھا لیکن اصلی وجہ یہ تھی کہ مملکت آصفیہ اس دور میں گہوارۂ امن و آشتی، مرکز اہل کمال مخزنِ علم و ادب، مامنِ مظلومین و دردمنداں، بساطِ راحت و نشاط، جنت چشم و نظر تھی۔ حاکم وقت رعایا کا خیر خواہ اور رعایا پرور تھا حکومت اسلامی اقدار کی آمین تھی طبقاتی اور جاگیردارانہ نظم زندگی کے نفوذ کے باوصف حق تلفی نہیں حق رسی خاص و خواص کا شعار تھا اور فرقِ مراتب کسی درجے میں بھی فرق بشر کا مرادف نہ تھا۔ وہ آسائشیں، وہ آسودگیاں، وہ یکسوئی وہ بے نیازی پھر نہیں ملی وہاں سے نکل کر پھر نہ فراغت ہوئی نصیب۔ آسودگی کی جان تیری انجمن میں تھی۔ بات چلی تھی میرے قیام دکن کے دور سے، دکن ہی میں ماہر القادری ملے، اور ان سے خلوص و محبت تعلق و یگانگت کے رشتے مستحکم ہوئے، نہیں اس امام رشد و ہدایت کی قدمبوسی کی سعادت نصیب ہوئی جس کی نگاہِ کیمیا اثر نے اس آلودۂ معاصی و مبتلائے گمرہی کی "انا" کو تصرف باطنی کی صیقل سے خودی و خود شناسی کی منزلوں سے گزار کر خداشناسی سے ہم آغوش کیا اور اسی فردوس بر روئے زمین کے سحر و شام میں وہ دولتِ بیدار ہاتھ آئی جس کو بزبان الہام "حور عین" کا امثال اللؤلوئے المکنون۔ ہی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

مخلص و معتبر، ذہین و طباع، ذی علم و ذی استعداد، ہمدم و دمساز، جاں نثار و جاں باز، لسّان و خوش گفتار، احباب و اقارب سے تعارف و ہم نشینی کا زمانہ بھی وہی تھا جن میں سے بہت کیا بیشتر اب وہاں جاچکے ہیں جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ ؎

جانے والے کبھی نہیں آتے — جانے والوں کی یاد آتی ہے۔ (وجد)

شاعروں میں مخدوم محی الدین، سکندر علی وجد، عابد علی سعید علی حیدر صفا، علی اختر، کنول پرشاد کنول، ابوالکلام بدر، تمکین سرمست، دکنیوں میں، ماہر القادری، تابش دہلوی، حیرت بدایونی، حسرت ترمذی شاہد صدیقی، حرماں خیرآبادی، مجیب، صابر القادری، عبداللہ نیر، خفاش، ہادی القادری، یعقوب رئیس، ہندوستانیوں میں۔ اور جلیل، ضامن کنتوری، فرحت اللہ بیگ، نثار یار جنگ مزاج، آزاد انصاری، صفی اورنگ آبادی، شہید یار جنگ، بزرگوں اور بڑوں میں اب بھی اُن کی صحبتوں، ان کی محفلوں کی لذّت و آسودگی نہاں خانہ قلب کی تابانی و ضیاباری کی ضامن ہے۔ ✿

وہ وقت تھا شگفتن گلہائے ناز کا

سید احمد حسرت ترمذی فتحپور (ہسوہ) کے متوطن تھے الہ باد سے ایم اے ایل ایل بی کر کے میری طرح دکن چلے گئے جہاں ان کے خویش و اقارب اچھے سرکاری عہدوں پر فائز تھے پہلے منتظم رہے۔ محکمہ سرکار صیغۂ عدالت میں، پھر اسی معتمدی میں مددگار ہو گئے اور وہیں سے تقسیم ملک کے وقت کراچی آگئے۔ فضلی، ابو طالب نقوی وغیرہ کے ہم سبق رہے تھے۔ پاکستان میں بھی معتمدی دفاع کے تحت صدر نظامت سول ایوی ایشن" میں مددگار صدر ناظم ہو گئے اور سنہ ۱۹۵۸ء کے غیر آئینی انقلاب کے بعد اپنے جیسے ہزاروں کی طرح "اسکریننگ" میں گھر بٹھا دیے گئے۔ چندے فضلی نے اپنے دبستان میں سہارا دیا۔ پھر تخشب جارچوی نے کچھ روز سرپرستی کی لیکن پھر وہ پنپے نہیں۔ ملیر کالونی میں مکان بنوا لیا تھا وہیں گوشہ نشین ہو گئے۔ شاعری، بذلہ سنجی، احباب نوازی، کسی سے کوئی واسطہ نہیں رہا، غنیمت ہے کہ غزل گوئی کا مشغلہ باقی رکھا گو غزل سرائی سے تائب ہو گئے۔ احباب نے (راقم الحروف ماہر القادری تابش دہلوی صابر القادری، تخشب، فضلی، سب نے کوشش کی لیکن حسرت ترمذی نے پھر کسی سے سروکار نہ رکھا اور اسی گوشہ نشینی کے عالم میں دسمبر سنہ ۱۹۷۷ء کی ایک سرد اور اداس سہ پہر کو چپکے سے یں آنکھیں موند۔ یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا۔ ماڈل کالونی کے خاموش، سنسان اور اندھیرے گورستان میں پہنچی اور پر تاثیر غزل گوئی کا یہ سخنور جس کے اشعار پر حسرت موہانی کا دھوکہ ہوتا ہے۔ اور جس کے بعض ابیات پر حسرت موہانی نے بھی رشک کیا ہے سرِ شام نیند قیامت کی سو گیا۔ کسی کو خبر ہوئی اور کسی کو خبر بھی نہ ہوئی۔ مجیب خیر آبادی نے راقم الحروف کو فون کر دیا۔ ماہر القادری کو اطلاع ملی تو اپنی گاڑی پر میرے یہاں آگئے اور اردو غزل کے اس گہر آبدار کو اپنے ہاتھوں سے مٹی میں ملا آئے۔

سنہ ۱۹۳۵ء تا سنہ ۱۹۴۷ء مملکتِ آصفیہ کی معارف پروری اور فروغ علم و ادب کا زریں زمانہ تھا۔ بساط شعر و اد فانی سے خالی ہو گئی۔ لیکن شاہ تغزل جگر مراد آبادی نے ہر سال حیدرآباد آنے اور طویل قیام کرنے کو اپنا شعار بنا لیا نواب بہادر یار جنگ کی زندگی میں تو وہ سال میں کئی کئی بار آتے تھے اور ان کے دستِ راست نواب دوست مح خان کے مہمان ہوتے تھے ان کی وفات کے بعد بھی جگر ہی سے محفل شعر و سخن کی انجمن روشن رہی۔ حسرت ترمذی ا انجمن کا ایک گوہر شب چراغ تھے اور ہم عصروں میں تازگی، سادگی اور شگفتہ بیانی میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ جگر کو انہوں نے بزمانہ طالبعلمی الہ باد کے مسلم بورڈنگ ہاؤس کے مشاعروں میں سنا تھا اور ان سے ملے بھی لیکن جگر ان کی غزل سے دکن ہی میں متعارف ہوئے اور اس قدر متاثر ہوئے کہ بلدہ وارد ہوتے ہی ان کو مستقل ط پر اپنے پاس بلا لیتے تھے۔ شاعری ہی نہیں رمی کھیلنے میں بھی وہ جگر کے خواجہ تاش تھے اس لئے خوب چھنتی تھی۔

حسرت ترمذی کا کلام نہ دکن میں، رسائل و اخبارات میں شائع ہوا نہ پاکستان میں۔ اہلِ ذوق کی ضیافتِ طبع اور اہل توجہ و التفات علمی کے لئے دو ایک غزلیں اور چند شعر یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔ کاش کوئی غزل کا رسیا حسرت ترمذی مر کے کلام کو پاکستان نہ سہی کراچی ہی کے علمی ادبی حلقوں تک پہنچانے کا کوئی انتظام کر دے۔

ہم کو اگر برباد کروگے۔
عہدِ ستم کو یاد کروگے

دل کا مٹانا کھیل نہیں ہے
اپنا گھر برباد کروگے

ترکِ ستم کا کچھ تو سبب ہے
کوئی ستم ایجاد کروگے

رنج و الم کا یہ خوگر ہے
تم دل کو کیا شاد کروگے

حشر کا وعدہ تم نے کیا ہے۔
حشر کے دن بھی یاد کروگے

تم کو بھلاتے ہیں ہم دل سے
تو تم بھی کیا یاد کروگے

نغمۂ حسرت .. نالۂ حسرت
تم بھی کسی دن یاد کروگے

ہر اک موج غم سے گزرنا ہے ہم کو
مسرت کا اندازہ کرنا ہے ہم کو

مقامِ وفا سے گزرنا ہے ہم کو
یہی زندگی ہے کہ مرنا ہے ہم کو

جہاں پھول بھی ہیں، جہاں خار بھی ہیں
انہی وادیوں سے گزرنا ہے ہم کو

تلاطم کا کچھ تجربہ کیوں نہ کرلیں
کہ ساحل پہ آخر اترنا ہے ہم کو

اسے رات دن یاد ہم نے کیا ہے
اسے رات دن یاد کرنا ہے ہم کو

بہت کچھ سنا ہم نے اے بندہ پرور
بہت کچھ مگر عرض کرنا ہے ہم کو

محبت کی خاطر ہی جینا ہے حسرت
محبت کی خاطر ہی مرنا ہے ہم کو

جس کو ساحل پہ اترنا ہوگا
اس کو موجوں سے گزرنا ہوگا

خامشی پر ہے گمانِ پندار
ان سے کچھ عرض بھی کرنا ہوگا

قیدِ ہستی سے نکلنے کے لئے
ہم کو ہستی سے گزرنا ہوگا

آہِ مجبور پہ ہنسنے والو
آہ مجبور سے ڈرنا ہوگا

دل کو آباد نہ کر شاد نہ کر
اس کو برباد بھی کرنا ہوگا

وہ خوشی جو رازِ حیات ہے، مجھے اس خوشی کی تلاش ہے
مجھے زندگی کی تلاش ہے، غمِ زندگی کی تلاش ہے

یہ سحر یہ شام، یہ روز و شب، یہ حیات و موت یہ کشمکش
کبھی زندگی ہے گراں مجھے، کبھی زندگی کی تلاش ہے

وہ ترا تبسم فتنہ گر وہ ترا تجاہل بے خبر!
اسی التفات کی آرزو، اسی بے رخی کی تلاش ہے

وہ جنوں کہ جس کو جنوں کہیں، وہ جنونِ شوق ابھی کہاں
ابھی عقل و ہوش کی فکر ہے، ابھی آگہی کی تلاش ہے

یہ نہیں کہ موجِ نسیم سے نہ خلش رہے نہ تڑپ رہے
جو خلش بھی ہو جو تڑپ بھی ہو مجھے اس خوشی کی تلاش ہے

وہ ہزار دشمنِ عقل ہو، مجھے پھر اسی کی ہے آرزو
وہ ہزار دشمنِ عقل ہو مجھے پھر اسی کی تلاش ہے

کوئی اور حسرتِ بیقرار کی آرزو ہے نہ جستجو!
تری بزم میں جو گزر گئی، اسی زندگی کی تلاش ہے

خواب سے بیدار ہوتا ہے ہمیں
مطلعِ انوار ہونا ہے ہمیں

سایۂ گلزار میں کب تک جیئیں
صاحبِ گلزار ہونا ہے ہمیں

دامنِ گل کی حفاظت کے لیے
دشمنِ ہر خار ہوتا ہے ہمیں

ہوش کھو کر کھو نہ دیں ہم میکدہ
میکشو ہشیار ہونا ہے ہمیں

فاصلہ ہی کہاں ہے راہِ شوق کا
بس ذرا تیار ہونا ہے ہمیں

زنگ آلودہ ہے زنجیرِ کہن
وقت کی تلوار ہونا ہے ہمیں

آپ ہی کی انجمن میں آپ سے
ایک دن دوچار ہوتا ہے ہمیں

ایک خلش بے التفاتی ہے تری
یہ خلش سو بار ہوتا ہے ہمیں

دل کو حسرت ہے ہمارے غم سے پیار
دل سے حسرت پیار ہوتا ہے ہمیں

مخمور نگاہوں سے پی کر ساغر کا تقاضا کون کرے
محفل میں کسی کو ہوش بھی ہو ساقی کو اشارا کون کرے

موجوں کی تڑپ میں لطف تو ہے، موجوں سے کنارا کون کرے
ساحل پہ خموشی موت کی ہے ساحل کی تمنا کون کرے

جب ساقیٔ بزمِ عیش و طرب خود بزم میں آئے جام بکف
واعظ سے کوئی یہ تو پوچھے، کوثر کی تمنا کون کرے

امید قیامت کی صورت وعدوں پہ ترے جیتے رہنا
کچھ رسمِ محبت یوں ہی ہے اس رسم کو رسوا کون کرے

یہ عشق کہ ہے اندوہ فزا اک نشۂ جاں پرور بھی ہے
کچھ لطف تو ہے اس مے میں ورنہ تلخی کو گوارا کون کرے

متفرقات

اپنا عالم جو ہم نے دیکھا ہے
کم نے سمجھا ہے کم نے دیکھا ہے

تم نے دیکھا ہے حالِ پروانہ
شمع کا حال ہم نے دیکھا ہے

خزاں کے بعد کا شکوہ غلط سہی لیکن
بہار سے ہمیں اے دوست کچھ ملا بھی ہے

گلشن ہے یا صحرا ہے
اپنا گھر پھر اپنا ہے

پینے والے جب تک ہیں
ساقی ہے میخانہ ہے

ہر منزل سے کچھ آگے
منزلِ اہلِ تمنا ہے

اُن کا آستانہ ہی کیا کریں نہیں ملتا
ورنہ کیا نہیں ملتا ان کے آستانے سے

موجوں کی یہ تڑپ یہ تلاطم یہ اضطراب
اے ناخدا خموشیٔ ساحل تو دیکھنا

کوئی نہیں، کوئی بھی نہیں، کوئی بھی نہیں
اے شامِ بے کسی مری محفل تو دیکھنا

حسرت ترمذی مرحوم

یہ مسرت
دائم و قائم رہے
ان صاحب کی طرح
اپنے خاندان کی مسرتوں کو دائمی بنانے کے لیے
نیشنل بینک آف پاکستان
قومی ترقی
قومی بینک
کچھ عرصے بچائیے ہمیشہ کمائیے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
یَاَیُّہَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ
شَاہِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیۡرًا ۙ
وَّ دَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذۡنِہٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیۡرًا ۝
O Prophet truly We have sent thee
as a Witness, a Bearer of glad
tidings, and a Warner, and as
one who invites to Allah's (Grace)
by his leave and a lamp
Spreading light.
Karachi Port Trust
The Port of Pakistan